یوسف خاں کمبل پوش
(سیاحِ جہاں)
اردو کا
پہلا سفرنامہ
عجائباتِ فرنگ
ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر مظفر عباس
مکتبہ عالیہ ○ لاہ

اُردو کا اوّلین سفرنامہ

عجائباتِ فرنگ

مصنف

یوسف خاں کمبل پوش

(سیّاح جہاں)

ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر مظفّر عبّاس

مکتبۂ عالیہ ○ لاہور

۱۹۸۲ء

عجائباتِ فرنگ — اردو کا اوّلین سفرنامہ

مصنف یوسف خان کمبل پوش
مرتب ڈاکٹر مظفر عباس
ناشر محمد جمیل النبی
مطبع بختیار پرنٹرز لاہور
قیمت: ۳۵ روپے

یکے از مطبوعات:
مکتبۂ عالیہ
○ آفس: ایبک روڈ
○ شوروم: اردو بازار
لاہور

ترتیب

پیش لفظ

سفر کا رویہ بنیادی طور پہ زندگی کا رویہ ہے کہ زندگی حرکت اور عمل سے عبارت ہے اور سفر حرکت اور عمل ہی کا علامتی روپ ہے۔ ہماری شاعری میں جا بجا اس بنیادی انسانی رویے کا اظہار ہوا ہے۔ یہ اشعار محض چند مثالیں ہیں۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (میرؔ)

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالبؔ)

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے (آتشؔ)

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہل دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ (ناصر کاظمی)

منیرؔ اس شہر پہ آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

(منیر نیازی)

شاعری کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی سفر کے اس رویے نے اظہار پایا ہے اور

اس حد تک مکمل اور بھرپور اظہار پایا ہے کہ سفر نامہ، ایک مستقل صنف ادب بن گیا ہے۔
سفرنامے ہماری تاریخ کا اہم باب ہیں۔ انسانی علوم و فنون اور تاریخ کے چشمے سفرناموں ہی سے پھوٹتے ہیں، اسی لئے سفرناموں کو قدیم ترین تاریخی و تہذیبی ماخذ قرار دیا گیا ہے، سفرناموں کی صنف ہمہ گیر ہے اور گوناگوں علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہے تاریخ کے علاوہ جغرافیہ، نفسیات، نباتیات، علم الانسان، نیچرل اور سوشل سائنسز جیسے تمام علوم سے سفرناموں کا قریبی تعلق ہے۔ ہیلن ہینز (HELEN HAINES) نے اپنی کتاب "Living with Books" میں سفرناموں کے اس پہلو کی بڑی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے، وہ کہتے ہیں

"It is one of the most diverse and far-reading divisions of Literature. It holds the raw materials of history in records of exploration and archeological discovery in annals of voyagers and adventurers. It extends into Science – into zoology, anthropology, botany, the study of man, of nature and of the earth. It charts and surveys the surface of the globe and registers observation and experience against new and widering horizons".[1]

انسان کی قدیم ترین تاریخ کے ابتدائی نقوش بھی سفرناموں میں ملتے ہیں، سیاحوں نے جغرافیائی سطح پر نئی دنیاؤں کا سراغ لگانے کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی سطح پر نئے امکانات بھی تلاش کئے ہیں۔ ڈارون کا مشہور مضمون "DIARY OF THE VOYAGE OF BEAGLE" اگرچہ بحری سفر کی روداد (یعنی سفرنامہ) ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ طبیعات، نیچرل سائنس اور اصول ارتقاء کے موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب بھی ہے۔ اسی طرح مارکوپولو اور ابن بطوطہ کے سفرنامے، قدیم تاریخی و تہذیبی ماخذ تسلیم کئے جاتے ہیں، سفرناموں نے انسانی تاریخ کو ماضی میں بڑے قدیم زمانے تک وسعت دی ہے، خود برصغیر کی تاریخ کے ماخذ بھی سفرنامے ہی ہیں، چینی سیاحوں ہیون سانگ اور فاہیون کے سفرنامے اس سلسلے

[1] "Living with Books, p. 302

میں خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔

سفرنامہ بنیادی طور پر رودادِ سفر ہوتی ہے مگر محض ان معنوں میں ہوتی ہے کہ اس کا بنیادی محرک کوئی سفر ہوتا ہے ورنہ اپنے وسیع تر مفہوم میں یہ کسی خاص خطے کے باشندوں کی تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تاریخ ہوتی ہے چونکہ سفرنامے مختلف خطوں کی تاریخ مرتب کرتے ہیں لہٰذا یہ ایک نازک فن بھی ہے اور سفرنامہ لکھتے ہوئے ادیب کو بڑے نازک اور کٹھن مراحل سے گذرنا ہوتا ہے۔

اردو میں سفرنامے کی روایت کے ابتدائی نقوش ہمیں سید احمد شہید بریلویؒ کی "سوانح احمدی" میں ملتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ سوانح عمریوں کی ذیل میں آتی ہے لیکن اس کے ایک حصے میں سید احمد کے سفرِ حج کے (جو انہوں نے ۱۸۲۱ء میں کیا تھا) مفصل حالات ملتے ہیں، "سوانح احمدی" کے اس حصے کو اردو میں سفرنامے کی روایت کی ابتدائی کڑی قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ اس سے پیشتر ہندوستان میں لکھے جانے والے سفرنامے فارسی زبان میں ہیں۔ ان فارسی سفرناموں میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا "جذب القلوب" ۹۹۸ھ/۱۵۸۹ء شاہ ولی اللہ کا "فیوض الحرمین" ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء مولوی رفیع الدین مرادآبادی کا — "حرمین" اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا — "سراج منیر" خصوصاً قابل ذکر ہیں یہ تمام سفرنامے، سفرِ حج کے بارے میں ہیں، جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں سفرناموں کی روایت کا آغاز مذہب کے حوالے سے ہوا ہے۔

اس پس منظر میں یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ — "عجائبات فرنگ" اردو کا پہلا باقاعدہ اور مکمل سفرنامہ ہے۔ یوسف خان نے خود اسے تاریخ یوسفی کے نام سے موسوم کیا ہے، لکھتے ہیں — "چونکہ اس کتاب میں سب حال اپنا گزرا بیان ہوا اس واسطے نام اس کا تاریخ یوسفی رکھا الاہتمام منی والاتمام من اللہ تعالیٰ" (ص: ۳)

اس سفرنامے میں انہوں نے اپنے یورپ کے سفر کی روداد بیان کی ہے خصوصاً

انگلستان اور فرانس کے شہروں اور دیہات کا ذکر کیا ہے اور راستے میں آنے والے مشرقِ وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کا تذکرہ بھی کیا ہے اسی طرح یہ سفرنامہ اس دور کے سفرناموں کی مذہبی روایت سے ذرا مختلف ہے۔

یوسف خاں ایک وسیع المشرب آزاد منش درویش ہے۔ اپنا مذہب سلیمانی بتاتا ہے سفرنامے میں جابجا اپنے مذہب کا اعلان کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ اسلام کا مذہب ہے مگر دیگر مذاہب کو بھی بُرا نہیں سمجھتا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ شراب کو حلال سمجھتا ہے یہی نہیں بلکہ اس کے حلال ہونے کے سلسلے میں بے سر پا دلائل بھی دیتا ہے ایک جگہ لکھتا ہے۔

"وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی۔ عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو، شراب کیوں پیتے ہو؟ میں نے جواب دیا حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔" (ص ۱۲)

اس نے اپنے مذہبی عقائد کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"میں نے خوب غور کیا۔ مذہبوں کا پردہ پایا۔ ہر ایک ہوا و حرص دنیا میں پھنسا ہے، مذہب کا نام رکھ لیا ہے۔ عمل اپنے طریقہ پر کوئی نہیں کرتا۔ آخر بعد تحقیقات کے یہ ثابت ہوا کہ مذہب سلیمانی ہی سب مذہبوں سے اچھا ہے کلیہ اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو وحدہ لاشریک جانے، جو کچھ معاش محنت مشقت سے پیدا کرے۔ کچھ اپنے خرچ میں لاوے باقی خدا کی راہ پر بانٹ دے خدا نے جہان میں پیدا کیں اقسام کی نعمتیں بندوں کے لئے ہیں تاکہ کھاویں اور بانٹیں۔ جنت و دوزخ اس دنیا میں موجود ہیں نہ اور کہیں جس کی عمر رنج و مصیبت میں گزرے اس کو دوزخ ہے یہیں جس کی زندگی

چین و آرام سے بسر ہوتی ہے اس کو ہے بہشت بریں (ص ۶۹)

یوسف خاں اودھ کی سلطنت میں نصیر الدین حیدر کی فوج میں جمعدار اور پھر صوبیدار رہا لیکن سیاحت کے شوق نے یہاں ٹکنے نہ دیا، ۱۸۳۷ء میں ملک چھوڑ عازم سفر ہوا اپنی روانگی کا حال سفرنامے میں یوں لکھا ہے۔

"ایکبارگی سن اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں دل میرا طلب گاہ سیاحی جہان خصوصی ملک انگلستان کا ہوا، شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی، شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت و انعام اجازت دی، عاجز تسلیمات بجالایا اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارۃ کلکتہ میں پہنچا پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔" (ص ۳-۴)

کمل پوش نے سفر کا آغاز ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو کیا اور ۲۵ جنوری ۱۸۳۸ء کو واپس کلکتہ پہنچا اس طرح اس سفرنامے کا سلسلہ کم و بیش سوا سال کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ سوا سال کے سفر کی یہ روداد بڑے سائز کے ۱۶۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ سفرنامہ پہلی مرتبہ ۱۸۴۷ء میں دہلی میں طبع ہوا۔ پھر ستمبر ۱۸۷۳ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ یہ معلومات کتاب[1] کے دوسرے ایڈیشن کے سرورق پر اس طرح درج ہیں۔

"یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں بمقام دہلی طبع ہوئی تھی اور چونکہ مصنف اس کا باشندہ لکھنؤ کا تھا اور مالک مطبع سے بھی اس کی ملاقات تھی۔ تو یہ تحفہ یادگار باشندہ اس صوبہ کا سمجھ کر حسب تحریک مسٹر جوزف انتھونی صاحب

[1] "عجائبات فرنگ" مطبع نول کشور لکھنؤ۔ طبع دوم ۱۸۷۳ء (سرورق)

جو اخلاق و مروت میں بے عدیل اور فن فوٹو گرافی وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں، ماہ ستمبر ۱۸۷۳ء مطبع نول کشور میں بطبع مزین مطبوع ہوئی ــــ"

یوسف خاں فطری طور پر ایک آزاد منش، سیاحت کا رسیا شخص ہے۔ اس کی اس خواہش کا اظہار جابجا ہوا ہے، لیکن سیر و سیاحت کے دوران میں وہ محض خود لطف اندوز ہونا پسند نہیں کرتا بلکہ اس کا مکمل ریکارڈ یادداشتوں کی صورت میں محفوظ کر کے اہل وطن کو بھی اپنی مسرتوں میں شامل کرنا چاہتا ہے چنانچہ اس سفرنامے کے آخر میں اس کا یہ کہنا ــ

"اب بھی یوسف حلیم کمل پوش سلیمانی مذہب ارادہ سیر ملک سیہ پوشوں کا رکھتا ہے اور ایران و توران، استنبول اور روس و مانڈ ندران وغیرہ کے جانے پر آمادہ ہے۔ بسبب لاچاری اور نہ بہم پہنچے زاد راہ کے یہاں پڑا ہے امیر اور رئیس ہندوستان کے ایسے خیال کب رکھتے ہیں کہ خرچ راہ کا اور ایک محرر کامل ہمراہ میرے کر کے رخصت کریں۔ بندہ ملکوں میں پھرے اور بے کم و کاست حال ہر جا کا اپنی آنکھ سے دیکھ کر بیان کرے۔ اگر یاوری بخت سے کوئی متکفل خواہش میری کا ہوا فبہا۔ نہیں تو آخر تھوڑے دنوں میں راہی ہو گا۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ کوئی سبب کر دے گا۔ جامۂ فقیری پہن کر سیر ملکوں کی کرے گا۔"

اس کی اسی خواہش کا اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "عجائبات فرنگ" شعوری طور پر لکھا ہوا سفرنامہ معلوم ہوتا ہے جس کے مصنف کی ہر ممکن کوشش ہے کہ جو جو چیزیں اس کی نظروں کے سامنے آئیں۔ جن شہروں اور ملکوں کی اس نے سیاحت کی۔ جو جو تجربات و مشاہدات اس کو حاصل ہوئے ان کو جیتا جاگتا قاری کی نظروں کے سامنے پیش کر دے

وہ یقیناً اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا ہے۔ سفر کی ابتدا سے لے کر آخر تک بڑی جزئیات نگاری سے کام لیا ہے اس کی یادداشت اور ذہانت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کہیں بھی تاریخ یا دن لکھنا نہیں بھولا۔ یہاں تک کہ جہاں جہاں قیام کیا گلی محلے کا نام اور مکان کا نمبر تک لکھ دیا ہے۔ یوسف خاں کا یہ عمل اسے موجودہ دور کے سفرنامہ لکھنے والوں کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔ لندن میں اپنے قیام کی تفصیلات یوں دی ہیں ــ"

"لندن عجیب شہر گلستان ہے۔ دانائی کی وہاں کان ہے۔ یہ تماشے دیکھ کر سرائے "بل موت" میں پھر آیا، راجہ صاحب کو ساتھ لے کر مکان کرائے کا تلاش کیا، بہت جستجو سے محلہ "سمور پیس" میں نمبر تیسرا قرب سینگرک کلیسا کے ایک مکان سو روپے کرائے پر ٹھہرایا، ایک شخص کو شریک کر کے اس میں رہا۔" (ص ۱۸)

یہ سفرنامہ اس لحاظ بھی بڑا دلچسپ ہے کہ اس میں آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل کے انگلستان اور فرانس کے شہروں اور دیہات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ بعض تصویریں تو ایسی ہیں کہ اس دور کے قاری کو یقین کرنے میں تامل ہو گا؛ ذرا تصور کیجیے اس انگلستان کا جس میں کوئلے کی مدد سے گاڑیاں چلتی ہوں گی۔ لیکن یہ گاڑیاں بھی ایک ایسے شخص کے لئے اچنبھا ہیں جو ہندوستان جیسے پسماندہ ملک سے گیا ہے۔ چنانچہ یوسف خاں بجا طور پر اسے تماشا قرار دیتے ہیں اور انہیں دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ــ

"وہاں آٹھ سات گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بڑی گاڑی سب سے آگے اس میں تین آدمی بیٹھے کوئلے سلگاتے پھر ہر گاڑی کی زنجیر دوسری گاڑی میں لگی تھی۔ بڑی گاڑی تک زنجیر بندھی یونہی تھی۔ جب سب آدمی ان

میں بیٹھ جاتے۔ بڑی گاڑی کے پیچ پھیرتے۔ فی الفور وہ تیر کی طرح
دھوئیں کے زور سے رواں ہوتی۔ ہر ایک گاڑی زنجیر کے لگاؤ سے
اس کے ساتھ چلی نکلتی۔ میں نے ایسا کبھی تماشا نہیں دیکھا۔ نہایت
مشتاق تھا۔ گاڑی بان سے پوچھا کہاں جاؤ گے؟ اس نے کہا آٹھ کوس پر۔
میں نے کہا مجھ کو بھی سوار کر۔ اس نے کہا بہتر۔ آخر میں اس پر سوار ہوا۔ اس
نے گاڑی کا پیچ موڑا، فوراً گاڑی چلی۔ طبیعت بہلی۔ راہ میں ایک دفعہ
سر نکال کر دیکھا۔ قریب تھا کہ تیز روی اس کی سے پگڑی میری گر پڑے۔
جلدی سے سر اندر کر لیا۔ پاؤ ساعت میں آٹھ کوس جا پہنچا۔ وہاں سے ٹیمز
کی ناؤ پر سوار ہو کر موضع کرینچ میں سیر کو گیا" (ص ۱۸-۱۹)

ایک اور تماشہ کا حال یوں لکھا ہے۔

"دیکھا کہ ایک غبارہ ہے اس میں بہت ڈوریاں لگیں اور دو سو گوروں نے اپنے
ہاتھ میں وہ ڈوریاں پکڑیں اس میں دھوئیں بھرنے کے لئے گیس جلایا اس لئے
کہ بغیر دھوئیں بھرنے کے غبارہ اڑ نہ سکتا۔ نیچے اس کے ایک ٹکڑا تانبے کا لگا
ہوا۔ اس پر ایک پلنگ چھوٹا سا بچھا ہوا۔ اس میں بارہ آدمیوں کے بیٹھنے
کی جگہ تھی۔ نیچے اس کے ایک ناؤ معہ سامان دریائی کے لگی کہ شاید غبارہ اڑ کر
دریا میں گرے۔ ناؤ کے سبب سے ڈوبنے نہ پاوے۔ چار آدمی اس میں بیٹھے
تھے۔ ایک شخص ہاتھ میں جھنڈی لئے۔ جب غبارہ دھوئیں سے بھرا صاحب
غبارے نے گوروں کو حکم دیا کہ ڈوریوں کو چھوڑ دو۔ گوروں نے ڈوریوں کو
چھوڑا۔ غبارہ بلند ہونے لگا۔ جب دو چار نیزوں پر آیا اس شخص نے جھنڈی
کو ہلایا۔ سب لوگوں نے بہت تعریف کی۔ ٹوپی سر سے اتاری۔ آخر وہ ایسا بلند
ہوا کہ انڈے سا دکھائی دیتا۔ پھر نہ ثابت ہوا کہ کہاں گرا۔ جس کا جی چاہے اس

کے مالک کو ایک سو تیس روپے دے اور غبارے میں بیٹھ کر آسمان
کی سیر کرے (ص ۳۰-۳۱)

یوسف خاں کا سفرنامہ جہاں انیسویں صدی کے انگلستان کی جیتی جاگتی تصویریں
ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا، وہاں یہ طنز و مزاح کا اعلیٰ شاہکار بھی ہے۔ یوسف خاں
نے بے کم و کاست اور بلا جھجک ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے جو ایک پسماندہ ملک کے
مسافر کو ایک ترقی یافتہ ملک میں پیش آتے ہیں۔ موجودہ دور کا کوئی سفرنامہ لکھنے والا ہوتا
تو یقیناً ایسے واقعات کو گول کر جاتا جس سے اس کی کم علمی، نادانی یا تضحیک کا پہلو نکلتا ہو
لیکن ایک اعلیٰ فنکار کی حیثیت سے کمل پوش نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تو جو کچھ اس پر
گزری صاف صاف بیان کی ہے۔ یہ واقعہ دیکھئے۔

"باورچی خانہ میں ایک چھوٹا حوض کہ اس کے اوپر نل پیچدار تھا۔ بندہ وہاں کے
راہ و رسم سے محض ناآشنا تھا۔ باورچی خانہ کو حمام سمجھ کر نہانے لگا اور پیچ نل
کا کھول دیا۔ نوکر میرا بدن ملتا، تھوڑی دیر میں پانی کمروں میں بھر گیا۔ تعجب
کر کے عورت صاحب خانہ معہ پیش خدمت اپنی کے دوڑی آئی۔ مجھ کو
نہاتے دیکھ بہت ہنس کر چلی گئی۔ نوکر میرا اور میں بھی حیران ہوا کہ باعث
ہنسی کا کیا ہے؟ شاید یہاں رسم نہانے کی نہیں کہ نہاتے دیکھ کر ہنسیں
میں نے نہا دھو کر حاضری منگوائی۔ اس وقت وہ عورت نوکر صاحب خانہ
کی پھر آئی۔ فقیر نے اس سے پرستش کی کہ مجھے نہاتے دیکھ کر تو اور تیری بی بی
کیوں ہنسی۔ وہ پھر بہت ہنسی۔ میں نے سبب ہنسی کا پوچھا۔ تب اس نے کہا جہاں تم
نہائے باورچی خانہ ہے نہ غسل خانہ۔ ہم کو تمہاری نادانی پر ہنسی آئی کہ تمہیں
باورچی خانہ اور غسل خانہ کی نہیں شناسائی۔ سن کر میں شرمندہ ہوا" (ص ۳۰)

یوسف خاں ایک متوازن نقطۂ نظر کا حامل شخص ہے وہ برے اور بھلے میں تمیز

تمیز کرسکتا ہے بلکہ اس کے برملا اظہار پر بھی قادر ہے۔ اس ضمن میں کسی قسم کا خوف یا جبر اس کی راہ میں حائل نہیں۔ فرنگی دور کی تمام تر جبریت کے باوجود وہ انگریزوں کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر کے اظہار میں قطعاً نہیں چوکتا۔ نتائج کی پرواہ کئے بغیر وہ بے دھڑک اپنے خیالات کا اظہار سفرنامے میں کرتا ہے، انگریزوں کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان انگریزوں کے رویے پر نکتہ چینی بھی کرتا تھا جو ہندوستان میں آقا بن کر آتے تھے۔ لکھتا ہے۔

"کیا خوب شہر لندن ہے لوگ وہاں کے مسافروں پر ایسی عنایت کرتے ہیں کہ باپ بیٹوں کے ساتھ نہیں کرسکتے۔ فقیر نے سفر بہت شہروں کے کئے مگر صاحب مروت ایسے کہیں نہ پائے۔ انگریز جو ہندوستان میں آتے ہیں مزاج بدل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان سے کچھ نسبت نہیں ؏

چہ نسبت خاک را با عالم پاک" (ص ۳۱، ۳۲)

یہی نہیں انگلستان کے لوگوں کی اخلاق باختگی پر بھی واضح طنز کرتا ہے۔ صنعتی انقلاب کی آمد سے انیسویں صدی کی ابتدا میں انگلستان میں اعلیٰ اقدار دم توڑ رہی تھیں۔ اور اخلاقی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی، اس صورت حال کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو یوسف خاں نے اپنے سفرنامے میں بیان کئے ہیں۔

"بعد اس کے میں رخصت ہو کر اپنے گھر چلا ایک گلی تنگ تاریک میں پہنچا۔ ایک رنڈی رومال منہ میں لپیٹے چلاتی، غل مچاتی، ایک مرد اس پر زیادتی کر رہا تھا۔ اس سے اپنے تئیں بچاتی۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس گرفتار پنجۂ ظالم نے مجھ کو پکارا کہ برائے خدا مجھ کو اس کے ہاتھ سے چھڑا" (ص ۵۱)

ایک اور واقعہ:-

رات کو ہوا موافق تھی، جہاز چل نکلا اور سریع السیر ہوا۔ بندہ دو تین ہمراہیوں

کے ساتھ اس پر بیٹھا تھا اور لوگ بھی اس میں تھے۔ رات کا کھانا کھا کر باتیں کرنے لگے۔ کسو نے شراب پی کر کچھ قصور کیا تھا۔ اس کا تذکرہ آیا۔ کوئی کہتا قابل تعزیر ہے، کوئی کہتا سزاوار بخشش اس کی تقصیر ہے۔ ایک شخص ظاہر میں بہت متقی اور دیندار تھا، علم رکھتا۔ وہ بھی اس کے حق میں باتیں طرح طرح کی کہتا۔ بندہ خاموش بیٹھا سنتا تھا۔ کسی کی بی بی خوبصورت اس دیندار صورت کے پاس بیٹھی تھی، جب سب لوگوں کو نیند آئی، میں نے بھی اس کی باتیں سنتے سنتے کپڑا منہ پر رکھ کر قصداً اپنے تئیں نیند میں ڈالا۔ اس مرد دانا نے چپ و راست نظر کر کے بزعم خود سبھوں کو سوتا پایا۔ دروازہ کمرے کا بند کیا اور اس عورت غیر کی سے مشغول لذات نفسانی ہوا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا یہ وہی شخص ہے جو دو گھڑی پیشتر دینداری کی باتیں کہتا آپ ہی گناہ میں ڈوبا۔ عجب حال ہے اہل دنیا کا۔ ولایت کی سب باتیں اور رسمیں اچھی ہیں مگر بعض رسمیں خلاف آئین ہیں۔ ایک ان میں سے مقدمہ خاوند جورو کا ہے بنظر انصاف دیکھا چاہیئے کہ مرد ہزار محنت و مشقت وجہ معاش حاصل کرتا ہے۔ حقوق والدین سے کہ ان سے زیادہ حق کسی کا نہیں غافل ہوتا ہے۔ دل و جان سے بی بی کی خاطر داری میں مصروف رہتا ہے۔ سخت حیف ہے کہ وہ بی بی اور سے ملتفت ہوئے ننگ و ناموس شوہر برباد کرے۔ ہزاروں لعنت اس مرد ملعون پر کہ پرائی جورو سے مرتکب مباشرت ہو۔ منہ کالا اس عورت کا کہ غیر مرد سے مشغول لذت ہو۔ یہ رسم اس ملک کی اپنے مزاج کے پسند نہ آئی۔" (ص ۶۸، ۶۹)

یہ الگ بات کہ یوسف خاں خود ایک حسن پرست، عاشق مزاج شخص ہے۔ اس کے عاشقانہ مزاج کا اظہار سفرنامے کی ہر ہر سطر میں موجود ہے۔ عاشقانہ طبیعت کے باوجود

وہ اپنی پاکبازی کا بھی ڈھنڈورا پیٹتا ہے اور حسین عورتوں سے اپنے میل جول اور اختلاط کے تذکرے کے ساتھ ساتھ نہایت عیاری سے یہ جملہ بھی بڑھا دیتا ہے "مگر خالی اغراض نفسانی سے"۔

ایک واقعہ ملاحظہ ہو

"ناگاہ ایک معشوقہ چودہ برس کی دیکھی، ایک دوکان میں بیٹھی، پری صورت حور سیرت، چاند اس کو دیکھ کر شرمائے، سورج اس کے فراق میں دن بھر چکر کھائے، عجیب حسن و جمال بے مثال، کہ بیان اس کا امر محال۔ گورے گورے گال، ہونٹ لعل لعل۔ دانت میں چمک، کمر میں لچک، شیریں ادا، دلربا، ابھری ابھری چھاتیاں۔ دل عاشقوں کا پھسلائیں ؎

برس پندرہ یا کہ چودہ کا سن
جوانی کا عالم، تماشے کے دن

میں اس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا اور نشۂ بادۂ وصال اس کے سے مدہوش ہوا (ص ۱۲۰)

تاہم خالی اغراض نفسانی اور خالص حسن پرستی کے دعوے کی تائید اس قسم کے واقعات سے کرتا ہے۔

"سب طرح سے مجھ کو گاڑی پر آسائش تھی۔ مگر آدھی راہ میں ایذا پہنچی اس لئے کہ کوچوان نے ایک عورت بدشکل کو میرے پاس بٹھلایا۔ پہاڑ سے موٹی تھی، صورت اس کی سے نفرت ہوتی تھی۔ میں نے اپنے تئیں بہت بچایا تو بھی اس کے موٹاپے سے صدمہ پہنچا۔ خدا نے خیر کی کہ وہ آدھی راہ سے اتر گئی" (ص ۱۶)

ایک اور دلچسپ واقعہ دیکھئے۔

"پانی برسنے لگا، سارے کپڑے تر ہو گئے، مگر گرتے پڑتے گھر چلے، راہ میں دو رنڈیاں، ایک خوبصورت، دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی، تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں۔ اکبار پاؤں پھسلا۔ دونوں لڑکیاں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زنِ جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا، بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا"

حسن پرستی اور عشق بازی کے ساتھ ساتھ یوسف خاں عورتوں کا احترام بھی کرتا ہے، وہ ان کے بارے میں عمدہ خیالات رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں اس کے خیالات متوازن اور حقیقت پسندانہ ہیں، آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے آزادیٔ نسواں کی بات کرنا یوسف خاں کے ذہن رسا کی جدت کا اظہار ہے، لکھتا ہے۔

"یہاں (ہندوستان مراد ہے) پردہ نشینی میں کیا کیا خرابیاں ہوتی ہیں۔ انجام کار ذلت اور رسوائیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہاں کی عورتیں علم رکھتی ہوتیں اور بے پردہ باہر نکلتیں، ہرگز ایسا فساد نہ ہوتا۔ بھلا اس پردہ نشینی میں کیا فائدہ نکلا۔ حقیقت میں مرد نادانی کرتے ہیں کہ عورتوں اپنی کو ایک مکان تنگ پنجرے میں قید کر کے تماشائے عجائبات زمانہ سے باز رکھتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے کہ آپ سیر دیکھتے پھرتے ہیں اور اپنے ہم جنسوں یعنی عورتوں کو اجازت نہیں دیتے۔ کافی ہے ان کے لئے یہ پند۔ ہر چہ بر خود نہ پسندی بر دیگر مپسند" (ص ۱۹۸)

اب ایک آخری بات سفر نامہ کی زبان و بیان کے بارے میں۔

"عجائبات فرنگ" معلومات کا خزینہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی دلچسپ سفر نامہ ہے۔ اس کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ اس کا اسلوب بھی ہے زبان انتہائی سادہ سلیس پر لطف ہے۔ آج سے سوا سو برس پہلے

کے رواج کے مطابق عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے کہیں کہیں قافیہ پیمائی بھی
کی ہے لیکن عبارت کی چستی کہیں بھی قاری کو بے مزہ نہیں کرتی۔ جا بجا
فارسی اور اردو کے اشعار، تمثیلوں، ضرب الامثال اور محاورات سے
عبارت میں رنگینی اور چاشنی پیدا کی ہے۔ مجموعی طور پر اس اسلوب کو
عام فہم اور خوشگوار کہا جا سکتا ہے کہیں کہیں تو عبارت بہت لطف
دے جاتی ہے یہ ٹکڑا دیکھیے۔

" جب آدھی رات کا وقت ہوا، طوفان شدید آیا، سبھوں کا دل گھبرایا۔
اور جہاز ڈگمگایا، مگر قدرتِ الٰہی سے زنجیر لنگر کی نہ ٹوٹی اور روح کسی
ذی حیات کے قفس بدن سے نہ چھوٹی ؏
رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت (ص ۴)

اس سفرنامے کے مطالعے کے بعد حامد حسن قادری کی اس رائے سے اختلاف
ممکن نہیں ہے کہ ــ "کمبل پوش نے سفر اور سفرنامہ، دونوں کا حق ادا کر دیا۔[1]"
کمل پوش کا یہ سفرنامہ ہر پہلو سے ہمارے اپنے عہد کا سفرنامہ معلوم ہوتا ہے کہ اس
میں سفرنامے کے تمام تر جدید اصولوں کو برتا گیا ہے۔

یوسف خاں کمل پوش پہلا ایشیائی باشندہ ہے جس نے محض سیاحت کے
نقطۂ نظر سے یورپ کا دورہ نہیں کیا بلکہ وہاں کے تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور
معاشی حالات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا، نہ صرف یہ بلکہ اپنے مشاہدات و تجربات کو دلچسپ
اور پر لطف انداز میں رقم کر کے اردو سفرنامے کی داغ بیل ڈالی۔ اپنی ابتدائی اشاعتوں
کے بعد مدت دراز سے یہ سفرنامہ گوشۂ گمنامی میں تھا تاہم اس اعتبار سے اہم تھا کہ
اردو کا اولین سفرنامہ یہی ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا

[1] داستانِ تاریخِ اردو (طبع سوم کراچی)، ص: ۳۶۹

ہے کہ یہ اپنی اولین اشاعت کے بعد سے ہی قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا تھا۔ جس کا
ثبوت مشہور مستشرق گارساں دی تاسی کا پانچواں اور چھٹا خطبہ ہے کہ جس میں موصوف
نے بطورِ خاص اس سفرنامے کا ذکر کیا ہے۔ دونوں خطبات کے اقتباسات
ملاحظہ ہوں ــ

پانچواں خطبہ (۴ دسمبر ۱۸۵۴ء)

" اب میں چند سفرناموں کا ذکر کرتا ہوں۔ سفرنامہ یوسف خاں لکھنوی۔ یہ سفر
انگلستان و فرانس ہے جو انہوں نے ۱۸۳۷ء میں کیا۔ یہ کتاب دہلی میں چھپی
ہے ــ کریم خاں دہلوی کا سفرنامہ لندن ۱۸۴۰ء ــ اس کا ترجمہ میں نے
"اورینٹ ریولو" میں شائع کیا۔ پہلے صاحب نسلاً پٹھان ہیں۔ اور
درویش یا صوفی ہیں اور کمبل پوش کے نام سے مشہور ہیں۔

چھٹا خطبہ (۲ دسمبر ۱۸۵۵ء)

" میں اس موقع پر اخلاقی ناولوں کو فراموش کرنا بھی نہیں چاہتا مثلاً "سندھی
بندگی"۔۔۔ "یا بنجارا" جس میں صاف طور پر دنیاوی چیزوں کی بے ثباتی
ثابت کی گئی ہے یا فارسی تاریخ کشمیر مؤلفہ محمد عظیم کا اردو ترجمہ یا سبحان
کی تاریخ فقہائے اسلام یا یوسف علی خاں کا سفرنامہ یورپ"

"عجائبات فرنگ" کی اسی اہمیت کے پیش نظر طبع دوم کی اشاعت کے پورے
ایک سو آٹھ سال بعد اسے از سرِ نو مرتب کر کے وضاحتی اور تشریحی حواشی کے ساتھ شائع
کیا جا رہا ہے[1]۔ اس کی اشاعتوں کی تفصیل یہ ہے۔

[1] راقم الحروف ایک مضمون کے ذریعے ۱۹۷۷ء میں اس کا تفصیلی تعارف پیش کر چکا ہے۔
ملاحظہ ہو "قومی زبان کراچی (دسمبر ۱۹۷۷ء) یہی مضمون افکار کراچی کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن
میں مکرر شائع ہوا

طبع اوّل	دہلی ۱۸۴۷ء	مطبع العلوم مدرسہ دہلی
طبع دوم	لکھنؤ ستمبر ۱۸۷۳	مطبع منشی نول کشور

اس کے بعد سے اگرچہ جا بجا اس سفرنامے کا حوالہ ملتا ہے، مگر کوئی قابل ذکر اشاعت سامنے نہیں آتی البتہ اس کی افادیت اور اہمیت مسلم ہے۔ یہ کتاب طبع دوم کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جو دشواریاں سامنے آئیں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

۱۔ کتاب کا متن ایک صدی قبل کے مروّجہ املا میں تھا جس کا موجودہ دور کے عام قاری کے لئے سمجھنا مشکل تھا۔

۲۔ قدیم انداز میں ابتدا سے آخر تک پیراگراف بنائے بغیر عبارت چلتی رہتی جس کا آج کے دور میں پڑھنا طبیعت کی گرانی کا باعث ہوتا۔

۳۔ متن میں مختلف مقامات پر ضرب الامثال، اشعار اور دیگر حوالے غلط تھے۔

۴۔ متن میں شامل اشعار کو نثر کے انداز میں لکھا گیا تھا اور ان سے بیشتر شعر جلی قلم سے لکھ دیا گیا تھا۔

۵۔ پورا متن ایک ہی باب کی صورت میں تھا جبکہ اس میں مختلف ملکوں، شہروں اور لوگوں کا ذکر موجود ہے۔

کتاب کی تدوین و ترتیب کے وقت ان تمام کوتاہیوں کو (جو اس دور کے مطابق یقیناً کوتاہیاں نہیں تھیں، جب یہ کتاب طبع ہوئی)، دور کر دیا گیا ہے۔ متن کو کہیں بھی تبدیل نہیں کیا گیا تاہم املا کو موجودہ انداز میں کر دیا گیا ہے، مختلف مقامات پر غلط اشعار، ضرب الامثال اور دیگر حوالوں کو درست کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ عبارت کو مختلف پیراگراف میں تقسیم کر کے عبارت اور واقعات کی مناسبت سے یہ دس ابواب قائم کئے گئے ہیں جن سے سفرنامے کے حسن میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۱۔ آغازِ سفر	۲۔ لندن	۳۔ پیرس
۴۔ پھر لندن میں	۵۔ سوئے وطن	۶۔ مصر
۷۔ مصر سے بمبئی	۸۔ بمبئی سے کلکتہ	۹۔ کلکتہ سے لکھنؤ

اس اعتبار سے یہ سفرنامہ اپنی تمام تر قدامت کے باوجود آج کے قاری کے لئے قابل قبول اور پرکشش بن گیا ہے۔ اس کوشش میں کہیں بھی سفرنامے کے اصل متن میں تحریف، ترمیم یا تنسیخ ہرگز نہیں کی گئی ہے۔ البتہ وضاحت کے لئے مختلف مقامات پر حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے پر تمام تر مفاہیم واضح ہو سکیں اس کتاب کو تحقیقی دستاویز بنانے اور حوالوں کے بوجھ سے لادنے کی بجائے عام قاری کے لئے سادہ انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کوشش میں کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ باذوق اہل ادب اور قارئین بخوبی کر سکتے ہیں۔

یہاں میں اپنی بیگم اور بچوں علی ایزد عباس اور حسن امجد عباس کا شکریہ نہ ادا کروں تو ناانصافی ہوگی کہ جنہوں نے اس دقیق کام کی تکمیل کے لئے سازگار ماحول فراہم کیا کتاب کے ناشر برادرم جمیل الغنی جو میرے نزدیک ناشر سے زیادہ ادیب و مصنف ہیں ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی مساعی سے یہ تاریخی اور نایاب سفرنامہ منظر عام پر آ رہا ہے۔

منظفر عباس
یکم ستمبر ۱۹۸۱ء

شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج لاہور

تقاریظ

- ڈاکٹر عبادت بریلوی
- ڈاکٹر فرمان فتح پوری
- پروفیسر جیلانی کامران
- ڈاکٹر سہیل احمد خاں

تقریظ (۱)

یوسف کمل پوش کا سفرنامہ "عجائبات فرنگ" اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کہ اس میں ایک ایسے شخص کے تاثرات یکجا ہیں۔ جس نے انیسویں صدی کے وسط میں دیار فرنگ، کا سفر کیا اور وہاں جو کچھ اس نے دیکھا جو کچھ اس نے محسوس کیا اور جو تجربات اسے ہوئے ان سب کو اس نے بڑی تفصیل اور جزئیات کے ساتھ اس سفرنامے میں سمو دیا۔

یہ ایک بڑی ہی دلچسپ داستان ہے جس میں دیار فرنگ کے عجائبات، افراد کے رہن سہن، وہاں کی معاشرتی زندگی اور تہذیب و ثقافت کا آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان کے ان گنت پہلوؤں کی تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں،

کمل پوش کے انداز بیان میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات پیش کرنے میں اسے کمال حاصل ہے، پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تمام مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ جو کمل پوش نے دیکھے اور وہ تمام واقعات اس کے بھی تجربات ہیں جو آج سے تقریباً سوا سو سال پہلے "عجائبات فرنگ" کے مصنف کو پیش آئے۔

یوسف کمل پوش کی یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے جس میں مغرب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا بنیادی طور پر ایک ایشیائی اور برِ عظیم پاکستان و ہند کا رہنے والا ہے اس اعتبار سے یہ کتاب بہت اہم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ غالباً پہلی کتاب ہے جس میں مشرقی زاویۂ نظر سے مغرب کی معاشرتی و تہذیبی زندگی کا

مطالعہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب انیسویں صدی میں شائع تو ہوئی لیکن جس طرح اس کی ترتیب و تدوین ہونا چاہیے تھی وہ نہ ہوئی۔ روائتی انداز میں کتاب کو چھاپ دیا گیا۔ اب میرے شاگرد عزیز ڈاکٹر مظفر عباس نے اس کو بڑی محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے عبارت کی تصحیح کی ہے، پیراگراف بنائے ہیں، ابواب میں تقسیم کیا ہے اور اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے اور اس طرح اب یہ کتاب منظر عام پر آ رہی ہے اس سے قبل ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر مظفر عباس نے اس کا تعارف "قومی زبان" کراچی کے ستمبر کے شمارہ میں کروایا تھا۔ جس سے اس کی اہمیت واضح ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے کئی سال تک اس کتاب پر محنت کی۔ اس کو از سرِ نو مرتب کیا اور اب یہ کتاب علمی دستاویز کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آ رہی ہے۔ جس کو نہ صرف علمی و ادبی لوگ بلکہ ایسے لوگ بھی دلچسپی سے پڑھیں گے جن کا مزاج عالمانہ نہیں ہے لیکن جن کو مغرب کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق ہے۔

(ڈاکٹر) عبادت بریلوی

سابق صدر شعبۂ اردو و پرنسپل یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور

تقریظ (۲)

عربی لغات میں سفر کا لفظ 'پردہ اٹھانے'، وضاحت کرنے، مصالحت کرانے اور تعلقات کو استوار کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ سفارت و سفیر کی اصل بھی یہی ہے اور مسافر و سفیر یا سفارت و مسافرت، سب میں، اس الفاظ کے بنیادی معنی شامل ہیں سیاست و حکمرانی کے حوالہ سے، اس لفظ کے معنی، وسیع سے وسیع تر ضرور ہوتے چلے گئے ہیں، پھر بھی معنی کی یہ وسعت، اس کے اساسی پہلو پر اثر انداز نہیں ہوئی۔ اس اعتبار سے جو شخص سفر کرتا ہے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے، اس کے مشاہدے اور تجربے میں ضرور کچھ ایسی باتیں آتی ہیں جو دریافت و انکشاف یا تازہ اطلاعات و معلومات کا درجہ رکھتی ہیں اور جس جگہ یہ شخص پہنچتا ہے، اس جگہ سے وہ کسی نہ کسی نہج سے، ضرور ایک نیا رشتہ استوار کرتا ہے یہ رشتہ بظاہر ذاتی ہوتا ہے لیکن جس جگہ سے آدمی سفر کر کے گیا تھا اور جہاں واپس آیا ہے اگر اسے بھی نظر میں رکھیں تو ماننا پڑے گا کہ اس کے انفرادی تجربے میں، جلد یا بدیر، بہت سے دوسرے لوگ بھی شریک ہو جاتے ہیں۔ آخر آخر یہی شرکت، دو اجنبی قوموں اور ملکوں کے درمیان علم و ادب اور تہذیب و ثقافت سے لے کر صنعت و تجارت اور حکومت و سیاست تک، سب کے لیے ایک ایسے اشتراک و اتحاد کی بنیاد بن جاتی ہے جو آئندہ کئی نسلوں تک کے لیے ناآشنا و اجنبی طبقوں کے درمیان خیر سگالی کے جذبات و تعلقات کی استواری کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ سفر کو وسیلۃ الظفر، یوں نہیں کہا گیا اور حضورِ اکرمؐ نے حصولِ علم کے حوالے سے مثالاً چین جیسے دور دراز کے علاقے تک کے سفر کرنے کا ارشاد بے سبب نہیں فرمایا اس ارشاد میں وہ سارے افادات و مضمرات شامل ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اب اگر سفر کو ایک خاص

تہذیبی حوالے سے اور دینی زاویے سے دیکھئے تو جسے عرفِ عام میں مسافر کہا جاتا ہے وہ معناً ایک ایسے پیامبر کے مترادف ہو جاتا ہے جو پہلے اپنے ذہن و فکر کو نامانوس و اجنبی مقامات کی جغرافیائی و تاریخی حقائق اور سیاسی و سماجی کوائف سے آشنا کرتا ہے ۔ پھر اپنے وطن واپس ہو کر اس آشنائی کی وساطت سے اہلِ وطن کو تجربات و مشاہدات کا ایسا قیمتی ذخیرہ مہیا کر دیتا ہے جو کسی دوسرے وسیلے سے ہاتھ نہیں آسکتا ۔ غالباً یہی وہ افادی نکتہ ہے ۔ جس کے تحت ، مہاجرت کو ، جسے مسافرت ہی کی ایک صورت کہنا چاہیئے اسلام میں ایک ایسا استحسانی اقدام و عمل سمجھا گیا ہے ، جو مادی یا زمینی رشتوں سے بلند ہو کر نظریاتی بنیادوں پر دنیا کے ہر خطے اور اس کے باشندوں کے لئے پیغامِ اخوت و محبت بن جاتا ہے ۔ مکہ سے ہجرت کرنے والوں کو اہلِ مدینہ نے جس کشادہ قلبی اور خنداں پیشانی کے ساتھ اپنا لیا اس کی روشنی میں آتش کا یہ شعر کتنا سچا معلوم ہوتا ہے کہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

علم و عرفان کی تلاش میں ہمارے قدیم علماء و صوفیہ کرام نے ، کیسے کیسے طویل اور دشوار گذار سفر کئے ہیں ان مسافتوں کو ذہن میں رکھ کر دیکھئے تو فارسی کا یہ شعر صداقتوں کا مظہر نظر آئے گا ۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے
صوفی نہ شود صافی تا در نہ کشد جامے

مختصر یہ کہ سفر اور سفر کی معرفت حاصل شدہ تجربات ، نہ صرف مسافر کے لئے بلکہ اس کے سارے متعلقات کے لئے گوناگوں اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور جب یہ تجربات ، تحریر میں منتقل ہو کر ، سفرنامہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ، نیز طباعت و اشاعت کی منزل سے گزر کر عوام الناس تک پہنچ جاتے ہیں تو ان کا افادہ بھی کثیر و دیرپا ہو جاتا ہے اس افادیت و اہمیت نے سفرناموں کو مقبولیت بخشی اور اسی کی بدولت اس نے ایک مستقل صنف

ادب کی صورت اختیار کر لی ۔ یہ صنف ، اردو میں بھی اب اجنبی نہیں رہی بلکہ آج کل اس کا رواج ہے چنانچہ ہر سال دو چار ، معیاری و غیر معیاری سفرنامے منظرِ عام پر آجاتے ہیں لیکن اردو میں اس صنف کے بانی اور اس روایت کے خالق ، یوسف خاں کمبل پوش ہیں جن کا سفرنامہ " عجائباتِ فرنگ " اس وقت تازہ تر تدوین و تزئین کے پیشِ نظر ہے ۔

یوسف خاں کمبل پوش کا یہ سفرنامہ ، کس نوع کی حقیقتی معلومات اپنے اندر رکھتا ہے اور اردو کا پہلا سفرنامہ ہونے کی حیثیت سے ، ہماری ادبی تاریخ اور سفرناموں کی روایت میں اس کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ مرتب کے مقدمہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ۔ سفرنامہ کے مرتب ڈاکٹر مظفر عباس اردو کے ان جواں سال ناقدین و محققین میں سے ہیں جنہیں اب کسی تعارف کی ضرورت نہیں رہی ۔ پچھلے بارہ پندرہ سال سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں ، اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے ان کے نام اور کام سے خوب واقف ہیں وہ حقیقی معنوں میں ادب کے طالب علم ہیں کہ محنت و مطالعہ کے عادی ہیں ، کام کرنے کا شغف اور کام کرنے کا سلیقہ دونوں اُن کے مزاج کے اجزا ہیں ، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں وہ تنقیدی و تحقیقی صلاحیت بھی ہے جو کلاسیکی تحریروں کی از سرِ نو ترتیب و تدوین کے لئے از بس ضروری ہے ۔

یہ سفرنامہ کم و بیش ڈیڑھ سو سال پرانا ہے اور ۱۸۵۰ء سے کچھ پہلے اس زمانے میں لکھا گیا ہے جس کی معاصر یادگاریں ، رجب علی بیگ سرور کی " فسانۂ عجائب " اور سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید ہیں ۔ ظاہر ہے اس زمانے کا اردو املا اور اس وقت کا اسلوبِ نگارش بہت متناعانہ اور آج سے مختلف ہے ۔ سفرنامہ کی ترتیب اور ابواب کی تقسیم ، آجکل کے سفرناموں جیسی نہیں ہے ۔ ایسے میں لطف اندوزی کے ساتھ اس کا مطالعہ و افادہ عام قاری کے لئے خاصا مشکل تھا ۔ ڈاکٹر مظفر عباس نے اس مشکل کو آسان کر دیا یعنی اصل متن کو مجروح کئے بغیر اس کے مندرجات کو نئی ترتیب و تزئین کیا تھا اس طرح سامنے

لے آئے کہ اب اسے رواں دواں انداز میں لطف لے کر بآسانی پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے میں انہوں نے رموزِ اوقاف سے بھی مدد لی ہے اور حسبِ ضرورت بعض الفاظ کے قدیم املا کو بھی آج کے مروجہ املا کے مطابق کر دیا ہے۔

ڈاکٹر مظفر عباس نے کتاب کے ساتھ ساتھ صاحب کتاب سے بھی ہمارا بھرپور تعارف کرایا ہے "عجائبات فرنگ" کا مصنف کون تھا، کیا تھا، کب اور کیوں گیا تھا۔ اور کب واپس آیا۔ اس قسم کے جتنے سوالات بھی کسی سفرنامے کے مصنف کے بارے میں کئے جا سکتے ہیں ان سب کے شافی جوابات ڈاکٹر مظفر عباس نے اپنے مقدمے میں فراہم کر دیئے ہیں۔ اس کام میں انہوں نے ان مقالات سے بھی مدد لی ہے جو اس سفرنامے کے بارے میں پچھلے دس پندرہ برسوں میں شائع ہوئے۔ لیکن ان کی توجہ، ایک سچے محقق کی حیثیت سے، اساسی مآخذ کی طرف رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں سارے قدیم تذکروں کو بذات خود کھنگالا ہے، ان میں سے ریزہ ریزہ حالات یکجا کئے ہیں اور پھر انہیں اس سلیقے سے ترتیب دے دیا ہے کہ ان کے مقدمے کی معرفت "عجائبات فرنگ" کے مصنف کا ایک بھرپور اور قابل اعتماد سوانحی خاکہ سامنے آجاتا ہے اور اس سوانحی خاکے کی پیشکش میں تحقیقی مواد کے ساتھ ساتھ، چونکہ حد درجہ شگفتہ و دلآویز پیرائیہ بیان سے بھی کام لیا گیا ہے اور مکتبہ عالیہ کے جمیل النبی صاحب نے اس کی طباعت و اشاعت میں اپنے ذوق جمال کا بھی ثبوت دیا ہے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو کا یہ اولین سفرنامہ اپنی قدر و قیمت اور افادیت کے تحت، اسی حسن التزام و احتیاط کے ساتھ منظر عام پہ لایا گیا ہے جس کا وہ مستحق تھا۔

(ڈاکٹر) فرمان فتح پوری

شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی

تقریظ (۳)

یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ہماری زبان میں لکھا ہوا پہلا سفرنامہ ہے۔ جس میں پچھلی صدی کے وسط کی یورپی زندگی اور انگریزوں کی تمدنی کیفیت کا تفصیلی اظہار ہے۔ کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں یورپ اور انگلستان کی سیاحت کی تھی، جب برصغیر پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن انگلستان ابھی اُس دور میں داخل نہیں تھا جسے برطانوی تاریخ میں امپیریل دور کہا جاتا ہے اور ہم جسے استعماری دور کے نام سے پکارتے ہیں۔ کمبل پوش کا سیاحت نامہ اس اعتبار سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کے طرزِ عمل میں اور اہل انگلستان کے طرز عمل میں واضح فرق کی نشاندہی کرتا ہے اور اس طرح دو مختلف انسانی شخصیتوں کی وضاحت کرتا ہے جن سے اس کی شناسائی بیک وقت برصغیر کے علاقوں میں اور بعد ازاں برطانیہ میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ اُسے اہلِ انگلستان بہت پسند آئے ہیں اور ان کے اخلاق اور مروت کی اس نے بجا طور پر تعریف بھی کی ہے۔

جس زمانے میں کمبل پوش انگلستان میں وارد ہوا تھا وہ زمانہ گھوڑا گاڑی کا زمانہ تھا۔ اور ریل گاڑی کو سرزمین برطانیہ پہ چلتے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ یہ زمانہ تار برقی کا اور بھاپ سے چلنے والے سمندری جہازوں کا زمانہ تھا۔ سائنس نے اپنی ابتدائی ٹیکنالوجی سے انسان کو حیران کرنے کی ابتداد کی تھی۔ ۱۸۳۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کا سال بھی تھا۔ اس زمانے میں انگریز اُمرا فراک کوٹ پہنتے تھے۔ اور ٹاپ ہیٹ پہنتے تھے اور رکھ رکھاؤ سے بات کرتے تھے۔ عورتیں لمبے فراک پہنتی تھیں اور روائتی شرم و حیا ان کے آداب میں شامل تھا۔ اس زمانے کے شب و روز میں اہلِ برطانیہ کس مصیبت میں گرفتار تھے۔ اس کا ذکر وہاں کے

ناول نویس کرتے ہیں۔ خاص کر ڈکنس کے ناولوں سے اس دور کی زبوں حالی کا علم ہوتا ہے۔ مگر کمل پوش اس معاشرے کو باہر سے دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کیوں کہ وہ سیاح جہاں ہے اور اس کا کام انسانوں کے درمیان گھومنے کا ہے اور یہ دیکھنے کا ہے کہ زندگی کتنی دلچسپ ہے اور انسان کس کس طرح زندہ ہے اور خوش ہے۔

کمل پوش کے سفرنامے سے اس زمانے کے برصغیر کے انسانی رویوں کا بخوبی علم بھی ہوتا ہے۔ برصغیر میں انگریزوں اور یورپینوں کا اس نے خاص طور پر مشاہدہ کیا ہے اور اسے محسوس ہوا ہے کہ اہل برصغیر ان غیر ملکیوں سے نہ صرف مرعوب ہیں بلکہ ان سے خوف زدہ بھی ہیں۔ اس نے راجاؤں کا ذکر بھی کیا ہے جو اپنے لوگوں پر ظلم روا رکھتے ہیں۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کے سامنے تھر تھر کانپتے ہیں۔ کمل پوش اس اعتبار سے ایک قابل ذکر سیاح ہے کہ وہ شاید واحد شخص ہے جو اس زمانے میں انگریزی جانتا ہے اور انگریزی میں گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ اپنی سفید اور سرخ رنگت کے ساتھ، اور انگریزی بولنے کی مہارت کے سبب اسے اپنے سفر کے دوران دلچسپ حالات سے بھی گزرنا پڑا ہے۔ جہاں اسے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنا کا موقعہ بھی ملا ہے۔

جس زمانے کے دوران یہ سفرنامہ لکھا گیا ہے وہ زمانہ متعدد و متضاد تحریروں کے باعث بہت کچھ دھندلا چکا ہے۔ اس لئے جب کبھی ہم اس زمانے کی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں ادھوری صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ انگریز کا امیج، ہمارا اپنا امیج اور ہماری دنیا کا امیج۔ زمانے کے پس منظر میں بہت حد تک بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کمل پوش کا سفرنامہ اس دور کی تصویر کو درست طور پر سمجھنے میں یقیناً مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ادب کی درست شناخت کے لئے ایسے سفرناموں کا پس منظر کے طور پر مطالعہ کیا جائے تاکہ اس زمانے کے انسانوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہو۔ کمل پوش کا سفرنامہ اس پس منظر کے لئے مناسب مواد فراہم کرتا ہے۔

ڈاکٹر مظفر عباس نے اس سفرنامہ کو ایڈٹ کرتے وقت مناسب مقامات پر املا کو جدید طریق کے مطابق بدلا ہے اور جہاں کہیں ضروری دکھائی دیا ہے، قاری کو سفرنامے کے مطالعے کے دوران پیش آنے والی دقتوں کو رفع کیا ہے۔ اس طرح اس سفرنامے میں اور اس گزری ہوئی دنیا میں داخل ہوتے ہوئے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مظفر عباس ہمارے ان نوجوان دوستوں میں شامل ہیں، جن کا اردو ادب کے ساتھ رشتہ محبتوں کا رشتہ ہے اور جو اپنی ادبی تاریخ کے افق سے ان خدوخال کو دریافت کرنے کی مسلسل کوشش کرتے ہیں، جن کو زمانے کے نشیب و فراز نے نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ کمل پوش کا سیاحت نامہ ایسی ہی محبتوں اور ایسی ہی کوششوں کی ایک قابلِ ذکر مثال ہے۔

(پروفیسر) جیلانی کامران
شعبۂ انگریزی ایف سی کالج
لاہور

تقریظ (۴)

ناصر کاظمی نے اپنی شاعری میں "شہر" کے استعارے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ اصل شہر تو دل کا شہر ہے۔ باقی شہر تو اس عظیم شہر کی (جسے دل کہتے ہیں)، گلیاں ہیں۔ اسی طرح کہا جا سکتا ہے کہ سب سے عظیم سفر تو اپنے آپ کو پہچاننے کا یا اپنے باطن کا سفر ہے اور اس کے عجائبات کے سامنے ہر سفر کے عجائبات ہیچ ہیں مگر یہ بات بھی غور کے قابل ہے کہ باطنی سفر کا احوال بھی خارجی سفر کے تلازمات کے ذریعے بیان ہوتا ہے اور خارجی سفر بھی انسانوں کے لئے وسیلۂ ظفر اور وسیلۂ خبر بنتا ہے۔ قدیم کہانیوں اور داستانوں میں سفر کے کیسے کیسے مراحل ہیں، پھر مختلف تہذیبوں کی روحانی روایتوں نے اس سفر کو کیسا کیسا مفہوم دیا ہے۔ خود ہمارے صوفیا کے ہاں سیر انفس و آفاق، سفر در وطن، اسفار اربعہ اور اسی طرح کے مقامات و احوال کی تفصیل مختلف کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ فی الحال میرؔ کا ایک شعر سن لیجئے۔

رہتے تو تھے مکاں پہ، ولے آپ میں نہ تھے
اُس بن ہمیں ہمیشہ وطن میں سفر رہا

پچھلے کچھ برسوں سے ہمارے یہاں سفرنامے سے خوب دلچسپی لی جا رہی ہے اچھے بُرے سفرناموں کی ایک بھرمار سی نظر آتی ہے۔ مگر یہ سوال بھی اہم ہے کہ جس چیز کو آجکل سفرنامہ کہا جاتا ہے اس انداز کی تحریروں کی کچھ شکلیں پہلے بھی موجود تھیں یا نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں سفرنامہ کی کوئی تاریخ ہے یا نہیں۔ یہ تلاش ہمارے کچھ محققین اور نقادوں کے لئے اہم ٹھہری۔ اس ضمن میں یوسف کمبل پوش

کے سفرنامے "عجائباتِ فرنگ" کا نام بھی لیا جاتا ہے، جسے مظفر عباس جدید قارئین کے سامنے لا رہے ہیں۔ مظفر عباس نے اس سفرنامے سے خصوصی شغف کا اظہار کیا ہے، ان کا ایک مضمون ـــــ "اردو کا پہلا سفرنامہ ـــــ عجائبات فرنگ" "قومی زبان" کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔ مظفر عباس سے اِس سفرنامے کی ترتیب کے مختلف مراحل میں جو گفتگو ہوتی رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی یہ کاوش جدید قارئین کے لئے قابلِ قبول ہوگی۔ انہوں نے یوسف کمبل پوش کے حالاتِ زندگی اور دیگر کوائف پر خاصی محنت کی ہے۔ محمد حسن عسکری مرحوم کی کتاب "جدیدیت" میں بھی یوسف کمبل پوش کا ایک اہم حوالہ موجود ہے انہوں نے کمبل پوش کے "سلیمانی مذہب" "خداشناسی" DEISM سے تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس اشارے کی مدد سے تحقیق کی جائے تو کچھ اور دلچسپ باتیں بھی سامنے آ سکتی ہیں۔ بہر حال مظفر عباس صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی کاوش سے ایک اہم دستاویز عام قارئین تک پہنچ رہی ہے۔

(ڈاکٹر) سہیل احمد خان
یونیورسٹی اورینٹل کالج
لاہور

متن

عجائباتِ فرنگ

(سفرنامہ، یوسف کمبل پوش)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ستایش بے نہایت اس خدا کو لائق ہے کہ یوسف کنعانی کو حاکم مصر کا بنایا اور یوسف سلیمانی کو نیچ ملک انگلستان کے پہنچایا۔ انسان ضعیف البنیان کو مرتبہ اشرف عطا فرمائی اور ساتھ عنایت کرنے گویائی زبان کے سب حیوانوں پر ممتاز کیا۔ اگر ہر سر مو بدن کا زبان ہووے۔ بیان حمد اس کی کا ہرگز امکان ہو ؎

وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے
قلم جو لکھے اُس سے افزود ہے

بہر حال یہی بہتر ہے کہ گلستان سخن کو پھولوں نعت سے زیب و زینت دوں۔ گوناگوں توصیف اُس رسولؐ کو زیبا ہے کہ گمراہوں کو چہ ضلالت کے تئیں شاہراہ ہدایت پر لایا اور نور رہنمائی اپنے سے جمال شاہد مقصود عرفان وحدانیت کا دکھلایا۔ ؏

بنی کون یعنی رسول کریمؐ
نبوت کے دریا کا دُر یتیم

ص۱ مراد خود سے ہے یعنی یوسف خان کمل پوش

ازانجاکہ مدح بادشاہ زماں مرکز خاطر ناتوان ہے۔ یہاں سے باگ سمند قلم کی اُس کی طرف پھیرتا ہوں۔ سبحان اللہ عجب شہنشاہ ہے کہ سبب عدالت اُس کی سے شیر و بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ رعایا سایۂ عنایت اُس کی میں روز و شب بہ آسائش بسر کرتی ہے۔ چور نے شہر میں پاسبانی اختیار کی۔ شیر نے بیشہ میں پیشۂ شبانی۔ گل عشرت آبیاری عدل اس کے سے سیراب۔ خار عشرت چمن پیرائی رأفت اس کی سے نایاب۔ سخاوت اس کی سے ابر گہر بار شرمسار مناسبت اُس سے حاتم طائی کو افتخار۔ مطلع مجد و اعتلا کوئین دکٹوریا۔ فرماں روائے انگلستان۔ تاج بخش شاہاں جہان۔ خلد اللہ سلطنتہا الی نہایت الزماں بعد حمد و نعت کے کہتا ہے۔ امیدوار رحمت پروردگار خطاپوش عذر نیوش یوسف خان کمل پوش۔ کہ اس عاجز نے اکثر اوقات اپنی سیر ملکوں میں بسر کی اور کیفیت عجائبات زمانہ کی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اکثر دوستوں پر روداد سفر عیاں کیا۔ انہوں نے نہایت محظوظ اور مشتاق ہو کر مجھ کو آمادۂ تالیف و بیان کیا۔ ناچار بپاس خاطر ان کے فقیر نے جو کچھ سفر میں دیکھا بھالا تھا اس رسالہ میں مفصل لکھا۔ اس کے دیکھنے والوں سے امیدوار ہوں کہ بمقتضائے بشریت اگر کہیں کچھ بھول جاؤں تو اپنی عنایت سے معاف کریں اور اس عاصی پر معاصی پہ عتاب نہ فرمائیں۔ اس لئے کہ انسان بھول چوک سے خالی نہیں اور خاکی کو رتبہ عالی نہیں۔ ؏

قاریا بر من مکن چندیں عتاب
گر خطائی رفتہ باشد در کتاب

چونکہ اس کتاب میں سب حال اپنا گذار بیاں تھا۔ نام اس کا تاریخ یوسفی رکھا الاہتمام منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

گلہ بانی۔ چوپایوں کی نگہبانی

"آغاز سفر"

آغاز حال مؤلف

یہ فقیر ہیچ سن اٹھارہ سو اٹھائیس عیسوی مطابق سن بارہ سو چوالیس ہجری کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد ڈھاکہ مچھلی بندر۔ مندراج گورکھپور نیپال. اکبرآباد شاہجہان آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا۔ یہاں بمددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خان منکنس صاحب بہادر کی ملازمت نصیرالدین حیدر شاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پر اختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی۔ رسالۂ خاص سلیمانی میں عہدہ جماعہ داری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبہ داری اسی رسالہ کی دیگر دو ماہہ[1] بڑھایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکر از منعم حقیقی کا بجالاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامنگیر حال ہوا بہت محنت کرکے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا۔ دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔

---

[1] مشاہرہ۔ تنخواہ

اکبار گی سن اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں دل میرا طلب گار سیاحی جہان خصوصی ملک انگلستان کا ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردون بارگاہ نے بصد عنایت و انعام اجازت دی۔ عاجز تسلیمات بجا لایا۔ اور راہی منزل مقصود کا ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد دارالامارۃ کلکتہ میں پہنچا۔ پانچ چھ مہینے وہاں کی سیر کرتا رہا۔ بعد ازاں جمعرات کے دن تیسویں تاریخ مارچ کے مہینے میں سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا۔ نام جہاز کا ازابلیہ۔ کپتان اس کا ڈبیڈ بران صاحب مع اپنی بی بی کے تھا۔ جہاز وزن میں چھ سو ٹن کا کنارے گنگا پر آ لگا تھا۔ یہاں سے دریائے شور پہنچنے تک اُس کی اعانت کو دھوئیں کا جہاز مقرر ہوا۔ تھوڑے دنوں میں اپنے زور سے ہمارے جہاز ازابلیہ کو گنگا سے کھینچ کر سمندر میں لے گیا۔ وہاں سے جہاز ہمارا چل نکلا۔ دونوں طرف گنگا کے کنارے سبزہ آبدار لہلہا رہا تھا جا بجا مکان صاحبان انگریز کا بنا ہوا نادر اور زیبا۔ جہاز واں پر عجب سماں تھا۔ بیان میں نہیں سماتا۔ اس سبزے کو دیکھ کر دل میرا ملول ہوا کہ دیکھئے پھر کبھی یہاں آنا ہو یا نہیں۔ جمعہ کے دن اکتیسویں تاریخ مارچ کے کھڑے میں پہنچ کر جہاز ٹھہرا۔

جب آدھی رات کا وقت ہوا۔ طوفان شدید آیا۔ سبھوں کا دل گھبرایا اور جہاز ڈگمگایا مگر قدرت الٰہی سے زنجیر لنگر کی نہ ٹوٹی۔ روح کسی ذی حیات کے قفس بدن سے نہ چھوٹی۔

ع رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت

خدا خدا کر کے تیسری اپریل کو جہاز ہمارا دریائے گنگ سے سمندر میں پہنچا۔ ہوا موافق کا بہنا شروع ہوا کپتان صاحب نے بادبانوں کو کھول دیا۔ جہاز تیر کی طرح چلا۔ ننگو خدمت گار میرا تیز روی جہاز سے ڈر کر کہنے لگا۔ کپتان صاحب بادبانوں کو باندھیں۔ نہیں تو جہاز الٹ جائے گا۔ میں نے اس کا کچھ نہ سنا۔ ہراساں ہو کر جہاز میں بیٹھ گیا اور کہتا تھا کہ میں عبث اپنے تئیں یہاں لایا۔ اگر نہ آتا یہ مصیبتیں کیوں اٹھاتا۔ کپتان صاحب ہم سب لوگوں پر اتنی مہربانی فرماتے تھے کہ تکلیف اور مصائب جہاز کے کچھ نہ ہونے پاتے۔ ہر طرح کے کھانے پینے میوے دودھ گوشت شراب شام پئین[1] وغیرہ موجود تھی۔ عنایت کپتان صاحب سے ابواب تکلیف ہر صورت سے مسدود تھے۔ اتوار اور جمعرات کو موافق رسم مقررا انگریزوں ہر قسم کے کھانے اور مٹھائی زیادہ پکتے۔ ہر ایک کے کھانے میں آتے۔ غرض کہ ہر نہج سے آسائش تھی۔ گھر میں یہ بات میسر نہیں آتی۔ منگل کے دن چوتھی تاریخ ہوا بند تھی۔ ایک عجب تماشا اور کیفیت نظر آئی۔ ہزاروں کچھوے تیرتے ہوئے پانی پر پھرتے۔ کپتان صاحب نے جہازیوں کو حکم دیا کہ کشتی پر سوار ہو کر ان کا شکار کرو۔ جہازیوں نے بموجب حکم ان کے ناؤ پر سوار ہو کر کانٹوں آہنی سے کچھوؤں کو زخمی کیا۔ بعد اس کے جیسے کوئی جنگل سے بنوا کنڈے چنتا ہے ان کو پانی سے اٹھا کر کشتی پر رکھا۔ اسی طرح دو تین گھڑی خوب شکار کیا۔ اتنے عرصہ میں دو دو من کے چوبیس عدد کچھووں کو پکڑا۔ ایک امر عجیب دیکھا کہ ہر ایک کی گردن میں نیچے ایک چھوٹی مچھلی جونک کی طرح چمٹی تھی۔ کپتان صاحب نے بڑی چمڑے سے

---

[1]: شراب کا نام CHAMPAGNE

گوشت ان کا صاف کروا کر لوگوں کو بانٹ دیا۔ مجھے اس گوشت سے نفرت اور کراہت آئی۔ ہر چند کپتان صاحب نے اصرار کیا پر میں نے نہ کھایا اور لوگوں نے دو تین دن تک کباب اور شوربا اس کا بڑے مزے سے کھایا۔ یہ طرفہ ماجرا تھا کہ جس روز ہوا کا چلنا موقوف ہوتا، غول کچھووں کا خواب غفلت میں آ کر بے باکانہ پانی کے اوپر آتا۔ اس وقت جس کا جی چاہتا آسانی سے ان کو پکڑ لیتا۔ جہاز رواں تھا۔

ساتویں تاریخ مئی کو بڑا طوفان آیا۔ پانی ایسے زور سے اچھلتا کہ لب جہاز تک آتا آخر صدمے اس کے سے دونوں کنارے جہاز کے ٹوٹے۔ گیارہ بھیڑیں اور کئی مرغیاں اور بطخیں اور کتنے اسباب پانی میں ڈوبے۔ سب آدمی اپنی زندگی سے مایوس ہو کر روتے اور خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں عجز و نیاز کرتے۔ نویں تاریخ کچھ کم ہوا۔ کپتان صاحب نے بادبانوں کو کھولا۔ دسویں تاریخ کو اس سے زیادہ آیا پھر بڑا بادبان کا شدت ہوا سے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پانی میں گرا اور مستول جہاز کا ٹوٹ گیا۔ ایک میز جہاز میں جڑا تھا۔ صدمے ہوا سے جڑ سے اکھڑ کر پانی میں ڈوبا۔ جہاز کی دونوں طرف سے پانی آئینہ ساں قریب سر ہمارے کے اچھلتا۔ مگر فضل الٰہی نے ہم کو اس صدمے سے بچایا۔ سب لوگ بہت گھبرائے اور اس سانحہ سے سخت حیران ہوئے کہ اے خدا سوائے تیرے ہمارا کوئی مددگار نہیں اور ہم میں سے کوئی اپنے بچانے کا مختار نہیں حق تعالیٰ نے اپنی عنایت سے گیارہویں تاریخ اس طوفان کو دور کیا۔ خسرو خاور نے تخت زریں فلک پر جلوۂ نور دکھایا۔ دھوپ نکلنے سے میں ایسا مسرور ہوا کہ بیان اس کے سے زبان معذور۔ جیسے عاشق مہجور طالب دیدار معشوق ہو، ویسے جہاز والے کمال شوق سے دھوپ کو دیکھتے ہر سو۔ آخر بتائید الٰہی جہاز ان بلاؤں سے نجات پا کر روانہ ہوا۔ تیسری تاریخ جون کی ہفتہ کے دن دوپہر کو ایک بوم شوم بلندی ہوا سے جہاز کی طرف جھکا آ کر جس کوٹھڑی میں ہم سبھوں کا کھانا رکھا تھا اس کی چھت پر آ

بیٹھا۔ کپتان صاحب نے مجھ سے پوچھا یہ کیا نشان ہے۔ میں نے کہا خوب نہیں، ابھی ایک بلا سے نجات پائی ہے۔ ایسا نہ ہو پھر کوئی اور سانحہ پیش آئے۔ خرابی میں پھنسائے آٹھویں تاریخ جمعرات کو دوپہر کے بعد زمین جزیرۂ کیپ کی نمایاں ہوئی مگر بسبب ناسازی ہوا کے جہاز کے پہنچنے میں دیر بیکراں ہوئی۔

تیرھویں تاریخ جہاز ہمارا جزیرہ سیمین بید میں پہنچا۔ عجب شہر طراوت افزا تھا کہ ہر طرف اس کے پہاڑ بلند سبزہ زنگار رنگ سے سبز رنگ تھے، غیرت دہ کارنامۂ ارژنگ[1] تھے۔ آب و ہوا وہاں کی ایسی معتدل اور لطیف تھی کہ ہر لحظہ بدن کو صحت دل کو راحت آتی۔ ہر چند ابتدا میں ان پہاڑوں کے دیکھنے سے وحشت ہوئی، مگر فی الواقعی روح نے اس سے تازگی پائی۔ وہ حال خواب و خیال معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ ایسا شہر آباد کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس شہر کے دیکھنے سے میں ایسا مسرور ہوا کہ کبھی دل سے نہیں بھولتا۔ اس واسطے کہ متواتر دو تین مہینے سے سوا دریا کے شکل زمین نہ دیکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر دوستوں کو یاد کر کے شراب پینے لگا۔ تماشائے قدرت صانع بیچوں کا ہوا۔ ایک جہاز مقلایہ نام حفاظت کے واسطے مقرر تھا۔ پچاس ضرب توپ اور سامان لڑائی کا اس پہ تھا۔ جہاز جو ادھر سے جاتے وہ لوگ ان سبھوں کا حال دریافت کرتے۔ اگر کوئی بیمار ہوتا۔ اس جزیرہ میں اترنے نہ پاتا۔ جب جہاز ہمارا وہاں جا کر پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب اور لوگوں نے ہمارے جہاز پر آ کر حال بیماروں اور تندرستوں کا پوچھا۔ افضال خداوندی سے کوئی بیمار نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب وغیرہ دیکھ بھال کر اپنے جہاز پر گئے شام کے وقت ہم لوگ ناؤ پر سوار ہو کر سیمین بید میں اتر گئے۔ وہاں کی خوبیاں اور بلندی مکانوں کی اور خوش اخلاقی آدمیوں کی

---

[1] قدیم چین کے ایک مشہور مصور کا نام اور بعض کے نزدیک مانی مصور کا نگار خانہ

دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سر اُنے کلارنس میں شام تک اپنی صحبت اور جلسے میں بیٹھے رہے۔

جب رات ہوئی جہاز پر جانے کی نیت کی۔ ملاح نے کہا رات کو ناؤ نہیں کھلتی ہے۔ ہم نے دیکھا کوئی تدبیر بنتی نہیں ہے۔ لاچار دس روپیہ دیکر اس کو راضی کیا تب جاکر مانجھی نے ہم کو ناؤ پہ چڑھا کر جہاز تک پہنچایا۔ آدمی وہاں کے سب حسین وجمیل پرلے سرے کے خوبصورت اور شکیل، خواب میں بھی ایسی صورتیں نہ دیکھی تھیں۔ جو بیداری میں نظر آئیں۔ اٹھارویں تاریخ افسران جہاز جنگی مجھ کو اپنے جہاز پر سیر دکھانے لے گئے۔ کام مضبوطی اور نفاست جہاز کی دکھائی۔ میں نے تو کبھی ایسا جہاز جنگی نہ دیکھا تھا۔ کاریگری اور خوبیاں اس کی دیکھ کر حیران ہوا کہ یا اللہ اس کو آدمیوں نے بنایا ہے یا فرشتوں نے سانچے میں ڈھالا ہے۔ پچاس توپیں اس پر لگی تھیں اور بیس ضرب اٹھارہ اپنی دائیں طرف اور بیس اٹھارہ اپنی بائیں طرف۔ پانچ پانچ تینتیس پنی ادھر ادھر کہ بے سلگانے پلیتے[1] اور مہتاب کے سب چھوٹیں۔ اور آئینہ کی طرح صاف صاف نظر آئیں۔ میگزین شیشے اور باروت[2] کا ایسا مضبوط بنا کہ کبھی اس کو صدمہ آگ یا پانی کا نہ پہنچتا بمقتضائے احتیاط ایک شیشہ گندا۔ اس کے اوپر کھڑا کیا۔ بجائے خود سدِ آہنی تھا۔ ہرگز آگ اور پانی کا اس پہ اثر اور گذر نہ ہوتا۔ اس جہاز پہ تین سو پچاس آدمی مسلح بیٹھے تھے۔ ہر وقت مستعد رہتے۔ ایک کنارے سات حبشی پا زنجیر تھے رنگ ان کا سیاہ کالا کہ اس طرف اندھیرا معلوم ہوا۔ بال اُن کے ایسے پیچیدہ کہ پیچ وتاب زمانہ ان سے شرمسار۔ اوپر کا ہونٹ ان کا نتھنوں تک پہنچا۔ نیچے کا ٹھوڑی تک لٹک آیا۔ میں ان کو دیکھ جانور صحرائی سمجھا کہ جہازیوں نے سیر وتماشہ کے لئے پالا۔ جب جہاز والوں سے پورا معلوم ہوا کہ حبشی ہیں اسپانیل

---

۱ فلیتے ۲ بارود

حبشیوں کو پکڑ لاتے ہیں۔ لوگوں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ صاحبان انگریز نے جہاز جنگی مقرر کئے کہ جب اسپانیل حبشیوں کو پکڑ لادیں۔ ان کو معہ سب اسباب کے ان سے چھین لیویں۔ چنانچہ ان کو ہم نے اُن سے چھین لیا۔ بسبب وحشت کے زنجیر میں قید کیا۔ جب ان کی وحشت کم ہو گئی۔ کچھ آدمیت ان کو آوے گی تو چھوڑ دیں گے۔ میں دیکھنے عجائبات اور خوش اخلاقی جہاز والوں سے بہت خوش ہوا اور رخصت ہو کر کنارے جزیرۂ کیپ کے آیا۔

تماشا عمارت وآبادی وہاں کا دیکھتا تھا کہ ایک مرد ضعیف ہمارے پاس آیا۔ کمال مہربانی اور اخلاق کیا۔ مجھ کو اور لوچر صاحب اور ایک اور شخص کو اپنے گھر لے گیا۔ گھر اگرچہ اس کا چھوٹا تھا مگر بہت خوب بنا تھا۔ ہم سبھوں کی ضیافت چائے اور شراب انگوری وغیرہ کی کی اور دو لڑکیوں خوبصورت اپنی کو تکلیف انگریزی باجے بجانے کی دی۔ ان دونوں سے ایک کتخدا اور دوسری کنواری تھی پر ہر ایک انگریزی باجوں بجانے میں کمال رکھتی۔ سننے اس کے سے روح کو راحت حاصل ہوئی۔ دل کو فرحت آئی۔ دو تین گھڑی بڑی کیفیت سے گذرے۔ آخر اس بڈھے اور پری رویوں سے ہم نے رخصت لی۔ حال اس بڈھے کا دریافت کیا۔ ظاہر ہوا کہ وہ شخص کار نجاری[1] میں یکتا تھا۔ جہازوں کو جوانی میں بناتا۔ اسی کام میں بہت روپے کمائے۔ اور مکان خوب خوب ہوئے۔ اب بہت دولت وعزت رکھتا ہے۔ عیش ونشاط سے زمانہ بسر کرتا ہے۔ اسی سبب سے بادشاہ جان کہلاتا ہے۔ وہاں سے ہم تینوں آدمیوں نے شریک ہو کر ایک گاڑی چھ گھوڑوں کی ساٹھ روپے کرائے پہ ٹھہرائی۔ اس پر سوار ہو کر واسطے سیر شہر کیپ کے چلے۔ راہ میں قدرت خدا کی نظر آئی۔

---

۱ لکڑی کا کام

بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ سبزہ ان پر بیحد و بے شمار سبزہ رخسارے معشوقوں کا اس
کے سامنے شرمندہ۔ دیکھنے اس کے سے خاطر شاد دل زندہ ہوتا۔ درخت پھولوں کے
جھونکے ہوا سے ہلتے۔ دل تماشائیوں کا اپنی طرف کھینچتے۔ دیکھنے روانی نہروں سے
آنکھ میں ٹھنڈک آتی۔ صفائی پانی اس کے کی چشمہ کوثر سے یاد دلاتی۔ بلبلیں
درختوں پر بیٹھی چہچہاتیں۔ قمریاں سرو کے سایے میں کوکو کا شور و غل مچاتیں۔ ایسے
ایسے طائر وہاں بیٹھے کہ طائر دل خود بخود جا پھنسے۔ قلم کو کیا طاقت کہ وصف وہاں کا
لکھے۔ زبان کو کیا مجال کہ خوبیاں اُس جا کی بیان کرے۔ صاحبان انگریز نے جابجا
مکان نفیس معہ پائیں باغ بنوائے ہیں۔ روز و شب اس میں آسائش سے رہا کرتے
تھے۔ راہ میں میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ کوئی بانسری بجاتا ہے کوئی شراب پیے
ہوئے پانی کی لہروں کی سیر دیکھتا ہے۔ ان باتوں کو دیکھ کر میرا دل لہرایا کاش کہ
کوئی ایسا سبب ہوتا کہ میں بھی ساری عمر آرام سے یہاں رہتا اور زمانے سے
سروکار نہ رکھتا مگر کہاں ایسے نصیب کہ ہاتھ آتی یہ دولت عجیب۔ راہ میں مسافر
خانے بنے ہوئے۔ تاکہ کوئی مسافر کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ مچھلی۔ انڈے۔ مرغی۔
شراب سب وہاں موجود۔ اور جو کچھ نہ چاہیئے وہاں سے مفقود۔ عجیب شہر ہے
لڑکوں کنواروں خوبصورتوں کو دیکھا کہ استاد کے سامنے بڑے امتیاز سے بیٹھے
پڑھ رہے ہیں۔ خورد و بزرگ سے حسب مراتب ادب سے پیش آتے ہیں میں
حیران ہوا کہ ہمارے وطن کے لڑکے اس سن میں نشست برخاست کی تمیز
نہیں رکھتے ہیں۔ یہ کیا شے ہیں جو اس صغر سنی باوجود حسن و جمال کے دانائی میں
بڈھوں سے سبقت لے گئے ہیں۔ پریاں کوچہ و بازار میں کھڑیاں دل عاشقوں
کا عوض ایک جھپکی آنکھ کے پھسلاتیاں۔ آدھی راہ میں ایک مسافر خانہ بہت خوب
دیکھا۔ وہاں جا کر ہم سب بیٹھے راہ کی ماندگی سے ستائے۔ ایک صاحب اس سرا کا

مالک تھا۔ بہت اخلاق سے پیش آیا اور اپنی بی بی سے کہا ان کے واسطے شراب[۱]
بیئر اور پنیر اور مچھلی وغیرہ لاؤ۔ بہت ہوشیار اور دانا تھی۔ ایک کشتی چھوٹی میں
سب چیزوں کو خوبی سے جا کر لائی۔ بہت تکلف سے ہر چیز کھلائی اور شراب
پلائی نہایت خوش ہو کر۔ ایک ساعت ہم نے توقف کیا اور کچھ صاحب کو بطریق
انعام کچھ دیا۔ اسی عرصہ میں ایک بھیڑ کا بچہ آیا۔ ہمارے پاؤں پر منہ اپنا رگڑتا اور
زبان سے بدن ہمارا چاٹتا۔ جب تھوڑی شراب بیر کی اس کو پلائی۔ نشے میں آکر
اُس نے آرام پانی کنارے جا بیٹھا۔ معلوم ہوا اسی واسطے منہ رگڑتا تھا۔ ہر مسافر
کو چاہیئے کہ وہاں جا کر شراب بیر پیئے اور کیفیت اس کی معلوم کرے۔

وہاں سے روانہ ہو کر قریب شام کیپ میں پہنچ کر جارج کی سرا میں مقام کیا۔
عجب سرا تھی کہ ہمارے شہر میں مکان بادشاہ کا بھی ایسا عالی شان نہیں ہوتا ہے۔
بلکہ وہاں ایسی عمارت۔ کا دیکھنا خواب میں بھی نہیں میسر آتا ہے۔ جھاڑ فانوس اس کی
چھتوں سے لٹکتے جیسے ستارے آسمان پر چمکتے۔ صحن ایسا وسیع تھا اگر لشکر اس
میں آتا ایک کونے میں سما جاتا۔ ہم لوگ وہاں جا کر دلجمعی سے بیٹھے۔ صحبت اور
جلسے گرم ہوئے۔ لنکن صاحب کپتان پلٹن اٹھائیسویں انگریزی کے رخصت
لے کر وہاں آئے تھے۔ آدمی ان کا ہمارے پاس پیغام لایا۔ اگر اجازت ہو ہم تمہاری
ملاقات کو آویں۔ ہم نے کہلا بھیجا۔ ہم لوگ مشتاق ملازمت ہیں۔ آپ تشریف
لائیں۔ عنایت فرمائیں۔ رات کو کپتان صاحب آئے اور حرف دوستانہ زبان
پر لائے۔ بعد صحبت نمکین اور کلام شیریں کے نوبت شراب کباب کی آئی۔ کپتان صاحب
نے شراب پی کر اور بہت خوش ہو کر خوب نغمہ سرائی کی۔ مجھ سے ٹوپی بدل کر رشتہ
برادری کو مضبوطی دی۔ ہم سبھوں نے رات خوشی سے بسر کی۔ جب تھوڑی رات

۱؎ شراب BEAR

رہی۔ ہم سوئے۔ کپتان صاحب اپنے مقام پر گئے۔ سوا پہر دن چڑھے آنکھ کھلی۔ حاضری کھائی۔ بعد اس کے سب مل کر کیپ کی سیر کو چلے۔ وہاں تین قلعے دیکھے۔ قوم ڈچ کے بنائے ہوئے تھے۔ دو قلعے بسبب بے مرمتی اور گذرنے مدت دراز کے ڈھے گئے۔ مگر ایک ان میں سے بہت مضبوط اور بلند قریب اس کے چھاؤنی گوروں کی قابل دیکھنے کے تھی۔ جاتے جاتے بازار میں پہنچے۔ دیکھا کہ بازار مختصر بہت اچھا تھا۔ دو طرفہ گوشت فربہ دنبے اور گائے کا لگا۔ کنجڑنیاں دونوں طرف بیٹھی ترکاریاں بیچتیں۔ خریداروں کو اشارے آنکھ سے اپنی طرف مائل کرتیں دوسری طرف اور بازار میں جا کر دیکھا کہ حبشنیں بدشکل مچھلیاں بیچ رہی ہیں۔ عجب رنڈیاں چوتڑ ان کے پہاڑ سے موٹے بال پیچیدہ منہ کالے پتلی آنکھ کی۔ ان کی دیکھنے سے زبان قلم کی ان کی سیاہی لکھنے سے کالی ہوئی دیکھ کر ان کو میں ڈرا کہ کیوں ان چڑیلوں میں آپھنسا۔ لاچار وہاں سے بھاگا اور میوزیم میں آیا۔ میوزیم اس مقام کو کہتے ہیں کہ انگریزوں کے عجائبات وہاں رکھے ہیں۔ چنانچہ ہر طرح کے ہتھیار وحشیوں کے اور جنگلی آدمیوں کے رکھے۔ مردہ جانور روغن ملے ہوئے کھڑے عجب روغن تھا کہ اس کے ملنے سے جسم جانوروں مردوں کا نہ سڑا بلکہ مردہ زندہ معلوم ہوتا۔ ایک کھال دو چند کھال ہاتھی سے نظر آئی۔ اس کو دیکھ کر مجھ کو حیرت چھائی۔ حال اس کا وہاں کے اہتمامی سے پوچھا۔ جواب معقول نہ دے سکا ثابت ہوا کہ وہ خود کیفیت اس کی نہ جانتا تھا اور لیاقت اہتمام اس مکان کی نہ رکھتا۔ وہاں سے باہر نکل کر مکان گورنر جنرل صاحب بہادر کا بہت خوش قطع بنا دیکھا۔ چشمہ پہاڑ سے نیچے اس کے بہتا۔ سوا اس چشمہ کے وہاں پانی نہ ملتا۔ اس واسطے کہ اس جزیرہ میں کنواں نہ تھا۔ ہر کوئی پانی اسی کا پیتا۔ نہایت شیریں اور ہاضم

طعام تھا۔ رنڈیاں وہاں کی خوبصورت خوش منظر زیبا، طلعت رنگت میں نہ بہت گوری نہ بہت کالی اس لئے کہ باپ انگریز اور ماں باہر والی ایک قوم ملائی۔ وہاں مسلمان ہیں شراب نہیں پیتے ہیں۔ مزاج میں غصہ بہت رکھتے ہیں۔ عورتیں ان کی پردے کے لئے ایک کپڑا سر پر لپیٹے رہتی ہیں۔ عفیفہ اور پارسا معلوم ہوتی ہیں۔ ملائی جس کے نوکر ہوتے ہیں۔ خوب اطاعت اس کی کرتے ہیں۔ ایک مسجد اپنی عبادت کے لئے بنا کر ایک مؤذن اس میں مقرر کیا ہے ہر چند کوئی ان میں سے علم دین کا نہیں پڑھا ہے پر اپنے طریقہ پر استحکام رکھتے ہیں۔ شادی بیاہ سوا اپنے ہم جنسوں کے کسو سے نہیں کرتے ہیں۔ سوا ان کے قوم حبشی بھی وہاں رہتے ہیں۔ قمار بازی اور شراب نوشی میں پھنس کر کار آقا سے باز رہتے ہیں۔ جب تنخواہ پاتے ہیں۔ امور بے جا میں اڑاتے ہیں۔ ہرگز آدمیت کا نام و نشان نہیں جانتے ہیں۔ راہیں بازار کی صاف نہیں۔ گاڑی اور بگھیاں ایک گھوڑے سے چھ گھوڑے تک کرائے پر ہاتھ آتیں۔ مقابل اس جزیرہ کے سمندر ہے۔ جس کا جی چاہے۔ ناؤ پر سوار ہو کر جہاز اور دریا کی سیر کو جاوے۔ بندہ گھوڑے پر اور صاحب گاڑی پر سوار ہو کر چلے جاتے تھے۔ ناگاہ ایک معشوقہ چودہ برس کی دیکھی۔ ایک دوکان میں بیٹھی۔ پری صورت حور سیرت چاند اس کو دیکھ کر شرمائے، سورج اسی کے فراق میں دن بھر چکر کھائے۔ عجب حسن و جمال بے مثال کہ بیان اس کا امر محال۔ گورے گورے گال۔ ہونٹ لعل لعل۔ دانتوں میں چمک۔ کمر میں لچک۔ شیریں ادا دلربا۔ ابھری اس کی چھاتیاں دل عاشقوں کا پھسلاتیاں

برس پندرہ یا کہ چودہ کا سن
جوانی کا عالم تماشے کے دن[1]

[1] میر حسن کی سحر البیان کا شعر، جو یوں صحیح ہے۔ : برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

میں اس کے دیکھتے ہی بے ہوش ہوگیا اور نشہ بادہ وصال اس کے سے مدہوش ہوا۔ پھر اپنے تئیں سنبھالا اور کنشانیا یعنی انگورستان میں گیا۔ وہاں شراب عمدہ کھینچی جاتی ہے۔ ہر کسی کی طبیعت اس کے دیکھنے کو للچاتی ہے۔ وہاں کے مالک نے بہت اخلاق سے ملاقات کی اور شراب انگوری ہم کو پلائی۔ عجب ذائقہ کی تھی کہ کبھی دل سے نہیں بھولتی۔ ایک شخص قوم ملائی سے میرا نوکر تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تم مذہب مسلمانی رکھتے ہو۔ شراب کیوں پیتے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ حضرت پیغمبر نے شیرۂ انگور کو منع نہیں کیا۔ اس بات سے صاحب خانہ خوش ہو کر ہنسا۔ جس جگہ اپنے معشوق ساتھ شراب پیتا تھا لے گیا۔ عجب جگہ کہ ایک پیپل کے پیڑ درخت پر لکڑیوں کی باڑھ باندھ کر گھاس پھوس کا مکان بنایا تھا۔ نیچے اس کے ہر چہار طرف چشمہ بہتا۔ آب و ہوا وہاں کی دل کو بھائی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر شراب پی۔ لوچر صاحب نے ایک پیپا شراب خرید کی۔ پھر اس سے رخصت ہو کر سرائے جارج میں آئے۔ راہ میں ایک گاڑی دیکھی۔ اٹھارہ بیل سیاہ رنگ اس کو کھینچتے۔ ایک شخص اکیلا اُن سب کو ہانکتا۔ میں اس کو دیکھ کر متحیر ہوا۔ کپتان براؤن صاحب بھی کسی کام کو آئے تھے راہ میں ملے۔ ہم وہ باہم چلے۔ پکصاحب کی سرا میں آکر ٹھہرے۔ وہاں سے ایک گاڑی کرایہ کر کے کپتان صاحب کے ساتھ اس پر سوار ہو کر سیمن بید کو راہی ہوئے۔ راہ میں ایک گاؤں دیکھا۔ وہاں کے لوگوں نے ادیل ٹ پر مدار معاش ٹھہرایا۔ ادیل ایک مچھلی کا نام ہے۔ ہاتھی سے چار چند اس کا اندام ہے۔ وہ لوگ اس کو پکڑتے ہیں۔ ہڈی اور چربی اس کی بیچتے ہیں۔ چنانچہ وہاں کے سب مکان اس کی استخواں سے پٹے تھے بلکہ دروازے اور شہتیر اس کے بنے تھے۔ ایک ہڈی میں نے دیکھی۔ بیس ہاتھ لمبی تھی۔ یہ سیر تماشے دیکھتے سیمن بید میں پہنچے۔

ٹ وہیل مچھلی

تیئسویں تاریخ جون کی جہاز پر سوار ہو کر لندن چلے۔ جابجا پہاڑ دریائی پانی میں چھپے تھے۔ جہاز ان کی ٹکر سے ٹوٹتے۔ اس خیال سے باوصف ناموافقت ہوا اور برسنے مینہ کے کپتان صاحب نے ٹھہرانا جہاز کا مناسب نہ جان کر بڑی استادی سے جہاز ہانکا۔ بسبب رطوبت مینہ اور مخالفت ہوا کے کپتان صاحب کو استسقا ہوگیا۔ گیارھویں تاریخ جولائی کے جہاز ہمارا قریب اس پہاڑ کے پہنچا کہ قبر بونے پاٹ ٹ کی اس پر تھی۔ ہر چہار طرف اس کے سمندر۔ جہاز بسبب مخالفت ہوا کے وہاں رکا۔ مجھے بونے پاٹ کی قبر دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ باوجود ان مواقع کے کپتان صاحب نے جہاز میں لنگر نہ ڈالا آگے بڑھایا اس سبب سے پہاڑ کے اوپر جانے کا اتفاق نہ ہوا مگر جہاز سے صاف نظر آتا۔ جاتے جاتے سترھویں تاریخ اسنشن پہاڑ پر پہنچے۔ تین راتیں برابر عجب حالات دیکھے۔ پانی سمندر کا چمکتا نظر آتا۔ میں حیران تھا کہ اس کا سبب کیا کہ پانی آگ سا چمک رہا ہے۔ طرفہ اس پر یہ ہوا کہ ایک شعلہ جوالہ آدھی رات کو جہاز کے مستول پر اوپر سے گرا۔ کپتان صاحب سے حال چمکنے پانی کا پوچھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ایک قسم کے کیڑے ہیں جب وہ پانی کے اوپر آتے ہیں۔ پانی کا یہ حال ہوتا ہے کہ شعلہ ساں چمکتا ہے۔ میرے یقین کے لئے ایک برتن میں پانی بھرا۔ میں نے دوربین سے بغور اس میں دیکھا ننھے ننھے کیڑے نظر آئے وہی باعث چمک پانی کے تھے۔

یہ حال دیکھتے بھالتے مصیبتوں سے بچتے بچاتے اکتیسویں تاریخ اگست کی ۱۸۲۶ عیسوی کے قریب ولایت انگلستان کے پہنچے۔ ولایت لندن وہاں سے ڈیڑھ سو کوس باقی رہا۔ بندہ شکر خدا کا بجا لایا اور کپتان سے کہہ کر ایک ناؤ سواری کے لئے بلوائی۔ اس میں دو ملاح اور ایک کپتان تھا۔ کشتی تو چھوٹی تھی مگر بہت

ٹ نپولین بوناپارٹ (بادشاہ فرانس)

مضبوط اور خوب بنی۔ باورچی خانہ آہنی اس میں خوش اسلوب۔ نہایت مرغوب
جب وہ ہمارے پاس آئی۔ چالیس روپے کرائے پر ٹھہرائی۔ کپتان صاحب سے
رخصت ہو کر جہاز ازابیلا سے اترے۔ بوچڑ صاحب کے ساتھ اس ناؤ پر سوار ہو
کر چلے۔ آب و ہوا وہاں دل کو بھائی۔ روح کو اس سے تازگی آئی۔ شام کے وقت
ایک گانو[1] میں پہنچ کر سیر کی۔ ایک مکان دیکھا کہ اس میں بہت مرد اور رنڈیاں
جمع ہیں۔ دیکھتے ہی انہوں نے مجھ کو گھیر لیا اور ترک ترک[2] کہہ کر پکارا۔ شراب سیب
کی وہاں بنتی تھی۔ مجھ کو لا کر پلائی۔ تھوڑی سی پی۔ لیمنیڈ سا تاڑی[3] کا پایا۔ کچھ انعام
دیکر رخصت ہوا۔ آگے بڑھا ایک پہاڑ دیکھا۔ لوہے کی کان اس میں تھی۔ خوب
سیر کی۔ پھر ایک چھوٹی ناؤ پر سوار ہو کر دریائے ڈاک منٹ کی سیر کو چلا۔ عجب
دریا تھا کہ دونوں طرف اس کے پہاڑ تھے۔ اس پہ مکان نفیس بنے ہوئے۔ پریاں
ناؤ پر سوار اپنے عاشقوں کے ساتھ شراب پیتیں۔ چڑیاں خوش الحان کنارے پر
بولتیں۔ پھول ہر قسم کے پھولے۔ دیکھنے ان کے سے غم دل بھولے۔ جس کے پاس
روپیہ ہووے وہاں جا کر عیش و نشاط سے بسر کرے۔ اس سے بہتر کوئی
مقام نہیں۔

اگر فردوس بر روئے زمین ست

ہمیں ست و ہمیں ست و ہمیں ست

جدھر آنکھیں اٹھائیں پریاں نظر آئیں۔ افسوس میں بادشاہ ہند کا نہ ہوا۔
نہیں تو ہر ایک پری کو ایک ملک بخش دیتا۔ دنیا مقام عجب ہے کہ مفلس کو کوئی نہیں
پوچھتا ہے ہر شخص روپیہ ڈھونڈتا ہے۔ سیر کرتے ہوئے ایک شہر میں پہنچا۔ وہاں

---

[1] گاؤں [2] اس دور میں غیر ملکی باشندے مسلمانوں کو عموماً "ترک" کہا کرتے تھے۔
[3] تاڑ کا رس جس کے پینے سے نشہ ہوتا ہے (ایک قسم کی شراب)

ناؤ سے اتر کر سرا میں گیا کیا اچھی سرا تھی کہ زبان اس کی توصیف سے عاجز ہوئی۔ ہر
طرف شیشہ آلات اور آئینہ تصویریں لٹکے اوپر کمرے میں کرسیاں اور میز رکھے،
سب کے سب صفائی سے آئینہ کی طرح چمکتے۔ فرش فروش زریں ہر مکان میں
بچھے۔ مالک اس سرا کا ایک انگریز بہت خوب آدمی تھا۔ محبت اور اخلاق سے
اس سرا کی عمارت اور ہر مکان مہربانی کر کے دکھلایا۔ مجھ کو ہرگز یقین نہ ہوتا کہ یہ
سرا ہے بلکہ جانتا یہ شخص ہنسی کرتا ہے۔ پہر رات تک جلسہ گرم رہا۔ بعد اس کے
ہر ایک اپنی جگہ پہ جا کر سویا۔ بندہ بھی ایک مکان میں جا کر بچھونے پر لیٹا۔ ایسا
بچھاؤنا کہ پروں کا بھرا ہوا۔ نرمی اور ملائمت اس کی سے حریر اور قاقم شرماتا۔
بندہ رات بھر اس پر چین سے سویا۔ صبح بیدار ہوا اور گاڑی میل کوچ[1] پر ہمراہ بوچڑ
صاحب کے سوار ہو کر آگے چلا گاڑی چار گھوڑوں کی تھی۔ تین درجے رکھتی۔ خط
ڈاک کے اس میں روانہ ہوتے۔ چار چار کوس کے بعد گھوڑے بدلے جاتے۔ تمام دن
رات میں بیس منٹ اس کو ٹھہراتے ہیں، سب لوگ اتنی دیر میں کھانا کھاتے ہیں۔
ایک سپاہی نگہبانی کے لئے پیچھے رہتا ہے۔ وقت پہنچنے مقام اور روانگی کے
نرئی[2] بجاتا ہے۔ اگر کوئی اس وقت نہ پہنچے گاڑی چل نکلے۔ وہ وہیں پڑا رہے وہاں
کے لوگ گاڑی کے آنے جانے کے وقت جانتے ہیں، سراؤں میں ہر طرح کا
کھانا تیار رکھتے ہیں تاکہ مسافروں کو بیس منٹ کی بھی کھانے پینے میں دیر نہ ہو گاڑی
پر سوار سیر دیکھتا جاتا تھا ہر گاؤں کو آباد آدمیوں کو خوش سلیقہ پایا۔ کنواریاں خوبصورت
اپنے اپنے کھیتوں میں بیٹھیں۔ اناج کاٹتیں۔ باوجود بے مقدوری کے بڑے
بناؤ سنگھار سے تھیں بلکہ بول چال و حسن و جمال میں امیر زادیاں ہندوستان سے بہتر

---

[1] گھوڑوں سے چلنے والا کوچ جو اس دور میں ڈاک لانے جانے کیلئے استعمال ہوتا تھا۔
[2] ایک قسم کی لمبی نفیری

معلوم ہوئیں۔ لڑکے پری زاد جابجا جمع ہو کر عقلمندوں کی طرح بیٹھے باتیں کرتے لڑکپن میں وہ دانائی حاصل کی کہ ہندوستان کے بڈھوں میں بھی نہیں ہوتی۔ کھیت غلوں سے اور میووں سے بھرے ہوئے۔ بالیاں دانوں سے پُر خوشہ پروین سے پرے سرے۔ طراوت ان کی سے قطعۂ جنت شرمندہ۔ دانے ان کے موتیوں سے زیادہ تابندہ۔ دیکھنے اس سرزمین اور کھیتوں، ارم تزئین سے ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ سلطنت ہفت اقلیم کی ہاتھ آئی۔ گائے بکری، بھیڑ اور بیل ایسے موٹے تازے کہ تھوڑی دور چلنے سے تھک جاتے۔ ہوا ایسی فرحت بخش تھی کہ نیند آنے لگی۔ مگر میں نے تماشہ دیکھنے کے واسطے آنکھ نہ بند کی۔ سب طرح سے مجھ کو گاڑی پر آسائش تھی مگر آدھی رات میں ایذا پہنچی۔ اس لئے کوچوان نے ایک عورت بدشکل کو میرے پاس بٹھایا۔ پہاڑ سے موٹی تھی صورت اس کی سے نفرت ہوتی میں نے اپنے تئیں بہت بچایا تو بھی اس کے موٹاپے سے صدمہ پہنچا۔ خدا نے خیر کی کہ وہ آدھی راہ سے اتر گئی۔

جاتے جاتے وہاں پہنچا کہ ایک ستون سنگین بہت اونچا کھڑا تھا۔ ایک ستون پر کئی ستون رکھے۔ ظاہر میں مصالحہ وغیرہ سے نہیں جڑے ہیں اس کو دیکھ کر متعجب ہوا کہ بے جڑائی مصالحہ کے ایک کو دوسرے پر کیونکر قائم کیا ہے۔ یہ حکمت کس سے سیکھی اور کس نے بنایا ہے۔ آخر دریافت ہوا کہ مذہب اور زمانے انگریزوں سے پہلے ایک قوم تھی کہ وہ اس ستون کے نیچے آکر سورج پوجتی آگے بڑھا مکان لارڈ بیرن صاحب کا ایک ٹیلے پر دیکھا۔ خوب مضبوط بنا کسی طرح کا اس میں نقصان نہیں آیا۔ خلاصہ یہ کہ پھر رات گئے لندن کی سڑک پر پہنچا عجب راستہ دیکھا تھپڑ[1] کا بنا بیچ تین جانوروں کی راہ تھی۔ اس میں آدمیوں کے چلنے کی ہرگز نہ

[1] پکی سڑک مراد ہے جو اس دور میں ہندوستانی کے لئے اچنبھا تھی

اجازت شاہ تھی، ادھر ادھر دو طرفہ چار چار یا تین تین گز راہ آدمیوں کی اسی سبب سے اس میں خوب صفائی تھی۔ دو طرفہ شاخوں آہنی پر فانوس اور گیس[1] جلتے۔ چمک اپنی سے ستاروں کو شرماتے۔ دونوں طرف بنے ہوئے مکان نفیس اور بہتر جیسے دو صفیں جنگی کھڑی ہوں جم کر۔ بلندی اور اونچان میں ہر ایک برابر۔ مرد رنڈیوں راہ چلنے والیوں کا کیا بیان، جیسے جنت میں حوروں کے ساتھ ہوں غلمان۔ خوبی شاہراہ اور حسن وجمال کی اور کیفیت آب و ہوا اس شہر کو دیکھ کر جانتا تھا کہ خواب و خیال ہے۔ ورنہ عالم بیداری میں ان امروں کا دیکھنا خیال محال ہے۔

بعد اس سیر و تماشے کے سرائے بل موت میں پہنچا عجب سرا تھی کہ بہشت اس پر رشک لے جاتی۔ سرا نہیں بلکہ قطع گلشن۔ گل شمع و فانوس ہر طرف روشن حال عمارت اس کی کیا لکھوں۔ فقط مضبوطی میں کوہ بے ستون کہوں۔ میں اسے دیکھ کر گھبرایا کہ خدایا خانہ شاہ لندن میں آیا یا راہ بھول کر پرستان میں آنکلا۔ جب وہاں جا کر دیکھا کہ صاحبان انگریز جابجا بیٹھے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ کوئی اپنے یار کے ساتھ شراب پیتا کوئی اچھی آواز سے گاتا۔ کوئی در و دیوار دیکھتا کوئی سیر کتابوں کی کرتا۔ ہر جگہ کرسی اور میز شیشہ آلات رکھے۔ انداز اور سامان وہاں کے سب اچھے مالک سرا سے ہنوز کھانا نہ مانگا تھا کہ جو کچھ دل چاہتا تھا۔ سامنے لایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ دل کا حال جانتا تھا یا فرشتہ اس کو سکھاتا تھا تا رات آرام سے بسر کی۔ فجر کو سرا کی سیر دیکھی۔ ایک رقم ایک ہزار تین سو گھوڑے ولایتی قدم باز زر خرید مالک سرا کے تھے۔ میل کوچ اور گاڑی میں کرائے پر چلتے۔ قیاس کیا چاہیئے۔ جس شہر کے سرا والوں کے پاس اتنے گھوڑے ہوں۔ رئیسوں کا سامان کس قدر

[1] سامان روشنی و آلات آرائش۔ جھاڑ فانوس

ہوگا۔ تیسرے دن شہر کی سیر کو گیا جو کچھ دیکھا دل ہی جانتا تھا۔ زبان پر نہیں آتا کنارے دریا کے جاکر دیکھا سینکڑوں جہاز وہاں تھے اور ہزاروں ناؤ۔ وہاں جہاز دھوئیں کے ادھر ادھر کرتے جاتے۔ اس پر سے صاحبان انگریز اپنی بی بیوں کے ساتھ دریا کا تماشا دیکھتے۔ کیا ہی عورتیں تھیں۔ حسن و جمال میں پریوں کو شرماتیں۔ ایک اندھیرے تہ خانے کی سیر کی۔ صاحب خانہ نے راہ بتائی۔ دو آدمیوں نے ہاتھ میں مشعل لی اس میں پیپے شراب کے رکھے تھے اگر شاید کھلتے شراب کے دریا بہتے۔ جہاز ان میں چلتے ان پیپوں پر الیا روغن ملا تھا کہ ہرگز ان میں آگ کا اثر نہ تھا۔ شراب یہ خواص رکھتی ہے کہ ایک چنگاری سے رال[2] کی طرح بھڑک[1] اٹھتی ہے یہ ان لوگوں کی کاریگری تھی کہ آگ اس میں نہ اثر کرتی تھی۔ دو گھنٹے اس میں روشنی مشعل سے پھرے قریبی اس سرے سے اس سرے تک نہ پہنچے۔ نہ معلوم تہ خانہ کتنا بڑا تھا کہ میں اتنے عرصے میں کنارے نہ پہنچا۔ لاچار ہو کر باہر آیا۔ دوسری طرف جا کر دیکھا۔ تمباکو کا ڈھیر تھا۔ بخدا اس قدر ڈھیر نہ کبھی آنکھوں سے دیکھا نہ کانوں سے سنا جو تمباکو بابت چوری محصول کے چھین آتی تھی۔ ڈھیر کے ڈھیر جل رہے تھے اگر اتنی تمباکو ہندوستان میں جلائی جائے۔ ہندوستانیوں کے دماغ سے ریزش[3] نادانی کی ہو جائے۔

---
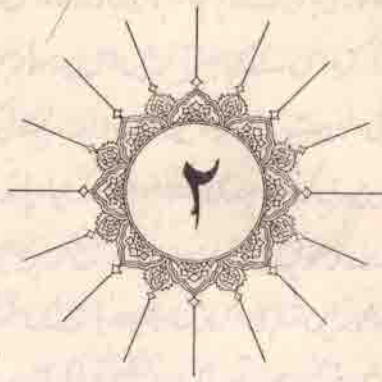
[1] پیپوں ۔ [2] ۔ رال کا ایک گوند کا نام ہے جس پر آگ جلد اثر کرتی ہے۔
[3] لغوی معنے ناک سے پانی بہنا۔ یہاں نادانی کا دور ہونا مراد ہے

لندن

لندن عجب شہر گلستان ہے دانائی کی وہاں کان ہے۔ یہ تماشے دیکھ کر اپنے بل موت میں پھر آیا۔ راجہ صاحب کو ساتھ لے کر مکان کرائے کا تلاش کیا۔ بہت جستجو سے محلہ سمور پلیس لمبر[1] تیسرا قریب سینکرک کلیسا کے ایک مکان سو روپے کرائے پر بھہرایا ایک شخص اور کو شریک کر کے اس میں رہا۔ بعد اس کے دوکانوں اور بازار کی سیر کرنے گیا ایک رستہ[2] میں دیکھا پشت ماہی سا بنا تھا اور دونوں طرف زمین کے برابر لوہا لگا۔ اس لئے کہ پہیئہ گاڑیوں دودی[3] کا اونچا نیچا نہ ہو جاوے اور کنکریوں کا ان میں صدمہ نہ آوے۔ وہاں آٹھ سات گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایک بڑی گاڑی سب سے آگے اس میں تین آدمی بیٹھے کوئلے سلگاتے ہر گاڑی کی زنجیر دوسری گاڑی میں لگی تھی۔ بڑی گاڑی تک زنجیر بندھی یونہی تھی۔ جب سب آدمی ان میں بیٹھ جاتے بڑی گاڑی کے پیچ کو پھیرتے فی الفور وہ تیر کی طرح دھوئیں کے زور سے رواں ہوتی

---

[1] نمبر۔
[2] ریلوے لائن مراد ہے
[3] : دود بمعنی دھواں۔ یہاں بھاپ مراد ہے بھاپ کے انجن سے چلنے والی ریل گاڑی۔

ہر ایک گاڑی زنجیر کے لگاؤ سے اس کے ساتھ چل نکلتی۔ میں نے ایسا کبھی تماشا نہیں دیکھا۔ نہایت مشتاق تھا۔ گاڑی بان سے پوچھا۔ کہاں جاؤ گے۔ اُس نے کہا آٹھ کوس پر میں نے کہا مجھ کو بھی سوار کر۔ اس نے کہا بہتر آخر میں اس پر سوار ہوا۔ اس نے گاڑی کا پیچ موڑا۔ فوراً گاڑی چلی۔ طبیعت بہلی۔ راہ میں ایک دفعہ سر نکال کر دیکھا۔ قریب تھا کہ تیز روی اسکی سے پگڑی میری گرے۔ جلدی سے سر اندر کر لیا۔ پاؤ ساعت میں آٹھ کوس جا پہنچا۔ وہاں سے دھوئیں کی ناؤ پر سوار ہو کر موضع کمرپنچ میں سیر کو گیا۔ شہر دیکھا بہت گلزار اور آباد۔ عمارتیں شاہی اس میں جیسے باغ میں شمشاد۔ گورے جہاز کے جب کار سرکاری میں زخمی ہوتے ہیں۔ انگلس[1] پا کر چین سے زندگی وہاں بسر کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا۔ کھانے نفیس میزوں پر چنے ہیں۔ پیالے شراب بیر کے بھرے رکھے ہیں۔ گورے بڑے مزے سے کھاتے تھے اور خوشی سے بیٹھے تھے۔ میرے دل میں آئی۔ صاحبان انگریز کی دانائی کہ کیا اچھی عقل رکھتے ہیں جب سپاہی کچھ اچھا کام کرتے ہیں۔ ان کو انگلس دیتے ہیں۔ وہ آرام سے بسر کرتے ہیں۔ مالک جب نوکر کے حال پر اتنی مہربانی کرے۔ نوکر کس طرح آقا کے کام میں جان کو جان سمجھے۔ آگے بڑھے ایک اور مکان میں پہنچے کہ وہاں تصویریں جنگی جہاز اور امیروں نامدار فرنگ کی تھیں۔ نشان جنگی لڑائی واٹرلو[2] بطریق تحفہ و یادگاری وہاں رکھا۔ مارے گولیوں کے سوراخ دار تھا۔ اس کے سامنے ایک الماری میں شیشہ تصویر لارڈ ویلس[3] کا اور کرتے خون بھرے ہوئے اس کے رکھے۔ وہ بھی گولیوں

---

[1] : وہ تنخواہ جو بوڑھا یا اپاہج ہونے پر حکومت کی طرف سے ملازمت کے صلے میں ملتی ہے (پنشن)
[2] : واٹرلو کی جنگ (WATERLOO BATTLE) جو ۱۸ جون ۱۸۱۵ء کو انگلستان اور فرانس کے مابین ہوئی۔
[3] : ڈیوک آف ولنگٹن آرتھر ولزلی (ARTHUR WELLESLEY) جنھوں نے واٹرلو کی جنگ میں انگریزی فوج کی کمان کی۔

سے چلنی ہو رہے۔ نمونے جہاز وغیرہ کے اور طرح طرح کی تصویریں رکھیں۔ اس کے مقابل حضرت پالوس اور حواریوں کی تھیں۔ آدمیوں سے ایسی تصویریں بننا ممکن نہیں مگر خدا کی قدرت سے بنیں۔ امریکہ سے ایک رئیس وہاں آیا تھا۔ عوض ان تصویروں کے ڈیڑھ لاکھ روپیہ دیتا ہے۔ مگر انگریزوں نے نہ مانا اور تصویروں کو نہ دیا۔ ایک جا سات ستون سنگِ مرمر کے ایک ڈال تراشے کھڑے تھے۔ نہیں معلوم پتھر کتنے بڑے تھے کہ ان سے اتنے اتنے بڑے ستون ایک ڈال تراشے۔ یہ سیریں دیکھ کر شام کو اپنے مکان میں پھر آیا۔ صبح کے وقت مکان کی سیر کرنے لگا۔ باورچی خانہ میں ایک چھوٹا حوض کہ اس کے اوپر نل پیچدار تھا۔ بندہ وہاں کی راہ و رسم سے محض آشنا تھا۔ باورچی خانہ کو حمام سمجھ کر نہانے لگا اور پیچ نل کا کھول دیا۔ نوکر میرا بدن ملتا۔ تھوڑی دیر میں پانی کمر دل میں بھر گیا۔ تعجب کر کے عورت صاحب خانہ معہ پیش خدمت اپنی کی دوڑی آئی مجھ کو نہاتے دیکھ بہت ہنس کر چلی گئی۔ نوکر میرا اور میں بھی حیران ہوا کہ باعث ہنسی کا کیا ہے۔ شاید یہاں رسم نہانے کی نہیں کہ نہاتے دیکھ کر ہنسیں۔ میں نے نہا دھو کر حاضری منگوائی۔ اس وقت وہ عورت نوکر صاحب خانہ کی پھر آئی۔ فقیر نے اس سے پرسش کی کہ مجھے نہاتے دیکھ کر تو اور تیری بی بی کیوں ہنسی۔ وہ پھر بہت ہنسی۔ میں نے ہٹ کی۔ تب اس نے کہا۔ جہاں تم نہائے باورچی خانہ ہے۔ نہ غسلخانہ ہم کو تمہاری نادانی پر ہنسی آئی کہ تمہیں باورچی خانہ اور غسل خانہ کی نہیں شناسائی۔ یہ سن کر میں شرمندہ ہوا اور کچھ جواب نہ بن آیا۔ اتوار کو سیر کرنے چلا۔ کلیسائے سنٹ پال میں گیا۔ وہ کلیسا ہزار برس کا بنا ہے مگر اب تک ویسا ہی مضبوط اور نیا ہے۔ میں ہندوستان سے اس کے دیکھنے کی آرزو رکھتا تھا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ بہت انگریز اور پادری بندگی[1] کے لئے جمع تھے۔ چونکہ میں

---

[1] عبادت

پگڑی باندھے تھا۔ اندر کے جانے سے رکا مگر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ ان لوگوں کا طرزِ عبادت دیکھا۔ اتنے میں نگہبان اس مکان کا ایک لکڑی ہاتھ میں لئے میرے پاس آیا اور کہا تو مرد اجنبی غیر قوم کا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا بجا ہے۔ وہ بہت مہربانی اور شفقت سے پیش آیا۔ اونچی جگہ میں جہاں بڑے بڑے امیر نامدار بیٹھے تھے۔ مجھ کو لے جا کر بٹھلایا۔ وہاں سے حال عبادت کا خوب دیکھا۔ ایک ارگن تیس ہاتھ کا بجتے تھے اور دھیان طرف خدا کے لگاتے۔ اس کی آواز سننے سے میرے دل میں ہیبت سمائی۔ خدا کی قدرت یاد آئی۔ ایک طرف لڑکے کھڑے ہوئے مرثیہ کی طرح شکریہ خدا کا گاتے۔ داہنی طرف پادری اپنی جگہ پر کھڑے بندگی بجا لاتے۔ انگریزوں کی رائے جہاں آرائے پر صد آفریں کہ مجھ اجنبی بے پہچان کو برابر اپنے بٹھایا۔ ہرگز خیال خلاف مذہبی کا نہ فرمایا۔ مسلمانوں کی مسجد اور ہندوؤں کے بت خانہ میں سوائے اپنی قوم کے دوسرے کو جانے نہیں دیتے ہیں مگر صاحبان انگریز باوصف حکومت اور اقتدار کے خیال اس کا نہیں کرتے ہیں۔ پگڑی باندھ کر جانا نہایت بے ادبی بطریقہ عیسوی ہے میں پگڑی باندھے گیا تھا۔ پر کسو نے نہ کہا تو نے یہ کیا حرکت کی ہے۔ جس قوم میں اتنا علم و صبر ہو وے۔ حق تعالیٰ اسے کیونکر نہ سرفراز کرے۔ پہلے ایک نورانی شکل بڈھے پادری نے آکر نماز پڑھی۔ ضعف و نقاہت اس کی سے صاف آواز میرے کان میں نہ آئی۔ میں سچ کہتا ہوں۔ خدا کو گواہ کرتا ہوں کہ آواز ارگن اور گانے فقرے شکریہ لڑکوں اور نماز پادریوں سے شوق خدا کا ہر دم زیادہ ہوتا۔ دل میں آتا کیا اچھا ہوتا اگر سب گناہوں سے توبہ کر کے یہاں بیٹھ رہتا۔ دل میں ایسا ذوق شوق ہوا کہ خیال میں نہیں آتا۔ کلیسا کے اندر کام سونے کا ایسا کیا ہے کہ عقل دریافت کرنے خوبیوں اس کی سے بے سروپا ہے اگر کوئی برسوں وہاں رہے۔ ہرگز خوبیاں اس کی دریافت نہ کر سکے۔ میناروں پر بھی پانی سونے کا پھرا ہوا۔

فرش زمین کا سنگ مرمر سپید سے بنا ہوا۔ قبریں بادشاہوں، عالیشان اور پادریوں
کی اس میں جا بجا۔ اس کی چھت پر سے تمام شہر لندن نظر آتا۔ میں نے روضہ
تاج بی بی کا دیکھا تھا۔ جب وہاں پہنچ کر اس کی عمارت کو دیکھا سخت حیران
ہوا کہ روضہ تاج بی بی سے اس کو تشبیہ دوں یا اس کو اس سے بہتر کہوں خلاصہ
یہ کہ ایک دوسرے سے بہتر ہے۔ وہ اس سے یہ اس سے خوشتر۔ دن بھر سیر
اس کی دیکھتا رہا۔ رات کو اپنے گھر آیا۔ دوسرے دن کارا سم میں گیا۔ وہ مکان
طلسمات کا تھا۔ نیچے کے درجہ میں تصویریں پتھر کی تراشی ہوئی استادوں کامل کی
ہر طرف رکھیں۔ اس میں ناخن پا سے سر تک پٹھے اور رگیں نظر آتیں۔ جسم آدمی سے
ان میں فرق ایک بال کا نہ تھا۔ بنانے والوں کو تحسین کہ کیا خوب ان کو بنایا۔ اس
کے بعد وہاں کے چوکیدار نے کہا آؤ تم کو ایک مکان دکھلاؤں کہ کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں
اس کے ہمراہ ہوا۔ ایک چھوٹے مکان میں لے گیا کہ اس کے اندر سوا چار آدمیوں کے
جگہ بیٹھنے کی نہ تھی۔ میں نے پوچھا یہ مکان کیا خوبی رکھتا ہے، نہ اس میں وسعت نہ
عمارت اچھی۔ ایک بارگی وہ مکان مانند تخت حضرت سلیمان کے ہوا پہ اڑا اچھٹ
پٹ بہت بلند ہوا۔ اس پہ سے سب آبادی و عمارت مرد رنڈیاں[1] راہ گلی، بازار
جہاز ناویں سمندر کی، پہاڑ، جنگل، لندن کا آسمان ابر نظر آتا۔ میں ہرگز نہیں جانتا
کہ یہ طلسم خیال کا ہے۔ بعد دریافت کرنے کے ثابت ہوا کہ وہ سب طلسم خیالی کا
تھا۔ پھر چوکیدار نے کہا۔ آؤ اس سے ایک اونچا مکان دکھلاؤں۔ میں ششدر
ہوا کہ اس سے زیادہ اونچا کیا ہوگا۔ شاید قریب آسمان لے جاوے گا اس کے
ساتھ چلا۔ اس جگہ لے گیا کہ پہلے سے کچھ کم تھا۔ مگر شہر لندن سب معلوم ہوتا۔ اس

---

[1] معنی عورتیں

کو دیکھ کر اس کے ساتھ پھر نیچے گیا۔ وہاں ایک حوض دیکھا کہ اس سے فوارہ مدوّر
جاری تھا۔ دونوں طرف پھول رنگا رنگ اور سبزہ ہرا۔ آگے بڑھا ایک پہاڑ اور
خندق دیکھا اس کی پاس جا کر تامل کیا۔ اس گڑھے پہاڑ نقلی کو اصلی سے کچھ فرق
نہ پایا۔ جا بجا سے پانی جاری۔ بسبب رطوبت کے اس پہ کائی جم گئی۔ اس کے اندر
گیا سمندر لہریں مارتا ہوا دیکھا اور ایک جہاز طوفان میں تباہ ہوا۔ دوسری طرف پہاڑ
کہ پانی اس سے ایک چشمہ میں آتا اور پانی سے وہ چشمہ لبالب تھا۔ اس میں مرغابیاں
اور جانور اور ایک باز بھی تھا۔ ایک طرف دیکھا میز لگی ہوئی۔ ان میں کھانے عمدہ
چنے ہوئے شرابیں رنگا رنگ شیشہ کے برتنوں میں رکھی ہوئیں۔ پریاں قریب
میز کے بیٹھی ہوئی کھا پی رہیں۔ میں ان کے پاس گیا۔ ایک پری نے پیالہ شراب کا مجھ کو دیا۔
شکر خدا کا کر کے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور دوستوں غائب کو یاد کر کے
پیا۔ کرسی لونے باٹ کے بیٹھنے کی وہاں رکھی تھی۔ یہ سب سیریں دیکھ دوسری سمت
چلا۔ وہاں بھی ایک مکان طلسم کا دیکھا کہ استادوں کامل نے نقشہ گاؤں انگریزوں
کا بنایا ہے۔ ہرگز ثابت نہ ہوتا کہ یہ طلسم خیال کا ہے۔ جا بجا مکان انگریزوں کا بنا ہے،
دھواں آتشدانوں سے نکلتا ہے۔ مزدور اور گدھے راہوں میں چلتے نظر آتے
گھاس اور کھیت اور جانور سب کو دکھائی دیتے۔ ایک مکان میں ایک ایسا شیشہ
بنا کر لگایا ہے کہ باوجود بند ہونے مکان کے سب چیزیں اور صورت آدمیوں باہر
کی دکھیں۔ یہ جو کچھ میں نے دیکھا سب کارخانہ طلسمات کا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر شام کو
مکان پر آیا۔ صبح بیدار ہو کر میوزیم گیا وہ بھی ایک عجب مکان تھا۔ تعریف اس
کی نہ یارائے بیان ہے۔ عمارت اس کی میں لاکھوں روپے صرف ہوئے ہوں گے،
ہر طرح کے تحفے اور عجائبات وہاں رکھے۔ بہت مورتیں مصر کی اور ہتھیار لڑائی
کے جانور دو پائے چوپائے قسم قسم کے رکھے ہیں۔ سب چیزیں نادر ہر ایک جا

سے بہت تلاش سے لائے ہیں۔ حضرت نوحؑ کے طوفان کے ڈوبے ہوئے مرد اور عورتیں وہاں تھیں۔ اکثر لاشیں مردوں اور رنڈیوں کی جو تھے کے نیچے پانی میں وہیں اور مدت تک پڑی رہیں۔ گوشت سارا گل گیا۔ مگر ہڈیاں ان کی پتھروں میں لگی رہیں، اور اسی طرح ڈھلے پنچے گھڑیال اور رستے اور جانوروں کے یعنی فقط ہڈیاں پتھروں میں نگیں وہاں نظر آئیں۔ اسی طوفان میں ایک درخت دو پتھروں کے بیچ دبا تھا انگریزوں نے آرے سے اُسے چیرا۔ آدھا درخت نیچے کے پتھر میں لگا رہا ہے۔ اور آدھا اوپر والے میں جما ہوا ہے۔ میں نے ان امروں کو اپنی آنکھ سے دیکھ کر طوفان نوحؑ کا اعتبار کیا اور دل میں یقین لایا۔ بعد اس کے سر ایک جانور کا دیکھا کہ دگنا ہاتھی کے سر سے تھا۔ اگلے زمانہ میں وہ جانور نکلا۔ اب شاید نہیں پیدا ہوتا اس کو دیکھ کر قدرت خدا کی نظر آئی کہ کیسے کیسے جانور اور صورتیں بنائیں۔ وہ تمام روز اسی سیر میں بسر کیا۔ دوسرے دن سیر کلیسائے منسٹر آبے کو گیا۔ بادشاہی مکانوں کی سیر میں مشغول ہوا۔ در دولت شاہی پر ایک شخص مشکیں گھوڑے دورکابے پر سوار زرہ بکتر پہنے تیار نظر آیا۔ خود میں اس کے ریچھ کے بال لگے تھے۔ قد اس کا جوں سرو سہی۔ موچھیں اس کی کھڑی میں نے بہت سفر کیا پر ویسا سوار کہیں نہیں دیکھا۔ مقابل در دولت کے ایک پائیں باغ تھا کہ باغ ارم اس پہ رشک سے جاتا۔ اس میں حوض پانی کے بھرے ہوئے۔ جانور اس میں تیرتے ملکہ عالم آرا یعنی کوین وکٹوریا اس روز اس مکان میں آئی تھی۔ اس لئے مجھ کو اندر ان مکانوں کے رسائی نہ ہوئی۔ باہر سے خوب تماشا دیکھا اور خوش ہو کر گھر اپنے آیا۔ دل میں کہا ایسی زبان کہاں سے لاؤں کہ خوبیاں یہاں کی بیان کروں۔

گیارھویں تاریخ ستمبر کی رات کے وقت باغ بادشاہی کی سیر کرنے گیا نام اس کا رائل جولاجکل گاڈن[1] تھا۔ وہاں ایک دریا بڑا اس میں کسی جہاز کا لنگر پڑا ہوا کنارے

[1] ROYAL GEOLOGICAL GARDEN

دریا کے شاہ لندن نے پہاڑ بنوایا کہ پہاڑ اصلی سے ذرا فرق نہ رکھتا۔ نیچے اس پہاڑ کے کئی شہر آباد تھے۔ بعینہٖ مانند نقشہ شہر یونان کے معلوم ہوتے ایک مکان میں باجے والے بادشاہی نوکر عجیب و غریب باجے بجاتے۔ سامنے اس کے دوسرے مکان میں گیس اور چراغ اور فانوس بہت روشن تھے۔ اس میں میز لگی ہوئی اور شیشہ کے برتن اور کھانے عمدہ چنے ہوئے۔ شرابیں طرح طرح کی شیشہ کے ظروف میں رکھیں۔ پریاں لندن کی وہ کھانے اور شراب بیچتیں سب کی سب خوبصورت تھیں۔ سوائے اس شہر کے مقابل اُن کا روئے زمین میں نہیں۔ اُن میں سے ایک پری چودہ برس کی سراپا غضب تھی۔ نگاہ اس کی آفت۔ ڈھائی تعریف جمال اس کی محال۔ بالوں اسکے سے عاشقوں کو زندگی وبال۔

زلفیں یوں بکھری ہوئی چہرہ پہ ناگنیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک

میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ وقت آدھی رات کا ہوا۔ اکبارگی پہاڑ سے دھویں اور انگارے نکلنے لگے ہر ساعت زیادہ ہوتے جاتے۔ بعد دو چار گھڑی کے ایک آواز گرجنے کی سی آئی۔ پہاڑ کے نیچے رہنے والوں پر تباہی لائی۔ وہ سب پریشان و تباہ ہوئے۔ نام و نشان کو باقی نہ رہے۔ یہی نقشہ تباہیوں کا ہوا کہ پہاڑ سے گندھک نکل کر آدمیوں پر گری اور ہلاک کیا۔ میں یہ طلسم دیکھ کر اپنے گھر آیا۔ صبح کو راجہ صاحب اور ایک شخص اور کی صلاح سے نقل گھر گیا۔ اس مکان کو انگریزی میں اسلس تھیٹر[1] کہتے ہیں۔ اس مکان میں تین درجے تھے۔ سب سے اوپر کمینے اور کم ظرف بیٹھے تماشا دیکھتے۔ درجہ اوسط میں صاحبان والا شان معہ اپنی بی بیوں کے رونق افزا تھے۔ نیچے کے درجے میں غریب اور مفلس جی بہلاتے۔ مکانات خوب نفیس اور مضبوط بنے تھے۔ ہم ہر آدمی پیچھے دو

[1] تھیٹر

دو روپے دے کر بیچ کے درجے میں بیٹھے۔ نقالوں نے پہلے نقل لڑائی
مظفر شہزادہ قزلباش اور ترکمانوں کی بیان کی۔ ایک چادر اٹھا دی۔ سبھوں کی
نظر میں دریا پہاڑ جنگل آیا اور معلوم ہوا کہ مظفر شاہزادہ بھاگا۔ ترکمانوں نے
اس کا تعاقب کر کے پکڑا۔ ایک گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر چت لٹا کر رسیوں سے
باندھا اور گھوڑا ہانک دیا۔ گھوڑے نے اپنے تئیں دوڑا کر دریا میں ڈالا۔ ایک
باز اوپر سے حملہ کرتا اور ایک بھیڑیا پیچھے اس کے پڑا۔ مگر گھوڑا گرتے پڑتے دریا سے
پار ہوا اور قریب ہلاکت پہنچا۔ اسی عرصہ میں معشوقہ شاہزادہ کی ایک لوٹا تانبے کا
ہاتھ میں لئے ہوئے پہاڑ سے نکلی اور اپنے عاشق کے اچھے ہونے کے لئے
خدا کی درگاہ میں رو رو کر دعا کی۔ شاہزادہ کو گھوڑے کی پیٹھ سے کھول کر سبزے کے
چبوترے پر بٹھلایا اور لوٹے میں پانی لا کر زخموں کو دھو دھا کر صاف کیا۔ بعد دو گھڑی
کے باپ شاہزادے کا آ کر اپنے بیٹے کو نظر عنایت سے دیکھ رہا تھا کہ ترکمان بھی
آ پہنچا۔ ان دونوں شخصوں میں نوبت ڈھال تلوار کی آئی۔ شاہزادہ بھی اٹھ کر
ہوا مستعد جنگ آرائی فی الفور دونوں طرف سے سپاہ آئی۔ آخر فوج قزلباش نے
ترکمانوں پر فتح پائی۔ فوج ترکمانی نے بھاگنے کی راہ لی۔ شاہزادہ بڑے جلوس اور
دھوم سے شادیانے فتح کے بجاتے ہوئے اپنے گھر آیا۔ جب یہاں تک نوبت
نقل پہنچی پردہ[1] گرایا اور پھر اٹھایا۔ اس میں سے ڈکرو نکلا۔ وہ بڑا نقال پوشاک
عربی پہنے ہوئے تھا۔ ایک میدان مدور دو ہاتھ کے نیچے میں آ کر ٹھہرا۔ سامنے اس
کے ایک گھوڑا ابلق اسی میدان میں آیا۔ ڈکرو جدھر اشارہ کرتا گھوڑا ادھر پھرتا۔ اسی
عرصہ میں ڈکرو نے ایک پتھر دو گز کا طول میں اس میدان میں ڈالا۔ گھوڑے نے دونوں
پاؤں اگلے اپنے کو اس پر جمایا۔ تصویر سال بے حس و حرکت ہوا۔ پھر ڈکرو کے اشارے

---

[1] تھیٹر کا پردہ (CURTAIN) مراد ہے

سے پاؤں پتھر سے اتار کر ناچنے لگا۔ بعد کے نو آدمیوں نے حلقے لکڑیوں کے گھوڑے
کے قد برابر لئے اور گھوڑے کے گرد کھڑے ہوئے۔ جب ڈکرو اشارہ کرتا گھوڑا
ہوا کی طرح ہر حلقہ سے نکل جاتا بلکہ ایسی تیز بازی کرتا کہ ہوا کو بھی اس پر رشک آتا۔ بعد ازاں
لوگ نو لکڑیاں بڑی بمفاصلہ جسم گھوڑے کے لے کر کھڑے ہوئے۔ گھوڑا ہر لکڑی سے
اچک کر اس سرے سے اُس سرے پہنچتا۔ اسی طرح ادھر سے ادھر آتا۔ بعد ان حرکتوں
کے تماشائیوں کے سامنے گھٹنا زمین پر ٹیکا اور سر جھکا کر سلام کیا۔ کیا اچھا گھوڑا
تھا۔ مرتبہ شناسی میں آدمی سے زیادہ ہوش رکھتا۔ ڈکرو اس پر سوار ہو کر چلا گیا۔
تھوڑی دیر کے بعد بہت روشنی ہوئی ڈکرو آیا۔ اس کے پیچھے ایک گھوڑا سبزہ
اسی گول میدان میں موجود ہوا۔ ڈکرو اس کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر اسی میدان میں
کاوا دیتا اور نیزہ کو بہت چستی سے ہلاتا کبھی گھوڑے کی پیٹھ پر آتا۔ کبھی گردن پر
جاتا۔ کبھی پاؤں میں چمٹتا۔ کبھی وہاں سے ہٹتا۔ گھوڑا ویسا ہی رواں تھا۔ غرض کہ
ڈکرو نے ایسی چالاکی دکھائی کہ دیکھنے والوں کو حیرت آئی۔ بعد اس کے آٹھ گولیاں
پیتل کی نکالیں۔ گھوڑا دوڑتا جاتا۔ وہ ان گولیوں کو اچھال کر ہاتھ میں روکتا۔
یہاں تک کہ بارہ گولیوں کی نوبت آئی۔ زمین میں ایک بھی نہ گرنے پائی۔ اسی تیز
روی میں ایک رکابی تانبے کی لکڑی کا دستہ لگی ہوئی نکالی۔ گولیاں اچھال کر
اس رکابی میں روکتا اور وہ رکابی کی لکڑی ہاتھ میں پکڑے تھا۔ کبھی گھوڑے کی
پیٹھ پر کھڑا ہو جاتا۔ کبھی دم کے پاس کھڑا ہو کر یہ کمال دکھاتا۔ اسی حال میں چھت سے
ایک رسی لٹکا کر اپنے پاؤں کو اس میں باندھا اور اوندھا لٹک گیا۔ گھوڑا ویسا ہی دوڑتا
تھا۔ ایکبارگی قلابازی کھا کر رسی کو اپنے پاؤں سے کھولا اور گھوڑی پر آ بیٹھا۔ بعد اس
کے ایک پلٹن آئی۔ کپتان اس کا مجنوں کی طرح دبلا اور ناتواں۔ سپاہی سب بے سامان
کسی کے پاس بندوق نہ تھی۔ کسی پاس تھی پر چاپنیٹ[1] سے خالی۔ کسو پاس کیپی[2] بارود کی

---

[1] بندوق کا پرزہ جس کے ذریعہ کندہ اور نال باہم جڑے رہتے ہیں [2] تانبے اور پیتل کا وہ
ظرف جس میں اس دور کے سپاہی بارود رکھتے تھے۔

نہیں۔ کوئی کہیں کوئی کہیں۔ ان سپاہیوں کو دیکھ مجھ کو فوج شاہ اودھ کی یاد آئی۔ اتنے میں خدمتگاروں نے مسخروں کی طرح آکر کرسی اور میز لگایا۔ اس پہ شراب اور کھانا ہر قسم کا چنا۔ کپتان نے کرسی پہ بیٹھ کر شراب پی اور کھانا کھایا۔ سپاہیوں کو اپنے برابر بٹھایا۔ جب خوب نشہ میں چور ہوا۔ سائیس سے گھوڑا منگوا کر سوار ہو بیٹھا اسی میدان مدور میں گھوڑا پھرایا۔ بندوق کی قواعد ایسی کی کہ میں نے کسی انگریز یا ہندوستانی سے نہیں دیکھی۔ اگرچہ کپتان عمر میں دس برس کا نہایت نزار و لاغر تھا مگر ایسے ایسے کمال دکھاتے کہ عقل میں نہ آئے۔ گھوڑے کی تیز روی سے ثابت ہوتا کہ یہ لڑکا اس پر گر پڑے گا۔ مگر گھوڑا بے تحاشا ویسا ہی دوڑتا جاتا۔ نہایت مدہوشی میں کمیش پتلون بدن سے اتارا۔ فقط ایک باریک کپڑا ریشمی کمیس کے نیچے کا پہنے رہا۔ ایک پاؤں اٹھا کر انگلیاں اس کی دانتوں سے کاٹتا۔ سب تماشائیوں نے اس کی تیزی دیکھ کر بہت تعریف کی اور ٹوپی ہر ایک نے سر سے اتاری۔ میں بھی حیران ہوا کہ اس نے کیا کام کیا شاید دیو کا بچہ ہے۔ جو ایسے کام کرتا ہے ورنہ آدمی کو کیا مجال جو دکھلاوے ایسے کرتب اور کمال۔ خلاصہ یہ کہ وہ قواعد کر کے غائب ہوا۔ ڈکرو پھر آیا۔ تین گھوڑے بے زین باگ دار ساتھ لایا اس کے اشارہ سے وہ گھوڑے اسی گول میدان میں گئے اور برابر کاوا پھرنے لگے۔ ڈکرو نے کود کر ایک پاؤں ایک گھوڑے پر رکھا۔ دوسرے گھوڑے پہ دوسرا پاؤں جمایا۔ تیسرے کو درمیان سے کر آپ کھڑا ہو کر خوب دوڑاتا۔ تین گھوڑے اور آئے ان کو بھی آگے کر لیا اور باگ ہاتھ میں لے کر برابر دوڑایا۔ بعد ایک لحظہ کے تین گھوڑے اور موجود ہوئے ان کو بھی ویسا ہی چھ گھوڑوں پہلے کے آگے کر لیا۔ سب کی باگیں پکڑ کر برابر دوڑانے لگا۔ کیا کمال رکھتا تھا کہ نو گھوڑوں کو برابر کم و بیش دوڑاتا۔ یہ تماشے دیکھ کر میں اپنے گھر آیا۔

۱؎ مصنف

جمعرات کے دن اکیسویں تاریخ ستمبر کی۔ بوچڑ صاحب کے مکان پر گیا۔ سیر کو طبیعت چاہی۔ ایک گاڑی بگھی کوچ ٹھہرائی۔ دو گھوڑے اس کو کھینچتے ہیں۔ آٹھ آدمی فراغت سے بیٹھتے ہیں۔ بوچڑ صاحب اور ان کے بھائی ولیم صاحب اور ڈک صاحب اور ہم اس پر سوار ہوئے اور ٹوارف لنڈن[1] پرانے قلعہ میں گئے۔ وہ قلعہ دو تین ہزار برس کا بنا ہے۔ انگریزوں کے مذہب اور زمانے سے پہلے کا ہے۔ عمارت اس کی ہندوستان کے مکانوں کے مانند تھی۔ مضبوطی میں کوہ آہنی سے زیادتی رکھتی۔ وہاں دو لاکھ ہتھیار جنگی تیار۔ جیسے بندوق اور پستول اور تلوار۔ ایسی نفاست سے دیواروں پر رکھے کہ طرح طرح کے پھول معلوم ہوتے۔ صفائی میں آئینہ کے مثل آبدار در و دیوار ان کے سبب سے گلزار۔ ایک توپ اژدہائی[2] باریک کام کی کہ پونے پاٹ کو روم سے ہاتھ آئی ایک طرف رکھی تھی۔ سر جہاز جنگی لارڈ نلسن[3] کا اب تک وہاں رکھا ہے۔ لڑائی میں گولی توپ کی جو اس میں لگی تھی۔ ویسی ہی ان میں جمی تھی۔ کاٹھ[4] کے گھوڑے اگلے زمانہ کے موافق استادوں کے ہاتھ کے بنائے ہوئے ایک طرف کھڑے۔ ان پر پتلے سرداروں کے زرہ پہنے زندہ گھوڑے پر چڑھے معلوم ہوتے۔ اپنی اصل سے ذرا بھی فرق نہ رکھتے تھے۔ ہرگز نہ ثابت ہوتا۔ کہ یہ کاٹھ کے گھوڑے ہیں اور امیروں کے پتلے۔ ایک جانب شبیہ ملکہ وکٹوریا کی گھوڑے پہ سوار تھی۔ تاج جواہر نگار سر پہ رکھے۔ موتیوں کا مالا بیش قیمت گلے میں ڈالے۔ ایک نوکر بھی اس کے پاس کھڑا ہوا۔ میں نے اس شبیہ کو ملکہ اصل جانا۔ شبیہ نہ سمجھا۔ جو کوئی دیکھے بے شبہ اس کو زندہ جانے۔ اس قلعہ میں ہتھیار

۱؎ TOWER OF LONDON ۲؎ کانسی کی بنی ہوئی توپ۔

۳؎ VISCOUNT HORATIO NELSON برطانوی بحریہ کا مشہور کمانڈر اور جنگی ہیرو

۴؎ کاٹھ یعنی لکڑی

لڑائی کے ہر قسم کے موجود ہیں۔ بندوق توڑے دار گرز تیز دھار تلوار اور ہزاروں طرح کے ہتھیار بے حد و شمار ہر نوع کا ہتھیار انگریزی وضع قدیم کا رکھا۔ بسبب گذرنے بہت دنوں کے لوہا پتلا پڑ گیا تھا۔ وہ تبر بھی تھا کہ شاہ لندن کے بیٹے کا سر اُس سے کاٹا گیا۔ جلتہ[1] اور زین شاہ ٹیپو[2] کا بھی یادگاری کے لئے رکھا تھا۔ وہاں کا نگہبان مرد سلیقہ شعار نظر آیا کہ حال وہاں کی ہر چیز کا بخوبی بیان کیا اس کے کرتے پر تمغہ[3] بادشاہی تھا۔ بہت مہربانی سے میرے ساتھ چلا پھرتا۔ ایک مکان میں لے گیا کہ وہاں زیور نقرئی اور طلائی جڑاؤ موتی۔ یاقوت اور ہر جواہر کا تھا۔ اظہار خوبیوں اس مکان کا بیان سے کب امکان ہے۔ وہاں سے پھر کر لچڑ صاحب کے مکان پر کھانا کھایا۔ شام کو سیر کرنے وہاں گیا کہ میز انٹی[4] کھیلنے کی بہت تیاری سے رکھی اور کتنے انگریز شطرنج اور انٹہ بازی میں مشغول تھے۔ حال مفصل اس کا یوں ہے کہ ایک میز کے گرد کتنے لوگ بیٹھے تھے اور ہاتھی دانت کی گولیاں رنگ برنگ کو میز پر ایک لکڑی کو ڈہلکاتے۔ اس میں کچھ حساب رکھا تھا کہ جو اسی سے ہارتے جیتتے۔ میں وہاں جا کر تھوڑی دیر ٹھہرا۔ کھیل ان کا دل کو بھایا۔ ناچار باہر آیا۔ اور ان کی بربادی اوقات پر تاسف کیا کہ کیسے بے عقل لوگ ہیں کہ اپنی اوقات عزیز بے جا کاموں میں برباد دیتے ہیں۔

جمعہ کے دن بائیسویں تاریخ ستمبر کی میں ایک صاحب کے ساتھ بک سال کاڈن[5] کی سیر کرنے گیا۔ یہ نام ایک باغ کا ہے کہ بہت خوب تھا اور رنگینی اپنی سے باغ ارم کو شرمندہ کرتا۔ وہ مقام طلسمات کا تھا کہ کہیں پانی اوپر سے نیچے آتا اور کہیں ویرانہ تھا کہ اس سے وحشت ہوتی طبیعت گھبراتی۔ مکانوں کے اندر میزوں پر شیشہ آلات چنے ہوئے بہت لوگ معہ بی بیوں کے خوشی سے بیٹھے۔ آواز

---

[1] زرہ بکتر [2] ٹیپو سلطان شہید (شاہ میسور) [3] تمغہ [4] بلیئرڈ (ایک کھیل)
[5] گارڈن (باغ)

ارگن کی ہر طرف سے آتی۔ مردہ دلوں کو جوش میں لاتی۔ کہیں صاحب لوگ بلیوں ساتھ ناچتے گاتے۔ غرض سب سامان خوشی کے نظر آتے۔ میں اس باغ کے دیکھنے اور گانے ناچنے اور آواز ارگن کی سننے سے بہت محظوظ ہوا اور دوسری طرف چلا۔ دیکھا کہ ایک غبارہ ہے۔ اس میں بہت ڈوریاں لگیں اور دو سو گوروں نے اپنے ہاتھ میں وہ ڈوریاں پکڑیں۔ اس میں دھویں بھرنے کے لئے گیس جلایا اس لئے کہ بغیر دھوئیں بھرنے کے غبارہ اٹھ نہ سکتا۔ نیچے اس کے ایک ٹکرا تانبے کا لگا ہوا۔ اس پر ایک پلنگ چھوٹا سا بچھا ہوا۔ اس میں بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ نیچے اس کے ایک ناؤ معہ سامان دریائی کے لگی کہ شاید غبارہ اٹھ کر دریا میں گرے۔ ناؤ کے سبب سے ڈوبنے نہ پاوے۔ چار آدمی اس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص ہاتھ میں جھنڈی لئے۔ جب غبارا دھویں سے بھرا۔ صاحب غبارے نے گوروں کو حکم دیا کہ ڈوریوں کو چھوڑ دو۔ چپک کھڑے ہو۔ گوروں نے ڈوریوں کو چھوڑا۔ غبارہ بلند ہونے لگا۔ جب دو چار نیزوں پر آیا۔ اس شخص نے جھنڈی کو ہلایا سب لوگوں نے بہت تعریف کی۔ ٹوپی سر سے اتاری۔ آخر وہ ایسا بلند ہوا کہ انڈے سا سجھائی دیتا۔ پھر نہ ثابت ہوا کہ کہاں گرا۔ جس کا جی چاہے اس کے مالک کو ایک سو تیس روپے دے اور غبارے میں بیٹھ کر آسمان کی سیر کرے۔ یہ کیفیتیں دیکھ کر اس باغ سے دوسرے مکان میں چلا۔ وہاں ایسی بھیڑ تھی کہ اندر جانا مشکل ہوا۔ بڑی محنت سے اس کے اندر گیا۔ ایک میز رکھا ہوا تھا۔ اس پر بارہ پیالہ شیشہ کے چھوٹے اور ایک پیالہ پانی کا بھرا ہوا۔ صاحب مکان نے پردہ اٹھایا۔ اکبارگی ایک رنڈی[1] پری زاد نکلی۔ اس کے دیکھنے سے میری آنکھ میں ٹھنڈک آئی۔ عجب صورت رکھتی کہ چاند کو شرماتی۔ پردہ سے نکل کر اس میز پاس آ بیٹھی اور پانی کے پیالے سے ہاتھ

---

[1] عورت۔

بھگو کر ان بادہ پیالوں کو بجاتی۔ ان سے ایسی آواز نکلتی کہ دل کو بیتاب کرتی۔ اس کے سننے کے لئے سارا بدن کان ہو گیا اور صورت دیکھنے کے لئے ہر عضو آنکھ بنا۔ بلکہ اس آواز کو جنگل میں اگر جانور سنتے۔ بے خود ہو کر مطیع اور فرماں بردار اس کے ہو جاتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ رنڈی ہے یا پری جادو کر رہی ہے تھوڑی دیر بعد وہ پری پردہ میں گئی۔ دوبارہ پردہ اٹھایا۔ اندر مکان کے نظر آیا کہ بت پتھر کے کھڑے ہیں۔ ہر چند اور بھی تماشے وہاں کی تھے۔ پر میرا ہمراہی گھبرایا۔ کہ چلو یہاں سے ناچار اس کے کہنے سے گھر آیا کرامنٹ صاحب مصور نے کلکتہ سے ایک خط اپنی بہنوں کے واسطے لکھ دیا تھا۔ میں تعویذ کی طرح اس کو اپنے ساتھ حفاظت سے رکھتا۔ تیئسویں تاریخ ستمبر کی اس خط کو ان کی بہنوں کے پاس لے گیا۔ دونوں بہنیں ان کی بن بیاہی تھیں۔ میرے ساتھ بہت اخلاق سے پیش آئیں۔ مہمانداری میں مصروف رہیں۔ میں نے شام تک ان کے ساتھ چائے پی اور کھانا کھایا۔ ان کی عنایت، واشفاق کا شکر گزار ہوا۔ کیا خوب شہر لندن ہے لوگ وہاں کے مسافروں پر ایسی عنایت کرتے ہیں کہ باپ بیٹوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ فقیر نے سفر بہت شہروں کے کئے مگر صاحب مروت۔ ایسے کہیں نہ پائے۔ انگریز جو ہندوستان میں آتے ہیں، مزاج بدل جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان سے کچھ نسبت نہیں ؏

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

مقام تاسف ہے کہ ہندوستان کے لوگ اس شہر جنت نشان میں نہیں پہنچتے ہیں تاکہ اپنی آنکھوں سے ان لوگوں کے اخلاق کا حال دیکھتے اور جانتے۔ شام کو میں ان سے رخصت ہو کر مکان پر آیا۔ بوقت رخصت کرامنٹ صاحب کی ماں اور دونوں بہنوں نے کہا، تم پرسوں ضرور آنا اور بی بی لکی سے ملاقات

کرنا۔ میں نے کہا بسر و چشم آؤں گا اور ان سے بہرہ یاب ملازمت ہوں گا۔ بموجب وعدہ پچیسویں تاریخ ان کے مکان پر گیا اور ایک گاڑی کرایہ کر کے ہمراہ دونوں بہنوں کرامنٹ صاحب کے بی بی لکی کے گھر چلا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ کھانا پک رہا ہے اور دو تین بی بیاں اور انگریز بزم آرا۔ بی بی لکی اور سبھوں سے ملاقات ہوئی۔ بہت عنایت ہر ایک نے کی۔ بعد کھانے پینے کے باتیں شروع ہوئیں۔ ایک مصور نے تصویریں اپنے ہاتھ کی دکھائیں۔ نہایت خوب بنی تھیں۔ بعد اس کے بی بی لکی کی بیٹی آئی اور بین ہاتھ میں لائی۔ جب اس کو بجانے لگی۔ قدرت خدا کی نظر آئی کیا آواز تھی اگر دریا پاس بجاتی۔ پانی بہتا رک جاتا۔ اگر صحرا میں وہ آواز پہنچتی۔ جانوروں کو راحت آتی۔ نکیسا[1] اگر اس کو سنتا۔ پردہ میں چھپتا۔ عمر اس کی چودہ برس کی۔ حسن و جمال میں بے مثل تھی۔ میں اس لیلیٰ وش کو دیکھتے ہی مجنوں بن گیا اور ٹکٹکی باندھ کر یہ شعر پڑھنے لگا۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

اگر سلطنت مجھ کو حاصل ہوتا۔ اس کے اوپر سے قربان کر کے غلامی اس کی اختیار کرتا۔ خلاصہ یہ کہ آدھی رات تک اسی کیفیت میں رہا۔ جب اور لوگ رخصت ہونے لگے۔ میں بھی رخصت ہونے۔ میں بھی رخصت ہو کر اپنے مکان پر آیا۔ تمام رات اس ماہ رو کو یاد کر کے ستارے گنتا رہا۔
ستائیسویں تاریخ بدھ کے دن بوچر صاحب کے مکان میں جا کر سیر دریا پر طبیعت

---

[1] مشہور ایرانی گویا۔ استاد ذوق کے اس شعر میں اس کا ذکر ملاحظہ ہو۔
غلغلہ انداز محفل مستاں، وجد میں خیل بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں باربدآسا، چنگ نوازان شکل نکیسا

لہرائی۔ ایک گاڑی کرایہ کی ٹھہرائی۔ بوچڑ صاحب اور ان کے بھائی ولیم صاحب اور رڈک صاحب بخشی فوج بادشاہ کو ساتھ لے کر اس گاڑی پر سوار ہو کر کنارے دریا کے گئے۔ پھر ایک دھوئیں کے جہاز پر سوار ہو کر دریا کی سیر میں مشغول ہوئے۔ جہاز دو دو پہلو بہ پہلو آتے جاتے پر ایک دوسرے سے ٹکر نہ کھاتے یہ استادیاں کپتانوں جہاز کی تھیں۔ میں نے ان کی بہت تعریفیں کیں۔ لندن عجیب شہر ہے۔ جدھر دیکھئے کیا دریا کیا صحرا کیا شہر ہر جا پر پریاں بیٹھی اختلاط کر رہی ہیں۔ دل عاشقوں کا پھسلاتی ہیں۔ جو کوئی زندگی میں بہشت دیکھنا چاہے اپنے تئیں اس شہر میں پہنچاوے اور مزہ زندگی کا پاوے۔ یہ سیر دیکھ کر کنارے دریا کے پھر آئے اور توپخانہ بادشاہی کے پاس کہ اس کا نام "اولیچ" ہے اترے۔ چاہا کہ اندر اس کے جا کر تماشہ دیکھیں۔ دربانوں نے منع کیا کہ بے پروانگی گورنر جرنیل کے مرد اجنبی یہاں جا نہیں سکتا۔ یہ سن کر میں مایوس ہوا مگر رڈک صاحب نے میرے لئے گورنر جرنیل کا حکم پہنچوا دیا۔ تب میں اس کے اندر گیا اور دو صاحبوں اور کو ہمراہ لیا۔ وہ وہاں کا حال بتلاتے اور عجائبات دکھلاتے۔ ایک طرف دیکھا توپ بنانے کی کل تھی۔ لوہا وغیرہ پانی کی طرح پگھلا کر اس میں ڈالتے اور توپیں ڈھالتے۔ وہ اندر سے ٹھوس ہوتیں۔ گولی بارود کی جگہ نہ رکھتیں۔ اس لئے ایک اور کل تھی کہ کولھو کے بیل کی طرح گھوڑے اس میں جتے ہوئے گرد گھومتے۔ توپ کے منہ کو اس کے برابر رکھتے اور بقدر اندازہ کے اندر سے خالی کرتے۔ ایک طرف دوسرا سانچا تھا۔ اس میں لٹھے لکڑی کے ڈالتے اور اوزار جہاز اور چیزوں کے بناتے۔ غرض وہ لوگ ایسی چالاکیاں کرتے کہ دیو اور جنات ان کو دیکھ کر چکراتے۔ ایک جگہ اور نمونے جہاز جنگی اور اشیاء نادر کے رکھے۔ فرمائش شاہ مصر سے چودہ توپیں تو بنی تھیں۔ پانچ پینتالیس بنی بنی تھیں۔ وہ بھی وہاں زمین پر پڑی تھیں۔ سامنے ایک دیوار چوڑی استوار بنی

آزمائش توڑ گولی کے لئے تھی۔ توپوں میں گیارہ گیارہ سیر بارود بھرتے۔ اس دیوار پر نشانہ مارتے۔ وہاں سے ایک اونچے پر گیا۔ نیچے دیکھا بیس ہزار توپیں نظر آئیں چھوٹی بڑی۔ ایک اندی سیہ رنگ لہریں مارتی معلوم ہوتی۔ توپیں قواعد کی اور جو ہر روز بنتیں ان کے سوا تھیں۔ یہاں سے غور کیا چاہیئے۔ جو لوگ ایسے صاحب عقل اور تدبیر ہوں۔ ہمیشہ انہی کاموں میں مصروف رہیں کیونکہ حاکم ہفت اقلیم کے اور عالمگیر نہ ہوں۔ ان سے مقابلہ کرنا گویا جنات سے لڑنا ہے ایک اور مکان میں سب سامان توپخانہ کا تھا۔ زین لگام اور ساز چرمینہ گھوڑوں کا بہ احتیاط رکھا۔ اگر شاید کبھی ضرورت پیش آئے۔ بیس ہزار توپ جنگی معہ گھوڑوں کے دو گھنٹے میں تیار ہوئے۔ برخلاف ہندوستان کے وہاں اسباب بے احتیاطی سے ڈال رکھتے ہیں۔ کیڑے اس کو کھاتے ہیں۔ جب کام لگا کاریگروں کو بلاتے ہیں۔ شور و غل مچاتے ہیں اور حال یہ کہ اس سے کام کچھ نہیں نکلتا۔ فقیر یہ حال دیکھ کر قواعد[1] کے میدان میں گیا۔ وہاں پچاس ہزار سپاہی پیدل قواعد کر رہے تھے۔ عجیب عجیب چالاکیاں کرتے۔ قریب اس کے ایک بڑی توپ پڑی تھی۔ صاحبان انگریز نے قلعہ بھرت پور سے وہاں لے جا کر بطریق تحفہ رکھی۔ ایک اور مکان تھا کہ اس میں ہتھیاروں ہندوستان کا انبار بے پایاں تھا۔ سوا اس کے ہر قسم کے ہتھیار تھے اور نادر تحفے مصر کے کہ بونے پارٹ بعد فتح مصر کے لایا تھا وہاں رکھے۔ معلوم ہوا کہ کوئی بادشاہوں لندن سے شوق ہتھیاروں کا رکھتا تھا۔ اس نے توپخانہ میں یہ سلاح خانہ بنوایا اور ہتھیاروں کو اس میں جمع کیا۔ ایک گاڑی ٹوٹی بھی نظر آئی۔ اس سے مجھ کو حیرت چھائی کہ جہاں ایسے تحفے رکھے اور ہتھیار عمدہ جمع کئے۔ اس ٹوٹی گاڑی کا کیا کام۔ اس کا کیا آغاز و انجام۔ حال اس کا وہاں

---

[1] یعنی پریڈ

کے نگہبان سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ بونے پارٹ کی لاش کو اسی گاڑی پر رکھ کر لائے تھے اور اس ٹاپو میں کہ چاروں طرف اس کے سمندر ہے دفن کرا ہے۔ مجھ کو اس بات کے سننے سے بہت رنج ہوا کہ زندگی چند روزہ کا کیا بھروسہ۔ بونا پارٹ سا بادشاہ جو دس لاکھ فوج ملازم رکھتا اور سب بادشاہوں پر غالب آیا تھا۔ آخر کار کس بے کسی سے لاش اس کی اس گاڑی پر لائے اور ایسے جزیرۂ خراب میں سونپ آئے۔ دنیا ہیچ ست و کار دنیا ہمہ ہیچ۔

یہ ماجرا دیکھ کر وہاں سے پھرا۔ اٹھائیسویں تاریخ ستمبر کی جمعرات کے دن ایک گاڑی کرایہ کر کے اس پر سوار ہوا اور کتاب خانہ شاہ لندن میں گیا۔ وہاں کتابوں عربی فارسی عبرانی یونانی سریانی۔ انگریزی کا ایسا ڈھیر تھا کہ دور سے بجائے خود ایک پہاڑ معلوم ہوتا۔ پاس اس کے ایک اور مکان۔ اس میں تصویر ہر عضو انسان کی موم سے بنی ہوئی۔ عضو اصلی سے فرق ایک بال کا بھی نہ رکھتی۔ ہر ایک رگ پٹھا صاف نظر آتا۔ بسبب برودت ہوا کے اس میں کبھی فساد نہ آتا۔ ایک الماری میں شیشہ کے جسم مردہ کا تھا اس کا بھی رگ پٹھا ظاہر تھا۔ میں نے حال اس کا مکاندار سے پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ عرصہ تین ہزار برس کا ہوا کہ یہ مردہ مصر سے آیا ہے اور اسی طرح رکھا ہے۔ جس کو شوق تحصیل علم ڈاکٹری کا ہوتا ہے۔ یہاں آ کر رگ پٹھے دیکھتا ہے اور پہچانتا ہے وہاں سے پھر کر شام کو بموجب طلب واجر صاحب کے مکان میں جا کر چا پی وہاں پادری مارٹ مراد ودو تین بی بیاں آئی تھیں۔ ان سے مجھ سے باتیں ہوئیں پہلے پادری صاحب نے کہا کہ ہم کو بڑے تعجب کا مقام ہے کہ سو برس سے پادری ہندوستان میں جا کر وعظ و نصیحت کرتے ہیں مگر ہندوستانی لوگ نہیں سمجھتے ہیں اور راہ راست پر نہیں آتے ہیں۔ میں نے جواب دیا وہ لوگ آپ راہ راست پر ہیں اگر پادری کے کہنے پر عمل نہ کریں۔ کیا التعجب کا مقام ہے۔ انہوں نے کہا

کیونکہ سیدھی راہ پر ہیں۔ بت پرستی کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے غافل ہوتے ہیں۔ میں نے کہا جیسے کوئی عاشق معشوق تک نہ پہنچ سکتا ہو اور دیکھنا اس کا منظور رکھتا ہو۔ ناچار وہ تصویر اس کے سامنے رکھتا ہے اور اپنے دل کو اس سے تسلی دیتا ہے اسی طرح ہندو بت کو اپنے سامنے رکھتے ہیں حقیقتاً اس کو خدا نہیں مانتے بلکہ خدا کو وحدہ لاشریک کہتے ہیں انہوں نے یہ سن کر سکوت کیا دوسرا کلام فرمایا کہ یہ ہم نے مانا بیل اور درختوں کے پوجنے کا سبب کیا۔ میں نے کہا جس نے مذہب ہندوؤں کا ایجاد کیا مرد عاقل تھا۔ ہندوستان میں گرمی بہت ہوتی ہے۔ مسافروں کو دھوپ سے ایذا ہوتی ہے۔ راہ میں جہاں کہیں درخت پاتے ہیں۔ اس کے سایہ میں بیٹھتے ہیں۔ اس صورت میں اگر موجد مذہب ان کے درخت پرستی کا حکم نہ کرتا۔ لوگ جڑ سے درخت کو کاٹ ڈالتے اور مسافروں اور جانوروں کو بسبب نہ ہونے سایہ کے بہت رنج پہنچتے۔ مگر قریب المرگ ہوتے باوجود اس تاکید کے اب بھی درخت کٹتے ہیں اور لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر یہ اعتقاد نہ ہوتا خدا جانے کیا حال ہوتا اور کوئی درخت باقی نہ رہتا۔ گاؤ پرستی کا حال بھی یوں ہی ہے اکثر امر ہندوستان کے بیل پر موقوف ہیں جیسے کھیتی اور سینچنا اور گاڑی میں بھی جتیں۔ پس اگر گاؤ پرستی کا حکم نہ ہوتا۔ کوئی بیل زندہ نہ بچتا۔ لوگ ان کو کھا جاتے ان سب باتوں میں ہرج واقع ہوتے۔ غرض یہ سب باتیں مصلحت کے واسطے ہیں وحدانیت خدا میں کچھ دخل نہیں رکھتی ہیں۔ اگر کوئی نادان بیل کو خدا جانتا ہے جادۂ حماقت کا ہے۔ ہر روز کا نہانا برتنوں کا مٹی سے دھونا پکانے کی جگہ چوکا دینا شراب نہ پینا۔ گوشت کا نہ کھانا۔ یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ ہندوستان گرمی کی کان ہے۔ اگر نہ نہائیں۔ وبا اور مرض میں گرفتار ہو جائیں اگر شراب اور گوشت استعمال کریں۔ احتراق خون میں مبتلا ہو کر ہلاکت کو پہنچیں۔ پس یہ سب

امر منفعت کے واسطے ہیں نہ مذہب میں داخل ہیں۔ مگر ہندوؤں کے پیشوا نے
ان باتوں کو از راہِ دانائی اعتقادات میں شامل کیا کہ اس وجہ سے ان سب امروں
کا ضرور ماننا پڑے گا۔ سوا اس کے آپ ملاحظہ فرماویں جو تلنگے[1] یا متصدی[2] ہندو
نوکر شاہ لندن کے ہیں۔ اپنے اوپر کیا کیا مصیبتیں اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ ایک
وقت روٹی کھاتے ہیں اور اپنے ماں باپ کو خرچ بھجواتے ہیں۔ جب آپ رخصت
لے کر گھر جاتے ہیں، ہر طرح سے والدین کی خدمت کرتے ہیں اور اپنی کتاب اور
پوتھی پر چلتے ہیں۔ پس کس طرح راہِ راست سے ہٹے ہیں۔ صاحبان انگریز باوصف
جاننے انجیل اور تحصیل علوم کے کیا عمل کرتے ہیں۔ باوجود امکان اور مقدور کے ماں
باپ سے غافل ہو کر بی بیوں حسینوں کے ساتھ مشغول رہتے ہیں اور ماں باپ
سے مطلق سروکار نہیں رکھتے۔ یہ بات آشکار ہے کہ فرزند پھل زندگانی کا ہے۔
یعنی ماں باپ اس سے بڑھاپے میں چین اٹھاویں اور اس کی جہت سے آرام پاویں
جب ان کو لڑکے سے کچھ فائدہ نہ ہوا مقام افسوس کا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
نے فرمایا کہ جو کوئی تم میں سے عیب آدمیوں کا دیکھے گا۔ خداوند تعالیٰ اس کے گناہوں
پہ نظر کرے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ اے امت کے لوگو! جہاں تک تم سے ہو سکے اپنے
ہم قوموں سے کسی کو بھوکا پیاسا نہ رکھو اور محتاجوں کو اپنے پاس جگہ دے کر کھانا پانی
دو۔ ورگرنہ تم نے مجھ کو بھوکا پیاسا رکھا۔ قیامت کے دن تم پر اس کا عذاب ہوگا اس
زمانے میں عیسائیوں کا حال یوں ہے کہ اپنی قوم کے بھوکے پیاسے کو عیب لگا کر
نکال دیتے ہیں، ہرگز نان و نمک نہیں دیتے ہیں۔ اب تم سے انصاف چاہتا ہوں
کہ ہندوؤں کو اچھا کہوں یا عیسائیوں کو۔ اگرچہ دین عیسائی اور دینوں سے بالذات

---

[1] تلنگا اس سپاہی کو کہتے تھے جسے انگریزی پوشاک پہنائی جاتی ہے کیونکہ ابتداءً انگریزوں نے
مقام تلنگ (مدراس) میں فوج بھرتی کر کے انگریزی لباس پہنایا تھا۔ [2] پیشکار، کلرک

بہتر ہے۔ لاکن[1] کسی عیسائی کا عمل نہیں ہے اس پر پس پہلے اپنے ہم مذہبوں کو
راہِ راست پر لانا چاہیئے بعد ازاں اوروں کو سمجھانا۔ جب یہ لوگ اپنے طریقے پر
قائم ہوئیں اور لوگ بھی ان کا کہنا مانیں اور پادریوں کو سمجھانے سے راہ پر آویں۔ آدمی
جب آپ ہی عمل نہ کرے دوسرے کو کیا سمجھا سکے۔ ویسی ہی مثل ہے جیسے کوئی
آپ شراب پیئے اور بیٹے کو منع کرے۔ بھلا وہ کیونکر مانے گا اور شراب پینے
سے باز آوے گا۔ ایک شخص نے کہ نام اس کا یوسف تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام
سے پوچھا۔ وہ کون کام ہے کہ خداوند تعالیٰ بسبب اس کے مجھ سے راضی رہے۔
فرمایا کہ خدا نے دس حکم جو کئے ہیں، آدمیوں کی بھلائی کے لئے ہیں ان پر ہمیشہ عمل
کیا کر بصدق و یقیں۔ اس سے بہتر کوئی امر نہیں۔ یوسف نے کہا۔ جب سے میں نے
ہوش سنبھالا۔ ان ہی دس حکموں پر عمل کیا۔ آنحضرتؑ نے فرمایا جا سب مال اپنا خدا کی
راہ پر لٹا کر میرے ساتھ آ۔ یوسف نے یہ سنتے ہی سر جھکایا اور کچھ جواب نہ دیا۔

حضرت عیسیٰؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ اونٹ کا نکلنا سوئی کے ناکے
سے آسان ہے اس سے کہ دولت مند خدا کی سلطنت میں داخل ہووے۔ غرض
یہ امر ناامکان ہے۔ ایک روز ایک شخص نے آنحضرت سے پوچھا کہ آپ کے رہنے
کی کونسی جا ہے۔ فرمایا کہ جانوروں درندہ کو بہت جگہ ہے مگر میرے لئے اتنی جگہ
نہیں کہ سر رکھ کر سو رہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کب گھوڑے کی گاڑیوں پر معشوقہ
رعنا کے ساتھ سوار ہو کر بازار کی سیر کرنے جاتے تھے۔ اور کب گرجے میں مخملی فرش
پر نماز پڑھتے تھے۔ کب پر بھرے بچھونوں پر سوتے تھے۔ تم لوگ ہر طرح سے دلجمعی
رکھتے ہو۔ خوشی سے رات سے دن کرتے ہو۔ زبانی دینداری کا دعویٰ۔ دل میں ذرا
بھی خیال نہیں آتا۔ پادریوں کا وہ حال کہ مال میں مشغول ہو کر بی بیوں ساتھ گاڑیوں

---

[1] لکین

پر چڑھ کر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ خدمت گار اُن کی اطاعت میں حاضر رہتے ہیں۔ راہ خدا ایک کوڑی نہیں دیتے ہیں۔ غریبوں پر کم توجہی کرتے۔ بھوکے کو روٹی نہیں دیتے۔ زبانی وعظ و نصیحت کہتے ہیں اور آپ عمل نہیں کرتے۔ بھوکا روٹی روٹی پکارے۔ وہ نصیحتوں پہ اتارے بھلا یہ کہاں کی دینداری ہے ؎

ترک دنیا بمردم آموزند   خویشتن سیم و غلہ اندوزند

حضرت عیسیٰؑ نے کب عیش و نشاط سے زندگی بسر کی اور عبادت خدا کی میں کب کوتاہی کی۔ تم نے خزانہ جمع کئے۔ خدا کی راہ میں روپیہ بھی نہ دیئے زبانی نصیحت کرنا تمہارا لوگوں کو کیا فائدہ بخشے گا۔ میں نے اکثر پادریوں سے ملاقات کی۔ ان کی فربہی اور جسامت سب سے زیادہ دیکھی اگر عبادت اور ریاضت میں رہتے اس قدر موٹے نہ ہوتے۔ حضرت عیسیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ قیامت کے دن سب لوگ امت میری کے مجھ سے ملیں گے اور مجھ کو دیکھیں گے۔ تھوڑے انہیں سے مقبول ہو کر مجھ تک پہنچیں گے اور بہت سے نامقبول ہو کر رہ جائیں گے۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی جنیو پہنے اور بطور برہمنوں اور شاستروں کے عمل نہ کرے۔ برہمن نہیں اور مسلمان فقط ختنے کرنے سے مسلمان نہیں ہوتا ہے۔ جب تک اپنے پیغمبرؐ کے طریقہ پر عبادت نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص پوشاک انگریزی کے پہننے سے عیسائی نہ ہو جب تک حضرت عیسیٰؑ کی راہ پر قائم اور شناسائی نہ ہو۔ یہ مثل ویسی ہے جیسے کوئی کالے کپڑے پہن کر اپنے تئیں سپاہی بنا دے۔ وقت لڑائی کے حال شجاعت اس کی کا کھل جاوے۔ یوں ہی حال پرہیزگار اور ریاکار کا دن قیامت کے ظاہر ہوگا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک میم نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تم نے جواب دہی ہندوؤں کی خوب کی۔ مسلمانوں کی بات باقی رہی۔ میں کچھ ان کے مذہب سے بھی سوال کروں اگر آپ آمادۂ بیان ہوں۔ میں نے کہا بہت اچھا تب انہوں

نے یہ کہا کہ مسلمانوں کے مذہب میں نکاح ایک مرد کا چار بیبیوں سے جائز ہوتا ہے یہ امر خلافِ عقل نظر آتا ہے کہ ایک مرد چار عورتوں کی رفع حاجت کرے اور ہر ایک کی خبر گیری کی طاقت رکھے۔ میں نے جواب دیا کہ ابتدائے ظہور اسلام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان تھوڑے سے لوگ لائے تھے۔ کافر خلاف اپنے جان کر بمقابلہ پیش آتے۔ جو کچھ شہید ہوتے اور بھی تھوڑے رہتے لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بمقتضائے مصلحت چار نکاح جائز رکھے۔ اس سبب سے لڑکے زیادہ پیدا ہوتے۔ امت کی زیادتی ہوتی گئی اور اسلام کی ترقی ہوئی اور یہ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشت سور کا کھانا شراب کا پینا منع کیا۔ بہت بھلا کی میں فائدہ تھا ملک عرب گرم اور آدمی وہاں کے جہل مطلق تھے۔ اگر گوشت سور کا کھاتے اور شراب پیتے نشہ میں آ کر لڑ لڑ مرتے اور ہر طرح کے مرض میں مبتلا ہوتے سوا اس کے سور کا پالنا کچھ محنت نہیں رکھتا ہے بکر اسے چارے اس کے کا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ خود چر چگ کر پیٹ اپنا بھرتا ہے۔ عرب کے لوگ اس کو غنیمت جانتے اور پالتے یاد الٰہی سے باز رہتے۔ بس یہ کیا خوب بات ہے گویا ان کے لیے راہ نجات ہے اور ان کے ہاں پانچ وقت کی نماز اور وضو کا حکم ہے۔ فرمایئے اس میں کیا سقم ہے۔ آگے عرب کے لوگ بسبب جہالت کے بت پرستی کرتے تھے اب نماز پنج وقتہ اور یاد خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ وضو باعث نفاست بدن ہے اور موجب صحت و سلامت تن۔ اور ذبح کرنا جانوروں کا فائدے رکھتا ہے بلکہ تم خوب جانتے ہو کہ زیادہ ہونا خون کا باعث ہے امراض اور جنون کا۔ اس لیے وہ لوگ جانور کو ذبح کر کے خون بہاتے ہیں اور گوشت نہیں اس کا کھاتے ہیں۔ اب فرمایئے کون سی بات اسلام کی قابل حرف گیری جناب ہے جو کوئی اپنے طریقہ پر قائم نہ ہو۔ اس کا کیا حساب ہے۔ جیسے دین عیسائی بہتر ہے

بالذات مگر کوئی نہیں رکھتا ہے اس پر ثبات ۔ پس یہ خطا صاحب دین کی
ہے نہ نفس دین و آئین کی ۔ پھر میں نے پادری صاحب سے کہا ۔ مسلمانوں میں
ختنہ کو نا رواج رکھتا ہے ۔ یہ بھی سبب نفاست کا ہے نہ عیب و کراہیت
کا ۔ آخر پادری صاحب نے پوچھا تمہارا مذہب کیا ہے میں نے کہا بندہ بارہ
برس کے سن سے اسی تحقیقات میں پھرتا ہے اور روز و شب اسی تلاش
میں رہتا مگر کسی کا دین میں ایسا شخص نہ پایا کہ حرص اور طمع دنیا سے علاقہ نہ
رکھتا ہو ۔ بہت روز ان فاضلوں کی صحبت میں کاٹے کہ منبروں پر وعظ و
نصیحت کہتے اور روتے ۔ آخر جو ان کو دیکھا ہوائے نفسانی سے صاف نہ پایا برسوں
برہمنوں اور ہنود فقیروں کی خدمت میں رہا کہ شاید انہی سے ہاتھ لگے راہ راست
کا پتا ۔ بعض فقیروں کو دیکھا کہ درختوں سے پاؤں باندھ کر الٹے لٹکتے ۔ بعض شدت
گرمی میں آگ تاپتے ۔ لیکن جب خوب غور کیا سوائے مکر و فریب کے کچھ نہ پایا
اسی طرح پادریوں پاس اکثر رہا ۔ ان کو بھی بموجب حکم حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے روپیہ کی طلب سے خالی نہ پایا ۔ آخر لاچار ہو کر مذہب سلیمانی اختیار کیا ۔
اس کو سب سے اچھا جانا ۔ وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے فرمایا ہے ۔ بنی اسرائیل
میں مجھ سا بادشاہ کوئی نہیں ہوا حق تعالیٰ نے سب نعمتیں جہاں کی مجھ کو دیں ۔
نہیں طاقت شکر اس کے کی میرے تئیں ۔ اتنی مدت میں میں نے خلاصہ
مطلب یہ سمجھا نیک بخت وہ شخص ہے جو کسب اور وجہ حلال سے معاش پیدا
کرے ۔ اس میں سے کچھ آپ کھاوے ۔ باقی کچھ غریبوں کو دے ۔ بدبخت وہ
ہے کہ گدھے کی طرح بوجھ روپے کا اپنے اوپر اٹھاوے ۔ نہ آپ کھاوے نہ
کسی کو کھلاوے ۔ نہ دن کو آرام پاوے نہ رات کو سووے ۔ یکایک اس کی موت
آوے ۔ جہاں سے لے جاوے ۔ وہ بیکسی سے مرے اوروں کے لئے

مال اپنا چھوڑے ۔ جیسے کتا مرے ۔ نہیں معلوم روح اس کی بہشت یا دوزخ
میں پڑے ۔ اسی طرح بعد مرنے کے روح نہیں ثابت ہوتی ہے کہ کہاں جاتی
ہے اسی قول پر مذہب بندے کا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو برحق جانتا ہے ۔
بدکاری ۔ چوری اور سب گناہوں کو بد سمجھتا ہے ۔ ہر وقت ہر کام کے لئے
مقرر ہوا ۔ سونے کے وقت سونا ۔ کھانے کے وقت کھانا جیسے کہ کسی بزرگ نے
کہا ۔ کُلُّ اُمُوْرٍ مَرْہُوْنٌ بِاَوْقَاتِہَا : بندہ یہ جانتا ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا
کیا ہے آدمی کے واسطے ہے مگر آدمی کو تمیز کھانے کی چاہیئے کہ اعتدال سے
تجاوز نہ کرے ۔ میں نے بے دھڑک مذہب اپنا ظاہر کیا ۔ بھروسا خدا پر رکھا ۔
چاہے کوئی بھلا جانے چاہے برا مانے ۔ مثل راجہ روٹھے نگری راکھے ۔ رام
رُسے کت جاندا ۔ میری ان باتوں سے سبھوں نے سکوت کیا ۔ بعد اس کے رخصت
ہو کر اپنے گھر آیا اور تیئسویں تاریخ ستمبر کی روز ہفتہ کے ڈاپر رام میں گیا ۔
جب اندر جانے کا ارادہ کیا ۔ آنکھوں میں اندھیرا چھایا ۔ اس سبب سے ہاتھ
میرا ایک عورت کے کندھے پر جا پڑا ۔ سخت ندامت زدہ ہوا ۔ ایکبارگی روشنی چمکی
شکل ہیکل حضرت پالوس کی نظر آئی ۔ زمین اس کی سنگ مرمر کی تھی دونوں طرف
کے ستون بھی ایسے ہی قربان گاہ کے مقابل تصویر پوپ کی رکھی ۔ دفعتاً اس ہیکل
میں آگ لگی اور چھت گری ۔ اس میں سے آسمان نظر آتا ۔ فرش زمین جو سنگ مرمر
سے بنا تھا نہ ثابت ہوا کہ کیا ہو گیا ۔ تصویر پوپ کی بھی ٹوٹ گئی مگر قربان گاہ اپنی
حالت اصلی پر رہی ۔ بعد اس کے جس زمین پر بندہ اور دو میمیں انگریز اور بی بیاں
بیٹھی تھیں اپنی جگہ سے ہلی ۔ ایک گاؤں میں جا پہنچی نام اس کا اکنا ۔ بہت
آباد وسیع لطیف تھا گرد اس کے ہر طرف پہاڑ بلند ۔ رات بسبب چاندنی کے
دن سے دہ چند ۔ چراغ اور شمعیں روشن تھیں ایکبارگی پہاڑ سے آوازیں ہیبت ناک

آئیں ربروت کا ایسا طوفان آیا کہ شمع اور چراغوں کا نور دھا تار رہا۔ اندھیرا چھا گیا کلیسا ڈولا
میں گھنٹا بجا کہ یہ وقت ہے قہر و آفت کا سبھوں کو چاہیئے کریں ذکر خدا کا۔
یہاں تک کہ کوئی مکان نہ دکھائی دیتا مگر کنگرہ کلیسا کا نظر آتا۔ بعد عرصہ کے
ثابت ہوا کہ صبح ہوئی آفتاب بدستور مقرر پچھم سے نکلا۔ میں ہرگز دھیان نہ کرتا کہ یہ سب
پہاڑ گاڑی خیال ہے اور شعبدہ لاکن در حقیقت یہ سب طلسمات تھا اور صاحبان
فرنگ کا کمالات۔ مگر مجھ کو ہرگز یقین نہ آیا کہ یہ سب ہی طلسم بنا ہوا۔ بلکہ دو ایک
شخصوں سے تکرار کی اور اس کے طلسم ہونے کی انکار رپ ظاہر ہوا۔ انہی
کا قول سچ تھا۔ یہ طلسم دل کو بہت بھایا۔ یہ ہیکل بعینہٖ نقشہ اس ہیکل کا تھا کہ کنستان تینیا کے
کے بادشاہ نے روم کی پچھم طرف آدھ کوس فاصلے پر بنوائی تھی۔ عرض اس کا ایک سو
اڑتالیس فٹ اور دو سو فٹ کی لنبائی؎۔ گھیر مرمر کے ستونوں اس کے کا گیارہ فٹ آٹھ
انگل۔ فرش زمین اس کی کا مرمر سے بالکل ایک قربان گاہ اسی میں بنی۔ مقابل اس کے
تصویر پوپ اور ایک عورت کی کھڑی۔ جب وہ ہیکل قریب تیاری کے پہنچی۔ سن
اٹھارہ سو تئیس عیسوی میں سولہویں تاریخ جولائی کے اس کی چھت میں آگ لگی،
یہاں تک کہ جل کر گر رہی۔ ہر ایک ستون ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ فرش سنگ مرمر کا بھی جل
کر گم ہو گیا۔ تصویر پوپ اور اس عورت کی بھی ٹوٹ گئی۔ مگر قربان گاہ بدستور رہی۔
یہاں کی ہیکل طلسمی جو میں نے دیکھی۔ وہیں کی نقل تھی پر اصل معلوم ہوتی۔ پہلی تاریخ
اکتوبر ۱۸۳۷ء کے بندہ ناچ گھر گیا۔ اس کا نام رائل سری ٹیاٹر؎ تھا۔ کئی شعبدہ باز عرب
سے وہاں آئے تھے اپنے اپنے کمال دکھلائے۔ ایک نے ان میں سے نو آدمیوں
ہمراہیوں اپنے کو برابر کھڑا کر کے ننگی تلواریں ہاتھ میں دیں۔ انہوں نے بموجب اس
کے کہنے کے ہاتھ اٹھا کر تلواریں علم کیں۔ وہ شخص پھلانگ؎ مار کر ان تلواروں کے

؎ لمبائی۔ ؎ تھیٹر۔ ؎ پھلانگ۔

اوپر سے کود جاتا۔ ایک طرف ایک موٹا کپڑا بچھا تھا۔ اُڑ کر کبوتر کی طرح اس پر
جا بیٹھا۔ بعد اس کے ایک لکڑی کھڑی کی۔ اس کے اوپر ایک تھالی جمائی۔ اس
میں ہاتھی دانت کے مہرے رکھے۔ ہر ایک قلابازی کھا کر اچھل کر اس تھالی سے
مہرہ ہاتھ سے اٹھاتے۔ ان کی چالاکیاں دیکھ کر ہم حیران ہوتے۔ اس سلیقے کے
کرتب والے دکھن اور مچھلی بندر میں بھی نہ دیکھے تھے۔

دوسری تاریخ اکتوبر کی پاڑلی صاحب نے دعوت کر کے اپنے گھر بلایا۔ میں
وہاں جا کر بہت خوش ہوا۔ دونوں بہنیں کران صاحب کی اور اور بیبیاں اس مجلس میں
بیٹھی شراب پیتیں۔ ایک مرد ضعیف بھی بیٹھا تھا۔ ذکر علم ریاضی اور گردش فلکی کا درمیان
لایا۔ میں نے لطائف الحیل؎ سے اس کو ان قصوں سے روکا۔ پر وہ اس ذکر سے باز نہ آیا۔
لاچار ہو کر صاف صاف کہا کہ میں فن تحصیل معاش کا جو ہر آدمی کو ناگزیر ہے نہیں
رکھتا ہوں۔ علم نجوم اور ستاروں کا کہاں سے لاؤں۔ یہ کہہ کر اس کی طرف سے منہ پھیرا
پریوں کے ساتھ شراب پینے لگا۔ مجلس رقص و سماع کی گرمی رکھتی۔ رات بہت کیفیت
سے کٹی۔ صبح کو اس بڈھے کو دیکھا کرسی پر بے خبر سوتا۔ کسو نے کہا یہ سوتا ہے۔ میں
نے کہا نہیں۔ خیال ستاروں میں ڈوبا ہے۔ جگانا ضرورت نہیں رکھتا ہے۔
تیسری تاریخ وہاں سے اپنے گھر آیا۔ تنہا ملول بیٹھا تھا۔ چھوٹے بھائی لوچرٹ
صاحب کے آئے۔ کلام خاطر داری کے زبان پر لائے کہ اے یوسف خان تو
کیوں آزردہ ہے۔ میرے ساتھ سیر کو آ۔ میں بپاس خاطر ان کے ساتھ چلا۔ اس
مکان میں لے گئے کہ عجائبات خطۂ یونان کے وہاں تھے۔ انگریزوں نے ان چیزوں
کو گڈھوں اور تہ زمین سے پایا۔ اس مکان میں تماشے کے لئے رکھا۔ سوائے اور
عجائبات کے ایک صندوق پتھر کا وہاں نظر آیا۔ اس کے اندر ایک کھوپڑی کا غبد

؎ لغوی معنے حیلوں کی خوبیاں اصطلاحاً انتہائی خوبصورتی سے کسی کو ٹالنا یعنی ایسے بہانے سے ٹالنا کہ دوسرے کو ناگوار نہ گزرے

کی طرح صاف تھی، گرد اس کے حمائل زریں لپٹی، جس کی وہ کھوپڑی تھی۔ اس کی تلوار بھی اس صندوق میں رکھی۔ چھلنی کے مانند مشبک[1] ہوئی۔ بسبب اس کے کہ مدت تین ہزار برس اس پر گزری۔ گرد صندوق کے خط یونانی زبان قدیمی میں حال اور نام اس نامدار کا لکھا تھا۔ مگر مجھ سے بسبب ناآشنائی اس زبان کے پڑھا نہ گیا۔ اس کے ہاتھ لگنے کی یہ صورت ہے کہ ایک دفعہ انگریزوں نے زمین یونان کھدوائی۔ تہ زمین میں صورت اس صندوق کی نظر آئی۔ بہت شوق سے اس کو نکالا اور یہاں لا کر رکھا۔ بندہ صاحبان لندن کے اخلاق کا حال بیان نہیں کر سکتا ہے۔ ایک دوسرے پر سبقت رکھتا ہے۔ میرے مکان پر آ کر تسلی دیتے اور باوجود اجنبیت کے اپنا ہمراز مجھ کو کرتے حال وہاں کا دیکھ کر ہم اپنے گھر آئے۔ شام کو بوچیر صاحب کے بھائی میرے پاس آ کر اپنے ساتھ سیر کو لے چلے۔ راہ میں دو پریاں نظر آئیں۔ دوکان پر بیٹھی قہوہ پلاتیں۔ ایک نگاہ سے دل تماشائیوں کا پھسلاتیں۔ میں نے اپنے ساتھی سے کہا قہوہ پیو۔ اس نے جواب دیا پھرتی دفعہ پی لینا۔ میں نے کہا زندگی کا کیا اعتبار۔ پھر آنے کا کیا قرار۔ اگر اتنی دیر میں چراغ زندگی بجھے یہ آرزو دل ہی میں رہے۔ یہ شہر میرے نزدیک جنت المعادی ہے اگر بخوبی نہ دیکھا اور آدمیوں کو نہ پہچانا کیا فائدہ۔ آخر وہ راضی ہوئے۔ وہ دوکان پر ٹھہرے۔ قہوہ نوشی کے حیلہ سے ان کے نظارے کئے۔ بعد اس کے اپنے گھر پھرے۔

آٹھویں تاریخ اکتوبر کی کپتان لاڈ صاحب کے ساتھ موضع ٹیرس ہل میں گیا وہ گورستان ہے انگریزوں کا۔ لندن سے بہت فاصلہ رکھتا۔ سبب دور گاڑنے مُردوں کا یہ تھا کہ مبادا روم یا مصر کی طرح بسبب مردوں کے متعفن ہو ہوا مصر اور روم میں وبا اکثر آتی ہے۔ باعث اس کا یہی ہے کہ عین شہر میں بہت تکیے ہیں۔ مردے وہیں دفن کئے ہیں۔ موضع ٹیرس ہل بلندی پر واقع ہوا ہے

---

[1] : سوراخ دار

وہاں سے تمام لندن نظر آتا ہے۔ ایک کلیسا بھی اس میں خوب بنا ہے۔ اس مقام کو بنظر غربت دیکھا۔ پھر کپتان صاحب کے مکان پر آ کر کھانا کھایا اور عرض کیا مدت سے آرزو رکھتا ہوں کہ ہیکل یہودیوں کو دیکھوں۔ کپتان صاحب نے لی بیس یہودی جوہری کے مکان پر لے جا کر مجھے ملاقات کروائی۔ اس نے بہت اخلاق اور محبت سے ملاقات کی اور مہربانی فرمائی۔ مجھ سے اس سے دیر تک ہر مقدمہ میں خاص مذہب کے باب میں گفتگو رہی آخر اس نے خوش ہو کر یہ بات کہی کہ کل ہماری عید کا دن ہے۔ اگر تم آؤ اپنے ساتھ ہیکل میں لے چلوں لطف وہاں کا تمہیں دکھاؤں۔ میں دوسرے دن بموجب وعدہ اس کے مکان پر آیا وہ مجھ کو اپنے ساتھ ہیکل میں لے گیا۔ عمارت اس کی عالی تھی ظروف پرستش کے طلائی سامنے اس کے ایک قربان گاہ بنی۔ مگر کلیسائے انگریزوں کی سی اس میں نفاست نہ تھی۔ بہت یہودی اپنے طریقہ پر نماز پڑھتے۔ مگر دل سے ہرگز متوجہ نہ تھے۔ ظاہر میں عبادت تھی۔ باطن میں شرارت۔ کاہن یعنی پیشوا ان کے قریب منبر کے بیٹھے بھول کی طرح بے دلی سے نماز پڑھتے۔ ایک طرز ان کی مجھے پسند آئی۔ وہ امر یہ تھا کہ عورتیں یہودیوں کی اوپر کے درجہ میں تھیں۔ وہاں مردوں سے کوئی نہیں۔ انگریزوں کے کلیساؤں میں یہ بات نہیں پاتا ہوں کہ رنڈیاں مردوں سے جدا ہوں۔ ان کا عبادت خانہ دیکھ کر دل میں آیا کہ اگر قابو پاؤں۔ ان کی رنڈیوں کو اچھے باغ میں رکھوں۔ مردوں کو گھوڑوں اور کتوں کی خدمت پر مقرر کر کے شکار گاہ میں دوڑاؤں۔ مگر انتظام اور عمل انگریزوں کا ایسا ہے کہ ہاتھی چیونٹی سے ڈرتا ہے۔ لاچار رخصت ہو کر گھر آیا۔ بعد چند روز کے لی بیس نے مجھ کو ایک رقعہ لکھا کہ کل ہماری عید ہے اگر تم آؤ عنایت سے نہیں بعید ہے میں دوسرے دن بموجب طلب گیا۔ دربانوں نے اندر جانے نہ دیا کہ اس وقت

---

[2] زمرہ یعنی گروہ (یہاں مراد ہے کہ اپنے قریب اچھی جگہ پر بٹھایا)

کوئی آدمی سوا ہنود یوں کے نہیں جا سکتا ہے۔ تمہارا آنا کہاں سے ہوتا ہے۔ آخر جب لی بین کو خبر ہوئی اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اپنے زمرے میں اچھی جگہ مجھ کو بٹھایا۔ وہ سب میرے جانے سے حیران ہوئے۔ سبھوں کے چہروں پر آثار ملال نمایاں ہوئے کہ اس وقت مرد اجنبی غیر قوم کا اپنے ہاں لانا راہ دانائی سے بعید ہے۔ لی بین نے کہا اپنی جماعت سے کہ اس شخص سے پوچھو۔ مذہب تمہارا کیا۔ ایک شخص جوان سبھوں میں ممتاز تھا میری طرف متوجہ ہو کر حال مذہب کا پوچھنے لگا۔ میں نے ایسا جواب دیا کہ بہت راضی ہوا۔ آخر اس نے مجھ سے یہ کہا کہ ہم کو تعصب نہیں مذہب کا۔ اگر بنظر انصاف دیکھئے اور دل میں غور کیجئے۔ مآل سب مذہبوں کا ایک ہے۔ بعد اس کے میں حال ان لوگوں کا دیکھتا رہا۔ انہوں نے ایک مکان گنبد دار پھولوں کا بنایا۔ اس کے اندر دو تین کاہنوں کو بٹھلا کر کھانا کھلایا۔ وہ لوگ اپنے کاہنوں کی تعظیم بادشاہ کے مانند کرتے ہیں۔ بجا آوری احکام ان کے میں مستعد رہتے ہیں۔ بادشاہ انگلستان کا بھی ان کی عزت کرتا ہے اور معزز رکھتا ہے۔ میں یہ حال دیکھ کر اپنے گھر آیا اور یہ سنا کہ نویں تاریخ نومبر کے جمعرات کے دن جلوس کوئین وکٹوریہ[1] کا گلڈ ہال میں ہوگا۔ یعنی اجلاس تخت سلطنت ابتدا اسی دن ہوا تھا۔ اس روز کے جلوس دیکھنے کو لوگ منزلوں سے آکر جمع ہوتے ہیں۔ ٹڈیوں کی طرح ہر طرف کے رئیس امیر دیکھنے آتے ہیں۔ اس روز گلڈ ہال کے نزدیک مکان کرایہ کا نہیں میسر آتا۔ مجھ کو اس جلوس کے دیکھنے کا شوق غالب ہوا۔ چند روز پیشتر سے ایک مکان قہوہ خانے کے بائیں طرف قریب گلڈ ہال کے ایک دن کے لئے ایک اشرفی کرایہ کا ٹھہرایا۔ جس روز جلوس ہوا۔ صبح ہی اٹھ کر اس مکان میں چلا۔ راہ میں ایسا ہجوم تماشائیوں کا تھا کہ اس مکان تک پہنچنا دشوار ہو۔ ہزار دقت جا پہنچا۔ بعض شخصوں کو دیکھا کہ مکان کرایہ کا ڈھونڈتے۔ دو سو روپیہ

[1] ملکہ برطانیہ

ایک دن کا کرایہ دیتے۔ مگر نہ ہاتھ لگتا۔ ایسا آدمیوں کا انبوہ تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں اس مکان میں بیٹھا سواری آنے کی راہ دیکھتا۔ دن قریب ڈیڑھ پہر کے آیا۔ ترشح مینہ کا شروع ہوا۔ اس سبب سے جلوس ہمراہی شاہزادی میں کمی تھی۔ دوپہر پر دو بجے سواری آئی۔ وقت سوار ہونے شاہزادی کے گھنٹے کلیساؤں میں بجنے لگے۔ لوگوں کو اس امر خیر سے خوش خبری دینے لگے۔ سب سے پہلے سردار اور منصب دار گھوڑوں پر سوار گلڈ ہال میں داخل ہوئے۔ بعد ان کے ارکان دولت اعیان سلطنت چار چھ گھوڑے کی گاڑیوں پر سواروں کے شامل ہوئے۔ گھوڑے گاڑیوں کے اصیل ولایتی قدم باز راہوار۔ سب ساز اُن کا جڑاؤ نہایت آبدار۔ نوکر پوشاک زربنہ و زربفت پہنے ایک دوسرے سے زیادہ بنے چنے۔ پھر سواری وزیر اعظم لارڈ میلبرن کی آئی۔ بعد اس کے گاڑی ملکہ جم جاہ کی نمود ہوئی۔ گاڑی بھری جواہر جڑے۔ آٹھ گھوڑے سمند اس میں لگے۔ صورت و سیرت میں سب برابر تھے۔ ایک ذرا آپس میں فرق نہ رکھتے۔ اگر ایک چھپایا جاتا۔ دوسرا سامنے آتا۔ دھوکا اسی کا اس پہ ہوتا اور ہرگز فرق نہ ثابت ہو سکتا۔ ویسے گھوڑوں کی صورت دیکھنا مجھ کو پھر نہ نصیب ہوئی۔ بھوک پیاس ان کے دیکھنے سے بھولی۔ اصیل اور قدم بازی میں طاق۔ خوبی میں ہر ایک یکتائے آفاق۔ جب وہ گاڑی آگا[2] بڑھی میرے قریب آئی۔ دو تصویریں رومیوں کی قد آدم اس میں کھڑی تھیں۔ میں سمجھا دو رومی زندہ ہیں۔ تصویریں نہیں۔ جب خوب غور سے دیکھا۔ شبہ مٹا۔ ملکہ ہر ہما کوئین وکٹوریہ مع اپنی والدہ ماجدہ کے اس پر سوار تھیں۔ چاند صورت سورج طلعت دکھائی دیتیں۔ تخمیناً عمر میں اٹھارہ برس کی مجمع شرم و جمال و عفت بے شمار تھیں۔ میں نے صورت دیکھتے ہی دل میں دعا کی یا اللہ گاڑی ملکہ کی میرے پاس پہنچ کر ایک لحظہ ٹھہرے۔ خدا نے سن لی۔ جب گاڑی میرے سامنے آئی

[2] آگے

ایک ساعت رکی۔ چہرہ نورانی ملکہ کا میں نے بغور دیکھا۔ نمونہ قدرت ایزدی کا پایا۔ آداب تسلیمات بجالایا۔ نگاہ عنایت سے میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔ ان کی مالی بھی دیکھا میں خوشی سے پھولوں نہ سمایا اور دل میں دعائیں دیتا رہا کہ یا اللہ اس کی سلطنت کو کبھی زوال نہ ہوئے۔ ہمیشہ زیادتی اور کمال ہوتا رہے۔ غرض قدوم میمنت لزوم سے گلڈ ہال رشک گلزار ہوا۔ اور وہ میدان کثرت فوج وسپاہ وردی پوشش سے رشک لالہ زار۔ ایک رسالہ سواروں مشکی گھوڑوں کا نمدہ اور خود پہنے نظر آیا۔ ہر ایک کی موچھیں کھڑی کمال ہیبت اور شان رہے ٹوپیاں[1] باندھے قدم بہ قدم برابر جاتا ——— تماشائیوں کو ان سے ہرگز صدمہ نہ پہنچا۔ سوا ان کے بہت تزک سے اور فوج مسلح تھی۔ دیکھنے سے اس کے بہت ہیبت آتی۔ القصہ فوج بادشاہی اور تماشائیوں کا ایسا اژدحام تھا کہ بیان میں نہیں سماتا۔ سننے میں آیا۔ کہ اس جلوس میمنت مانوس میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ فقیر نے تیسرے پہر کا کھانا وہیں کھایا۔ شام کو اپنے گھر آیا۔ اثنائے راہ میں چراغ فانوس روشن تھے۔ چاند سورج ستارے روشنی کے ایسے بنے کہ چمک دمک میں مہر و ماہ و ستاروں سے دوگنے۔ دوکانوں پہ دوشالے رومال سرخ سرخ کارکشمیر کے رکھے اور ہر طرح کی چیزیں اسباب عجیب و غریب وہاں تھے۔ نہیں معلوم بایں افراط کہاں سے ہاتھ آئے۔ ہر پری زاد فرنگ کے خوشی سے راہ میں آتے جاتے۔ ہر ادا سے اعجاز مسیحائی دکھاتے۔ مرد رنڈیاں پہلو بہ پہلو خوش رفتار۔ جیسے جنت میں حور و غلمان نمودار۔ دوکان نان بائیوں کی نعمتوں سے بھری۔ فریفتہ ہوا جس کی نظر اس پر پڑی۔ لوگوں کی بول چال و دیدار حسن و جمال مجھ کو خواب خیال معلوم ہوتا ورنہ بیداری میں ایسی کیفیت دیکھنا محال تھا۔ فی الواقعی جو دیکھا خیال

---

[1] پھولا نہ سمانا ۔ ۲ صفیں

ہی تھا کہ اب اس کا دیکھنا میسر نہیں آتا۔ بلکہ جس سے وہ حال کہتا ہوں اعتبار نہیں کرتا اگر اپنی آنکھوں سے دیکھے تو مانے۔ اسی طرح سب کام دنیا کے خیال ہیں۔ لذات اس کی سریع الانتقال کوئی کیفیت اس کی قرار پہ نہیں رہتی۔ کوئی لذت اعتبار نہیں رکھتی۔ عاقل کو چاہیئے۔ کام آج کا کل پہ نہ ڈالے شاید کل کوئی اور سانحہ پیش آئے۔

که داند که فردا چه خواهد رسید
ز دیده که خواهد شدن ناپدید

رباعی:

دنیا خوابیست کش عدم تعبیر ست
صید اجل ست چه جوان و چه پیر ست
هم روی زمین پر ست و هم زیر زمین
ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر ست

گیارہویں تاریخ نومبر کے الود لوچپڑ صاحب میرے مکان پر آئے اپنے ساتھ گلڈ ہال کا تماشا دکھانے لے گئے ——— جہاں جلوس شاہی ہوا تھا۔ کوئی اس کے اندر بے ٹکٹ جانے نہ پاتا۔ مگر جو چٹھی رکھتا ہوتا۔ البتہ جا سکتا۔ اس لئے انہوں نے اپنے باپ سے ٹکٹ لے لیا تھا۔ اس ذریعہ سے میں بھی گلڈ ہال کے اندر گیا۔ وہاں کا خوب تماشا دیکھا۔ برابر میز لگی ہوئی تھی۔ ان پر ظروف نقرہ و طلائی رکھے۔ سب سے آگے میز بادشاہی لگا۔ اس کا عجب ٹھاٹھ تھا۔ دستر خوان زربفت کا مقیشی جھالر لگا ہوا اس پر بچھا۔ بہت برتن سونے چاندی کے برابر چنے۔ جھاڑ شیشہ و بلور کے چھت اور دیوار پہ لٹکے۔ برابر اس میز کے ایک کرسی زرنگار مقابل اس کے چھت سے لٹکا ایک چتر طلائی بشکل تاج شہریار۔ وہ کرسی اور میز خاص مقام اجلاس شاہزادی کا تھا۔ عمدہ اسباب بادشاہی وہاں رکھا۔ تصویریں امیران نامدار کی دیوار میں لگیں۔ ان سب

نادر چیزوں کے دیکھنے میں مصروف تھے سارے تماشبین۔ میں نے دیر تک تماشا دیکھا
پھر بھی وہاں سے نکلنے کو جی نہ چاہتا۔ بلا چار ہی مکان پہ آیا۔ انگلستان میں ایسی
ایسی عجیب چیزیں اور تماشے دیکھے کہ ہندوستان میں کانوں سے بھی نہ سنے
تھے۔ خدا اس شہر کو قیامت تک قائم رکھے اور وہاں کے حکمرانوں کو مدد بخشے۔

عجب شہر ہے وہ عجب شہر یار ہے پُر از حکمت و لطف ہے وہ دیار

تیرہویں تاریخ نومبر کی ایک شخص کے ساتھ میڈم تساڈ میں گیا۔ جب قریب
اس کے جا پہنچا۔ اپنی آنکھ سے دیکھا کہ ایک مجلس آراستہ ہے۔ اس میں نامدار بیٹھے
میں نے اس ساتھی سے کہا تو مجھ سے ہنسی کرتا ہے کہ بے تعارف و شناسائی امیروں
کی محفل میں لیے چلتا ہے۔ اس نے کہا۔ یہ تصویریں امیروں کی موم کی بنی ہیں صاحبان
تصویر کچھ مرے کچھ جیتے ہیں۔ یہ سن کر سخت متحیر ہوا۔ اس کا کہنا ہرگز یقین نہ ہوتا۔
مگر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ قریب تصویروں کے پہنچا تو بھی یہ شبہ نہ
مٹا کہ امیر زندہ ہیں یا تصویریں استادہ۔ آخر اس شخص نے میرے رفع شک کے
لیے ایک تصویر کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ہرگز سر یا ہاتھ اس نے نہ ہلایا۔ تب میں نے بھی
گستاخ ہو کر چہروں پر ہاتھ رکھا اور ان کی تصویر ہونے کا یقین لایا۔ ایک طرف
تصویر وکٹوریا شہزادی کی اور والدین اس کے کی بنی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی تسلیم
بجا لانی چاہی۔ اس نے کہا۔ یہ بھی تصویر ملکہ کی ہے۔ نہ ملکہ اصلی ہے۔ بخدا ایسی تصویر
کہ اصل اپنی سے سر مو تفاوت نہ رکھتی۔ لباس، رنگ، قد و قامت میں تل بھر
کم و بیش نہ تھی۔ اسی سبب سے دیکھنے والے کو اصل و نقل میں تمیز نہ ہوتی۔
تصویریں موم کی شیکسپیر، لارڈ بائرن، سر والٹر سکاٹ شاعروں ذی رتبہ کی کھڑی
تھیں۔ ایسا ثابت ہوتا کہ شعر و سخن میں طبیعتیں ان کی لڑیں۔ اسی طرح لارڈ نلسن سپہ سالار جنگی
جہاز اور کئی بادشاہوں انگلستان کی مثل ولیم اور جارج کے اور کئی بادشاہوں

وس اور کئی رہزنوں کی تصویریں موم کی بنی تھیں۔ سوا ان کے اور کتنوں کی کہ دیکھنے
والوں کو زندہ معلوم ہوتیں۔ جز کی وہ نقل تھیں۔ اگر سامنے ہوتے۔ دیکھنے والے اصل
اور نقل میں تمیز نہ کر سکتے۔ فقیر یہ مکان اور رنگ نشان دیکھ کر اپنے گھر آیا۔ ڈیب صاحب
نے بتقریب ضیافت مجھے طلب فرمایا۔ موجب طلب بائیسویں تاریخ نومبر کی میں ان
کے مکان پر گیا۔ از انجا کہ مہمان نوازی طریقہ رئیسوں کا ہے۔ خاص طرز انگریزوں
کا انہوں نے بہت اشتیاق فرمایا اور اپنی دو لڑکیوں پری پیکر پاس بٹھلایا۔ میز پر
ہر قسم کا کھانا پینا نعمتوں کا چنوایا۔ اپنے ساتھ مہربانی سے کھلایا۔ میں درمیان ان دونوں
گلوں کے کانٹے معلوم ہوتا۔ جب کھانا کھا چکے۔ آتشدانوں کے گرد سب برابر بیٹھے۔
ایک نے دونوں پریوں میں سے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ آگ۔ کیا خاصیت ہے
اس کی اگر ہمارے ملک میں نہ ہوتی بغیر اس کے بہت اذیت پہنچتی۔ میں نے کہا
یہ خواص رکھتی ہے۔ پانی سے بجھتی ہے۔ مگر آگ حسن تمہارے کی غضب ڈھاتی ہے۔
ایک چنگاری اس کی جس پہ گرے جان و جگر جلاتی ہے۔ پانی سے زیادہ بھڑک
آتی ہے۔ حشر تک بجھنے نہیں پاتی ہے۔ آدھی رات تک یہی راز و نیاز رہا۔ بعد اس
کے میں رخصت ہو کر اپنے گھر چلا۔ ایک گلی تنگ تاریک میں پہنچا۔ ایک رنڈی رومال
منہ میں لپیٹے چلاتی غل مچاتی۔ ایک مرد اس پر زیادتی کر رہا تھا۔ اس سے اپنے تئیں
بچاتی۔ مجھ کو دیکھتے ہی اس گرفتار پنجۂ ظالم نے مجھ کو پکارا کہ برائے خدا کو اس کے ہاتھ
سے چھڑا۔ مرد سے کہا اے شخص اگر ذرا بھی آگے بڑھا میں نے تجھ کو مارا۔ میں سخت
متردد ہوا۔ ہر طرف آدمیوں تھانے پولیس کو دیکھنے لگا کوئی نظر نہ آیا۔ لاچار ہو کر
دل میں سوچا اگر تو اس عورت کو اس خرابی میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے خلاف جوانمردی
اور آدمیت کے ہوتا ہے اگر تھانہ دار کو خبر کرتا ہے وقت ہاتھ سے جاتا ہے۔ اگر
اس سے الجھتا ہے اور آدمی تھانے کے دیکھ پاویں۔ ساتھ ان کے تجھ کو بھی گرفتار

کو جاویں۔ سر دست بدنامی خدا راہ ہوئی۔ کوئی اصل مطلب سے نہ آگاہ ہووے۔
آخر دل میں یہی ٹھنا کہ اس حرام کار سے اس رنڈی کو بچا لو۔ یہ امر خدا راہ کا کرتا ہوں
اپنی ذات کا کچھ لگاؤ نہیں رکھتا ہوں جو کچھ ہونا ہووے سو ہووے۔ مرضی مولے از ہمہ
اولے خدا کو یاد کر کے دونوں پاؤں اس کے کو زمین سے اٹھا کر دے مارا۔ اور اس
کے اوپر چڑھا کشتی کے پیچ سے دونوں شانوں کو اس کے مضبوط گانٹھا اس عورت
سے کہا کہ میری کمر سے کھول شالی ٹپکا۔ اس سے اس کے پاؤں باندھ۔ اس نے
ویسا ہی کیا کمر بند میرا کھول کر پاؤں کو اس کے خوب باندھا۔ میں نے زمین میں اس کو
خوب سا رگڑ کر ہاتھ بھی باندھے۔ تب وہ مردک گڑگڑانے لگا کہ میں نے بڑا گناہ کیا
قصور میرا معاف کرو۔ خدا کے لئے مجھ کو چھوڑ دو۔ نہیں تو تھانہ میں گرفتار ہوں
گا سزا پاؤں گا۔ مجھ کو تم سے شرم آتی ہے۔ آنکھ نہیں سامنے کی جاتی۔ لعنت میری
اوقات پہ کہ اپنے ہم جنس اور ہم مذہب سے ارادہ بد رکھتا تھا۔ رحمت خدا تم پہ
کہ باوجود اجنبیت و بیگانہ وضعی کے اس بدی سے باز رکھا۔ میں سمجھا کہ یہ اپنی سزا
کو پہنچا۔ درصورت گرفتاری تھانہ بہت ذلیل ہوگا۔ قول و قرار کر کے چھوڑ دیا اس
نے چھوٹتے ہی سلام کیا اور بھاگا تب میں نے عورت سے پوچھا کہ اس وقت
تمہارا نکلنا کیونکر ہوا اور یہ شخص نالائق تم سے کیا تعلق رکھتا تھا۔ اس نے جواب
دیا کہ میں اپنی ماں کے کام کو جاتی تھی، جب یہاں آکے پہنچی۔ اس بدمست نے ہاتھ
میرا پکڑا۔ خیال بدکار رکھتا تھا۔ اتنے میں خدا نے تم کو یہاں پہنچایا کہ مجھ کو اس سے
چھڑایا۔ میں نے سن کر اس کو اس کے گھر تک پہنچا کر اپنے گھر کا رستہ لیا۔ اس نے
بہت مبالغہ سے بلا کر یہ حال اپنی ماں اور عزیزوں سے کہا۔ ان لوگوں نے شکر گزار
ہو کر مجھ کو کئی پیالے شراب کے پلائے اور پتا مکان کا پوچھنے لگے۔ میں نے اس
خیال سے کہ مسافر کو کسی سے دوستی کرنا نہ چاہیئے۔ لاؤبالی پتا بتا کر رخصت ہوا اور

اپنے گھر آیا۔

تیسویں تاریخ نومبر کی کپتان لاڈ صاحب کے مکان پر گیا ان کو اپنے ساتھ لیا
جس مکان میں دیوانے اور سودائی قید تھے دیکھنے چلا حال اس کا یہ ہے کہ شاہ
لندن نے ایک مکان بنوایا ہے۔ جو کوئی لندن میں دیوانہ ہو جاتا ہے وہ اس مکان
میں مقید ہوتا ہے۔ اس مکان عالیشان میں کئی درجے ہیں۔ مرد رنڈیوں سے جدا
رہتے ہیں۔ ڈاکٹر علاج معالجہ کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ جب کوئی ان میں سے
اچھا ہو جاتا ہے اپنے گھر چلا آتا ہے۔ جب میں اس مکان میں پہنچا نگہبان نے
روکا کہ بغیر چٹھی سند کے کوئی اندر نہیں جانے پاتا۔ میں نے اس سے اظہار کیا۔ میں
مسافر ہوں دشوار ہے چٹھی ملنا تو اپنی مہربانی سے اس مکان کو دکھا۔ مسافر نوازی
سے بعید نہ ہوگا۔ اس بات سے وہ بر سر عنایت ہوا مجھ کو اندر لے گیا ہر ایک درجہ
دکھلایا۔ دیوانوں کو دیکھا۔ جا بجا بیٹھے کوئی ہنستا۔ کوئی روتا کوئی کاغذ اخبار پڑھتا۔
ایک نے ان میں سے مجھ کو دیکھتے ہی بہت اشتیاق سے ہاتھ ملایا اور
کہا اتنے دنوں سے تو کہاں تھا۔ میں تیرا بہت مشتاق نگراں تھا۔ میں تجھ کو
خوب پہچانتا تو قوم مملوک سے ہے۔ بونے پاٹ کی لڑائی میں شریک تھا۔ اس کی
گرم جوشی سے ڈاکٹر صاحب اور ہر ایک دیکھنے والا حیران ہوا کہ یہ شخص بیس
برس سے قید ہے کسی سے بات نہیں کرتا۔ تم سے آشنا کیوں ملتفت ہوا
ہم کو ہے مقام بڑے تعجب کا حال اس کا یوں بیان کیا کہ یہ سارجن[1] ہے نوکر بادشاہی
تھا۔ بعد لڑائی بونے پاٹ کے کئی بادشاہ لندن کے سیر کو آئے۔ لارڈ ولنگٹن صاحب
نے سبھوں سے اس کی تعریف کی۔ فنون سپہ گری اور بہادری اس کے ظاہر کی۔
سب لوگ مشتاق دیکھنے کے ہوئے۔ اس نے اس میدان میں کہ کئی بادشاہ اور

ط۱: سارجنٹ مراد ہے

لاکھ سوار و پیادے موجود تھے۔ گھوڑے پر چڑھ کر کمال اپنے دکھلائے۔ شاہ روس نے بہت تعریف کر کر کہا کہ ہم نے کوئی سوار اس کمال کا نہیں دیکھا یہ شخص فنون سپہ گری میں کامل اور یکتا۔ تب سے یہ دیوانہ ہو کر اس حال کو پہنچا کہ یہاں آکر قید ہوا۔ اس مکان میں تین درجے تھے۔ پہلے میں وہ دیوانے کہ بسبب احتراق بلغم کے اختلال حواس بہم پہنچایا۔ مزاج ان کا مائل نرمی و ملائمت تھا۔ دوسرے میں وہ لوگ کہ بسبب حرقت خون کے ان کے دماغ میں فساد آیا۔ تیسرے میں نہایت دیوانے پڑے سڑے کہ جن کا مزاج بسبب احتراق سودا یا صفرا کے بالکل منحرف ہوا۔ ہر ایک کو ایک جگہ بلند کرسی کی شکل پر ہاتھ پاؤں باندھ کر بٹھلایا۔ کوئی مجال حس و حرکت کا نہیں رکھتا۔ اس خیال سے کہ ناخنوں[۲] سے اپنی آنکھیں نہ پھوڑیں۔ ہاتھوں میں دستانہ چرمی پہنائے دروازے آتشدانوں کے لوہے کے جھلی[۲] دار بنائے کہ مبادا کوئی اپنے تئیں ان میں گرائے۔ اس طرح دوسری طرف رنڈیاں درجے بدرجے قید تھیں حسن و جمال میں بے مثال تھیں۔ دیکھنے والا ان کا دیوانہ بن جاتا۔ اپنے تئیں واسطے دیدار جمال انھوں کے اس مکان کا قید بناتا۔ بعض ان میں جو اچھی ہو چلی تھیں۔ علیحدہ مکان میں اپنے اپنے کام اور پیشہ میں لگی تھیں۔ میں دو تین عورتوں ماہ وش کو اس قید میں دیکھ کر بہت ملول ہوا۔ فی الفور باہر نکل کر اسکول میں آیا۔ وہاں دیکھا لڑکے بن باپ کے یتیم پتلون زرد پہنے ہوئے لکھنے پڑھنے میں مشغول تھے۔ خرچ ضروری اُن کے بادشاہ کے ہاں سے مقرر اور معمول تھے وہ سب لڑکے امیر دل نامدار کے تھے۔ بہت صاحب لیاقت طبیعت اُن کی نوشت و خواند پر ایسی مصروف پائی کہ مجھ کو حیرت ہوئی۔ اپنے دل میں کہا

ط: ناخنوں سے جالی دار

سبحان اللہ لڑکے ہندوستان کے باوجود تاکید والدین کے تحصیل علم میں ہرگز نہیں مشغول ہوتے ہیں۔ اوقات اپنی مفت برباد کرتے ہیں بلکہ چھٹپنے میں حرکتیں بے جا کرتے ہیں یعنی ماں باپ کو گالیاں دیتے اور ان کے سامنے حقہ پیتے ہیں۔ وہ انہی باتوں میں لڑکپن ان کا سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ایک اور مکان میں گیا۔ اس میں نصیحت کرنے والے اور پادری سرکار بادشاہی سے مقرر ہوئے ہیں۔ جو عورت زناکاری سے باز آئے اور حرام کاری سے توبہ کرے ان کے پاس جا کر ظاہر کرے کہ میں تمہارے ہاتھ سے توبہ کرتی ہوں اور گناہوں سے باز آتی ہوں۔ وہ لوگ اس کو اس مکان میں رہنے کی جاگہ[۱] دیتے ہیں وعظ کہہ کر تعلیم کرتے ہیں اور سرکار شاہی سے اس کے لئے کچھ خرچ مقرر کروا دیتے ہیں جب وہ راہ راست پہ آوے کسو مرد کے ساتھ نکاح کر دیتے ہیں۔ ایک اسکول اور ہے اس میں اندھے لڑکے رہتے ہیں۔ روٹی کپڑا سرکار سے پاتے ہیں پادری اشارے سے ان کو تعلیم کرتے ہیں۔ بندگی عبادت بخوبی سکھاتے ہیں۔ ایک اسکول اور ہے جو لڑکا چھنال رنڈیوں کا یا حرامی پیدا ہوئے وہ اس لڑکے کو وہاں ڈال جاتے سرکار سے پرورش اس کی ہوتی ہے۔ جب سن شعور کی نوبت پہنچتی ہے۔ پڑھایا جاتا ہے یہاں تک کہ اس سے فراغت پاتا ہے۔ بعد اس کے کسی عہدے میں نوکرت اس کی ہوتی ہے اب صاحبان عقل غور کریں کہ ان باتوں میں کیا کیا فائدے ہیں۔ جہاں کہیں ہر مقدمہ میں ایسا انتظام ملحوظ خاطر ہو کیوں کر کسی امر میں خلل اور فساد ظاہر ہو ایسے لوگ جہاں پر کس طرح مسلط اور قادر نہ ہوں۔ ہندوستان میں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا ہے۔ بادشاہ فکر رعایا سے غفلت رکھتا ہے اگر کوئی عورت زناکار ہوئی۔ تمام عمر اسی میں رہی کوئی اس کو

ل: جگہ

نہ سمجھائے کہ راہ راست پہ آوے اگر کوئی لڑکا یتیم ہوتا ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو روٹی کپڑا دیتا ہے نہ پڑھاتا ہے۔ ان صورتوں میں خاک انتظام ہو امور ملکی کا کیا سرانجام ہو۔ صاحبان انگریزوں کی عقل پہ آفریں اور مرحبا کہ کیا اچھی باتوں کا رواج دیا اپنی قوم سے کسی لڑکے کو بے علم و ہنر نہیں رکھتے ہیں۔ ہر ایک کے لئے ایک طرز جدا معاش کا مقرر کرتے ہیں۔ غرض یہ سب امور لندن کے جو بندے نے لکھا بہت خوب اور مستحسن دیکھا۔

پیرس

بعد ان سیروں کے ملک فرانس کے دیکھنے کا شوق ہوا۔ چھبیسویں تاریخ نوامبر[1] کی بوچیڑ صاحب کے ساتھ ایک گاڑی پر سوار ہو کر کنارے دریا کے آیا۔ بوچیڑ صاحب کے بھائی ہندوستان میں آتے تھے۔ ننکو نوکر اپنے کو ان کے سپرد کیا۔ اس نے بروقت رخصت بہت رنج کیا کہ تم نے مجھ کو اس شہر میں اکیلا چھوڑا۔ دل جدائی گوارا نہیں کرتا۔ میں اس کو تسلی دلاسا دے کر جہاز پر سوار ہو کر چلا۔ نام اس جہاز کا گراں ترک زرنگار بنا تھا۔ ہر قسم کا کھانا پینا اس پر موجود اور مہیا۔ کپتان جہاز کا نہایت خلیق اور شفیق حال غربا۔ راہ میں ایک رات بڑا طوفان آیا۔ جہاز ڈگمگایا۔ کپتان صاحب نے لنگر ڈالا۔ اس پر بھی کچھ فائدہ مرتب نہ ہوا۔ اکثر صاحبوں اور بی بیوں کا حال حرکت جہاز سے پریشان ہوا۔ کوئی زیادتی الکائی اور قے سے بیہوش اور ہراساں، کوئی دوران سر سے مصروف شور و فغان۔ لڑکے بیچارے اور زیادہ حیران۔ خلاصہ یہ کہ جہاز پر شور قیامت بپا تھا مگر عنایت ایزدی سے بندہ اپنے حال پر رہا۔ جب وقت صبح ہوا جہاز قریب جزیرہ بلون کے پہنچا۔ کنارا اس کا دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ کنارہ اس کا پل کی طرح لٹھوں سے

---

[1] نومبر

پٹا تھا۔ صاحب لوگ مع بی بیوں کے اس پر چلتے پھرتے۔ دور سے صاف دکھائی دیتے۔ بندہ جہاز سے اتر کر محصول گھر میں گیا۔ پروانہ اپنا وہاں کے اہلکاروں کو دکھایا۔ بعد اس کے ایک سرا میں جا کر اترا۔ ایک رات دن سیر و تماشا دیکھتا رہا۔ دوسرے دن صبح اٹھ کر گاڑی میل کوچ پر سوار ہو کر دارالسلطنت پارس[1] کو روانہ ہوا۔ مواضع اور دیہات راہ میں دیکھتے جاتے۔ بہ نسبت دیہات لندن کے خوبی اور آبادی میں بہت کم تھے۔ گاڑی میل کوچ بہت بڑی انگریزی میل کوچ سے زیادہ تھی۔ چھ گھوڑے اس میں جتتے مگر انگریزی گھوڑوں سے قوت میں کم اور آہستہ آہستہ چلتے۔ راہ میں نشیب و فراز اور کیچڑ چہلا[2] تھا۔ اس لئے کہ مینہ برسا تھا اور برستا۔ گاڑی بان گھوڑوں کو ہانکتے ہانکتے تمام منزل تھک گیا۔ ہم تین شخصوں نے شریک ہو کر گاڑی میں سے مقام کیا کہ اس میں تین آدمیوں کی جگہ با آسائش ہوتی ہے کرایہ پر لیا تھا۔ تس پر بھی گاڑی کے تکان سے بچاؤ نہ ہوا۔ جاڑے کی خوب شدت تھی۔ راہ میں ہر چیز میسر آتی۔ کتنے گاؤں کے بعد ایک موضع آبادان پایا کہ عمارت اس کی بلند اور نام اس کا آمین تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہہ کر وہاں مقام کیا اور اس شہر کی سیر کو چلا۔ لڑکے فقیروں کے پیچھے لگے سوال کرتے ساتھ چلے۔ یہ رسم وہاں کی برخلاف لندن کے نظر آئی۔ وہاں کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس شہر میں ایک کلیسا دیکھا۔ تین سو بیاسی فٹ اونچا تھا۔ تمام شہر اس پر سے نظر آتا۔ تصویریں شاگردوں حضرت عیسیٰؑ اور مقدسوں کی رکھیں۔ میں نے ویسی تصویریں کہیں نہیں دیکھیں۔ آئینہ جوڑیوں کے بہت صاف۔ ایک روغن سے جلا دیئے شفاف۔ اس زمانہ میں وہ روغن نہیں ملتا ہے۔ بلکہ بن ہی نہیں سکتا۔ اس کلیسا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بعد سیر کے سرا میں مقام کیا۔

---

[1] پیرس [2] پوربی زبان میں وہ زمین جو پانی اور دلدل سے پر ہو۔

غرض کہ پہلی تاریخ دسمبر کی دارالسلطنت پارس میں پہنچا۔ نزدیک بازار بادشاہی کے سرائے ڈلی میں اترا۔ دوسرے دن شہر کا تماشا دیکھنے چلا۔ پہلے بازار بادشاہی میں آیا۔ اس کا آدھ کوس کا گھیرا تھا۔ حال اس کا سنا کہ زمانہ سابق میں مکان بادشاہی تھا۔ گردش زمانے سے اس نے مفلس ہوکر بیچا۔ چنانچہ وہی مکان اب بازار ہوا۔ اسی سبب سے نام اس کا بازار بادشاہ رہا۔ دو طرف دکانیں سنگ مرمر کی تھیں۔ بعضوں میں جواہرات۔ بعض شال دوشالوں کشمیری سے بھری۔ کسی میں کپڑے زنگار رنگ رکھے۔ پھول ان کے رنگوں سے شرماتے۔ راہ بازار کی راہیں دوکانوں کے واسطے محافظت مینہ اور غبار کے شیشوں سے پٹی عجب لطافت اور کیفیت رکھتی۔ قہوہ خانوں میں چھت پر زر ستون سنگ مرمر کے تھے اندر ان کے میز پتھر کی رکھی۔ برابر ان کے کرسیاں زرنگار بچھیں۔ پریاں فرانس کی قہوہ پلانے کے لئے بیٹھیں۔ میں وہ مقام عشرت افزا دیکھ کر سرا میں آیا۔ دوسرے دن کلیسائے نیوٹرودم[۱]" میں گیا۔ اس شہر میں بہتر اس سے کلیسا نہ تھا عمارت اس کی نہایت وسیع اور عالیشان۔ دوسری طرف باغ جنت نشان اس میں ہر ملک اور ہر قسم کے جانور موجود اور نمایاں۔ شمار ان کا نہیں۔ یارائے زبان۔ ایک جانور عرب کا نظر آیا کہ لنبائی[۲] قد میں قریب بیس ہاتھ کے تھا۔ اگلا دھڑ اس کا بلند پچھلا پست اس سے دو چند شکل اس کی ملی ہوئی شتر وآہو سے تھی۔ زراف اس کو کہتے ہیں بہ زبان عربی۔ اس کی صورت دیکھنے سے مجھ کو عبرت و ہیبت آئی۔ ایک کٹہرے میں سپید[۳] ریچھ بیٹھے وہ بھی بجائے تماشے کے تھے۔ رنڈیاں وہاں بیٹھیں۔ روٹی اور مٹھائی بیچتیں، جو مسافر سیر کو جاتا ہے۔ ان سے روٹی مٹھائی مول لے کر ریچھوں کو کھلاتا ہے۔ وہ خوش ہوتے ہیں اور روٹی کھاتے ہیں۔

---

۱ NOTE DAME CHURCH ۲ لمبائی ۳ سفید

چوتھے دن باغ بادشاہی میں گیا۔ پھولوں کو کھلا ہوا میووں سے بھرا پایا۔ ہر قسم کے پھول تھے۔ کثرت میووں سے درخت جھکے۔ پری زاد فرانس کے خوش رفتار۔ باغ میں عجب بہار۔ غرض وہ قطعہ روکش بہشت بریں تھا۔ گل بوٹوں سے سراپا رنگیں تھا۔ دماغ اس کی بو سے تازہ ہوا۔ دل شگفتگی اس کی سے کھلا۔ پانچویں دن پارس کی میوزیم میں گیا۔ وہاں کا تماشا دیکھا ایک روغن مل کر ہر طرح کے جانوروں کو زندے کی طرح کھڑا کیا تھا۔ ہرگز زندہ مردہ میں سوائے حس و حرکت کے فرق نہ ہوتا۔ یہاں کئی جانور ایسے خوب دیکھے کہ لندن میں نہ تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک ہاتھی اور شیر اور زراف تھا۔ عجیب وضع سے کھڑا تھا اور بیان اس جگہ کا مناسب نہ تھا۔ بعینہ لندن کا سا تھا۔ چھٹے دن میں بوچر صاحب کے ساتھ کھانا کھاتا۔ ایک بوڑھا بہرا سرا میں اترا تھا۔ شام پین پی کر وہ مست ہوا۔ مجھ سے اور ولیم بوچر صاحب سے کہنے لگا آؤ ہم تم مل کر ناچ گھر چلیں، وہاں کا سیر و تماشا دیکھیں۔ اس مکان کو ان کی زبان میں اپیرہ[۱] کہتے ہیں۔ ہم اس کے کہنے پر راضی ہوکر ناچ گھر چلے۔ وہاں جاکر سب مصروف تماشا ہوئے۔ دو رنڈیاں کہ ناچنے گانے میں یکتائے زمان تھیں رقص و سماع میں مشغول تھیں۔ ایسے کرتب دکھاتے کہ سب حیرت میں آئے مگر مجھ کو ایک امر ان کا پسند نہ آیا۔ وہ یہ کہ انہوں نے ناچتے وقت ایسا کپڑا مہین پہنا کہ تمام بدن خصوص جسم نہانی ان کا صاف نظر آتا۔ ناچتے ناچتے جب پاؤں اٹھاتیں گویا لوگوں کو شرمگاہ اپنی دکھاتیں۔ مرد رنڈی سب تماشا دیکھتے۔ اس امر نامناسب کو خلاف حیا نہ سمجھتے۔ یہ ماجرا خلاف عقل نظر آیا۔ میں نے اکثر انگریزوں کا حال سنا کہ ہندوستان کی کسبیوں سے بسبب پہننے ننگی پوشاک اور کپڑے باریک چست کے نفرت کرتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کا

۱: OPERA

راگ اور گانا نہیں سنتے ہیں۔ پر وہاں کوئی مانع نہ ہوا کہ ان کو اس حرکت بے جا سے باز رکھتا۔ قصہ مختصر وہ بوڑھا ساتھی ہمارا دیکھنے ہنروں ناچ اور مقام مخصوص ان کے سے اور پینے شراب سے ایسا بے حال و بیخود ہوا کہ شور و غل مچاتا اس محفل میں حکم بادشاہی سوائے ناچنے گانے والوں کے کسی کے بولنے کا نہ تھا جب وہ بوڑھا چلانے لگا۔ دو تین اور سیل عزت دار قوم نے منع کیا۔ وہ بہر ان ناچنے والیوں کے دریائے عشق میں ایسا ڈوبا تھا کہ ہرگز شنوا نہ ہوا۔ جب ہم نے دیکھا کہ وہ نہیں سنتا ہے اور رنگ مجلس بدلتا ہے بلکہ اپنے نکالے جانے کا بھی باعث ہوتا ہے۔ اشارے کنائے سے سمجھایا، شور و غل سے اس کو باز رکھا اور اپنے دل میں عہد کیا کہ اس کے ساتھ اب کہیں نہ جاویں گے ہمراہی اس کے سے آپ کو بچاویں گے۔ رات بھر ناچ کے تماشے میں رہے۔ صبح اپنے مقام پر آئے۔

ساتویں دن پھر ایسا ہی امر پیش آیا۔ یعنی جب وہ بوڑھا کھانا کھا چکا اور شراب پی کر مست ہوا۔ مجھ سے اور بوچڑ صاحب سے کہنے لگا آج میرے ساتھ کنسٹ[1] میں چلو وہاں کی سیر دیکھو۔ ہم نے تکرار کی کہ تمہارے ساتھ جانے کو دل میں انکار کی۔ تم بالطبع مست ہوتے ہو کسی کا کہنا نہیں سنتے ہو۔ اس نے ایسا مبالغہ کیا کہ ساتھ جانا پڑا مقام عذر نہ رہا، ناچار ہمراہ ہوئے کنسٹ گئے۔ وہ ایک مکان عالیشان بہت نفیس تھا۔ چند رئیسوں امیروں قوم نے شریک ہو کر اس کو بنوایا، کوچ عمدہ رکھے ہوئے۔ اس پر بچھونے اطلس و مخمل کے بچھے تھے۔ آٹھویں دن رات بھر مرد و زن کا جماؤ ہوتا ہے، ہر کوئی بجانے باجوں کا کمال دکھلاتا ہے اور شراب پی کر اپنی اپنی معشوقہ کا ہاتھ پکڑ کر ناچتا ہے جب میں وہاں پہنچا فرانسیس کی پریوں کو دیکھا کہ کوچوں پر بیٹھی باجے بجاتیں، کیا خوب باجے تھے کہ آواز ان

---

[1] : کنسٹ (موسیقی کی محفل)

کی سے مردے جی اٹھتے۔ اتنے میں دورِ جام شروع ہوا۔ بعد اس کے ہر ایک مست ہو کر ایک ایک پری کا ہاتھ پکڑ کر ناچنے لگا۔ چونکہ بندہ تمام عمر کبھی ناچا نہ تھا، ان صاحبوں کے سامنے اجنبی معلوم ہوتا مگر اس حیلہ سے کامیاب مطلب تھا۔ اس بڈھے نے بھی ہاتھ ایک بڑھیا کا کہ مٹاپے اور قد میں اس سے دگنی تھی، پکڑ کر ناچنا شروع کیا۔ بوجھ اس بڑھیا کا بھاری تھا۔ تھوڑی دیر میں تھک کر ہانپتے ہوئے کوچ پر بیٹھا اور سو یا۔ میں نے اور بوچڑ صاحب نے تمام شب خوشی سے بسر کی، مگر وہ رات ایسی جلد گئی کہ تھوڑی سی معلوم ہوئی۔ فقیر نے یہ شعر حسب حال پڑھے۔

امشب مگر بوقت نمی خواند ایں خروس
عشاق بس نکردہ ہنوز از کنار و بوس

بالجملہ وہ شب ایسے لطف سے بسر ہوئی کہ بادشاہوں کو باوجود سامان کے میسر نہیں آتی۔ ہندوستان میں ایسی مجلس پریوں کی خواب میں بھی نہیں دکھائی دیتی۔ صبح اپنے مقام پر آیا۔ آٹھویں دن اپنے ہمراہیوں سے پیشتر جاگا۔ ایک شخص اٹھارہ برس کے سن کا شیشہ شراب بیر آگے رکھتا۔ قہوہ وغیرہ ملا ملا کر اس کو پیتا۔ میں دیکھ متحیر ہوا یہ کون سا ایسا ہے جو علی الصباح شراب بیر پیتا ہے یہ وقت لال شراب پینے کا ہے اس کے لئے شراب سرخ اس وقت پینا فائدہ اور رواج رکھتا ہے۔ میں اسی خیال میں تھا کہ اس نے آپ ہی کہا آؤ شراب بیر پیو۔ میں نے کہا اس وقت معاف رکھو۔ ثابت ہوا کہ وہ امیر زادہ تھا۔ باپ اس کے نے تحصیل علم کے واسطے فرانس میں بھیجا تھا۔ وہ یہاں آ کر ایسے امورِ بے جا میں پھنسا، شغل علم سے باز رہا۔ پھر اس نے فرمایا ہمارے ساتھ چلو، سیر عجائبات اس ملک کی دیکھو۔ میں نے اقبال کیا۔ بوچڑ صاحب کو ساتھ لے کر ہمراہ اس

کے چلا، جاتے جاتے اس جگہ گیا کہ در و دیوار شیشے کا تھا۔ جو کوئی گمنام زہر کھاکر مرتا ہے یا تلوار بندوق سے اپنے تئیں ہلاک کرتا ہے۔ لاش اس کی اس مکان میں رکھتے ہیں۔ فوارے کی راہ حوضوں سے پانی اس پر چھڑکتے ہیں۔ بعد تین چار روز کے جب تعفن اٹھتا ہے اور کوئی وارث مردہ پیدا نہیں ہوتا ہے کہیں نہ کہیں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اگر وارث اس کا ہوتا ہے، ایام مقررہ سے پہلے لاش لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی لاش ایک رنڈی کی پڑی تھی۔ مجھ کو اس سے عبرت آئی۔ پارس میں چند روز رہا کوئی دن ایسا نہ تھا کہ دو تین آدمیوں نے اپنے تئیں نہ ہلاک کیا۔

نویں تاریخ دسمبر کی "پلچر آف اڈس" میں گیا۔ وہ تصویر خانہ تھا ایسا مکان کہ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا ہے، ستون اس کے زرنگار اور مطلا فرش اس کا شفاف خوش رنگ لکڑی کا پل کی طرح پٹا ہوا۔ اگر کوئی عاقل اچانک اس پر قدم رکھتا یقین ہے کہ بسبب چکناہٹ کے پھسل پڑتا۔ اس مکان میں تصویریں مصوروں کامل اگلے زمانہ کی زیب پذیر تھیں سب کی سب بے نظیر تھیں۔ استادوں کے ہاتھ کی بنیں۔ بموجب تخمینہ قریب ہر دو لاکھ کے نظر آئیں۔ اس جائے عشرت فزا کو دیکھ کے میں بہت خوش ہوا۔ بعد ازاں ایک گاڑی کرایہ کر کے معہ بوچڑ صاحب کے اس پر سوار ہو کر پیالس برسیل کو چلا۔ وہ مقام پارس سے چھ کوس فاصلہ رکھتا، مکان جشن اگلے بادشاہ کا تھا۔ وہاں آکر معہ اپنے بیبیوں کے جشن جمشیدی کرتا۔ یعنی شراب پی کر ان کے ساتھ عیش و نشاط میں مشغول ہوتا۔ راہ میں جابجا آبادی و سبزی نظر آئی۔ دل حزیں نے اس سے شگفتگی بہم پہنچائی دو گھڑی دن رہے وہاں پہنچا۔ گرد اس کے پہاڑ اور سبزہ مینا رنگ تھا۔ قریب اس کے ایک باغ جنت آثار بوجھ پھلوں سے جھکے ہوئے درخت میوہ دار پھول اس کے

رنگارنگ، عبرت دہ کارنامہ ارژنگ، حوضوں پر آب میں تصویریں عجیب و غریب قائم و برپا۔ ان کے منہ سے فوارہ پانی کا ابلتا۔ بعض حوض میں مرغابیاں اور چڑیاں دریائی تیر رہیں، گویا وہ چشمہ حیات تھا۔ ان کے تئیں اس باغ کے دیکھنے سے دل میں طاقت آئی، آنکھوں نے طراوت پائی۔ اسی کے پاس ایک مکان گنبد دار، اندر اس کے کرسیاں سنگ مرمر کی تراشی ہوئیں آبدار۔ بیچوں بیچ اس کے حوض لبریز پانی کا فوارہ اس میں جاری تھا۔ اگلے بادشاہ اس کو عرق انگور سے بھرتے۔ نازنینوں کے ساتھ پیتے۔ بعد اس کے مکان جشن بادشاہی نظر آیا۔ تصویروں سنگی اور رقمی سے بھرا ہوا تھا۔ ستون سنگ مرمر سپید کے ایسے زرنگار کہ پتھر نظر نہ آتا سوائے زر تابدار۔ چھت اور دیوار اس کی میناکار۔ پائے نگاہ شفافی اس کی سے پھسلتا ہر بار۔ میز اکثر الٹ سنگ مرمر کے بچھے تھے۔ ہر ایک لاکھ لاکھ روپیہ سے قیمت زیادہ رکھتے اور سامان شاہانہ ایسا کہ عقل میں وصف اس کا نہ آسکتا تھا۔ حق یہ کہ وہ مکان روضۂ تاج بی بی سے لاکھوں درجے بہتر تھا۔ عمارتوں لندن اور ہندوستان سے کہیں خوب تر تھا۔ کوئی بادشاہوں زمان سے اب مجال نہیں رکھتا تھا کہ ویسا مکان بنوائے۔ الحاصل وہ مکان حلقہ زمین میں جوں نقش نگین ہے۔ یا بروئے زمین بہشت بریں ہے۔

گیارہویں دن بوچڑ صاحب کے ساتھ گاڑی پر سوار ہو کر بالیشش میں گیا۔ وہ گورستان فرانسیسوں کا تھا۔ شہر سے دو کوس فاصلہ رکھتا۔ دروازے اس کے پر پھول والیاں بڑے تکلف سے ہار پھول بیچنے میں مشغول تھیں۔ جو کوئی اپنے دوستوں کی قبر پر جاتا۔ ہار ان سے مول لے کر قبروں پر چڑھاتا۔ فقیر کو اس بات سے رسوم ہندوستان کا خیال آیا کہ وہاں بھی یہی طریقہ تھا۔ جب اس کے اندر

۱؎ یکساں

پہنچا۔ قبریں سنگ مرمر کی بنی دیکھیں تیار۔ ان پر ایک چھوٹی سی کوٹھری کھڑکی دار۔ اُس میں دو بتیاں موم کی اور کتاب نماز کی اور تصویر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اور پھولوں کے ہار۔ جو کوئی اپنے دوست کی قبر پہ جاتا ہے کھڑکی کھول کر اندر کوٹھری کے بیٹھ کر کتاب نماز پڑھتا ہے۔ ثواب اس کا مردہ کی روح پر پہنچتا ہے۔ عود وغیرہ خوشبو کے لئے جلاتا ہے۔ طرفہ تکلف یہ دیکھا کہ ہر قبر کے پاس درخت پھولوں کا تھا۔ درختوں سرو کا سایہ ہر قبر پہ رہتا۔ دھوپ کا ہرگز گزر نہ ہوتا۔ دو قبریں سنگ مرمر کی الاڈا لوزیا کی بہت مضبوط بنی تھیں شبیہیں ان کی پتھر پر بنائیں۔ وہ دونوں عاشق معشوق ہیں مثل لیلیٰ و مجنوں یکتائے زمانہ ہوئے ہیں۔ حالات اُن کے افسانہ زباں ہوئے ہیں۔ اس نواح میں اب جو کوئی کسی پہ عاشق ہوتا ہے اُن کی قبر پہ جاکر پھولوں کا ہار چڑھاتا ہے اور کتاب نماز پڑھ کر ثواب ان کی روح پہ بھیجتا ہے۔ دو تین قبریں اور جرنیل لشکر بونے پاٹ[1] کی نظر آئیں۔ بہت مستحکم اور مضبوط تھیں۔ سبب زیادتی سنگ مرمر کا یہ معلوم ہوا کہ وہاں سے قریب ملک اٹلی[1] اور پہاڑ مرمر کا تھا۔ اس سے یہ پتھر کھد کھد کر آتا۔ بندہ جہاں میں پھرا ایسا قبرستان لطیف کسی قوم کا نہ تھا۔ قبرستان نہیں گلستان ہے۔ بظاہر مردوں کے لئے بہشت کا سامان ہے۔ یہ بات دل کو پسند آئی اور قوموں میں نہ ہونے اس رسم سے طبیعت غم کھائی۔ انگریز کہتے ہیں خاک مردوں کو تکلف ضرور نہیں کیا اس سے اُن کو نجات ہے۔ یہ صحیح میں بھی جانتا ہوں لیکن اگر قبروں پر پھول رکھیں، خوشبوئیں جلائیں کیا قباحت کی بات ہے۔ خوشبو ایسی چیز ہے کہ جانور پرندہ مثل زنبور سیاہ و زنبور عسل اس پر مائل ہوتے ہیں۔ ہندو اپنے بتوں پر ہار پھول چڑھاتے۔ مسلمان قبروں پہ پھول لے جاتے ہیں۔ خوشبوئیں

[1] اٹلی

جلاتے ہیں۔ پس یہ رسم ہر مذہب میں خوشنما ہے۔ ظاہرا روح کو اس سے لطف ہوتا ہے۔ بارہویں دن پنتھیم میں گیا۔ وہ خاص مدفن بادشاہوں فرانسیس کا تھا۔ عمارت عالی رکھتا۔ صورت اس کی یہ کہ گنبد در گنبد مانند چھلکے پیاز کے بنا۔ اندر اس کے تصویریں عمدہ کھینچی ہوئیں خوشنما سیڑھی گول چکردار بنی تھی۔ لوگوں کو اوپر چڑھنے میں کیفیت اندر گنبد کے نظر آتی۔ سب سے اوپر چھت شیشے کی محافظت گرد و غبار کے لئے بنائی۔ وہاں سے تمام عمارت شہر کی نظر آتی ہے۔ اندر مکان کے تہ خانہ تھا کہ تابوت بادشاہوں کا اس میں دفن کیا۔ نگہبان اس مکان کا مجھ کو اندر لے گیا۔ اپنے دامن پر ایک لکڑی ہاتھ سے پکڑ کر ماری۔ توپ کی آواز کان میں آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بسبب مکان گنبد دار کے وہ شور تھا۔ قبر بادشاہوں کی دیکھ کر مجھ کو عبرت آئی کہ کیا کیا صورت تہ زمین سمائی یہ پادشاہ کہ فرماں روا تھے اب کوئی نشان سلطنت کا نہیں رکھتے۔ والٹیر[1] جو بڑا عالم اپنے علم کا تھا آخر بسبب زیادتی علم کے بے دین ہوا تھا۔ اس کی قبر بھی وہیں تھی۔ اس پر تصویر اس کی کھڑی تیرہویں دن کتاب خانہ بادشاہی میں گیا۔ ہر علم اور ہر زبان کی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ برابر رکھی ہوئیں۔ بطرز خوشنما کہ گو کوئی عمر نوح پاوے اور رات دن ان کی سیر کرے ہرگز ان کی نہایت کو نہ پہنچے۔ ان لوگوں کو شاباش اور آفریں جنہوں نے خون جگر کھا کر کتابیں جمع کیں۔ چودھویں دن اس مکان میں گیا کہ تصویریں آدمیوں اور جانوروں کی اور ہر ایک عضو ان دونوں کے موم سے بنائے ہیں۔ ایسا ثابت ہوتا کہ تصویر آدمیوں کی بات کیا چاہتی ہیں۔ تمام اعضا ایسے بنے کہ سر مو فرق نہ رکھتے۔ ہاتھ چومنے بلانے

[1] VOLTAIRE فرانسیسی ادیب و فلسفی جو تمام عمر کلیسا کے خلاف لکھتا رہا۔ اور کئی بار ملک بدر ہوا۔

والوں کے کیا کمال کیا تھا۔ جو لڑکا شوق ڈاکٹری کا رکھتا ہے، مدت تک وہاں رہ کر ہر عضو مومی کو بغور دیکھتا ہے۔ یہ بات خلاف عقل نظر آئی کہ محافظ وہاں کی ایک عورت تھی۔ اس نے ہر عضو تصویر مجھ کو دکھلایا۔ بعضا ان میں سے ایسا کہ قابل دیکھنے رنڈی کے نہ تھا۔ صاحبان عقل سے بعید نظر آیا کہ اس خدمت پر اس کو مقرر کیا۔ پندرھویں دن ایک مکان میں گیا۔ وہاں صدہا آدمی قالیچے منقش بنیال[ئ] بن رہے تھے۔ بناوٹ میں تصویر عمدہ کھینچتے۔ دریافت ہوا کہ وہ سب مصور تھے۔ تصویریں قالین اور دریوں پر ایسی معلوم ہوتیں کہ کسی مصور کامل نے تصویریں کاغذ پر کھینچی ہیں ان کی کاریگری دیکھ کر متحیر ہوا۔ حال ان کا پوچھا۔ ظاہر ہوا کہ واسطے فرش دیوان عام شاہ فرانسیس میں اس کام کو ٹپسٹری[۳] کہتے ہیں اس کے بعد کونسل کے مقام پر گیا۔ ایک مکان فلک بنیاد دیکھا۔ ستون سنگ مرمر کے ایک ڈال راست اس میں لگے۔ صاحبان کونسل اپنے رتبے کے موافق جا بجا بیٹھے۔ ہر ایک کے ممبر رکھے۔ اس مکان کی شکست و ریخت کے لئے مزدور لگے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر باہر نکلا۔ پانی برسنے لگا۔ سارے کپڑے تر ہوئے۔ مگر گرتے پڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو رنڈیاں ایک خوبصورت دوسری کریہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی، تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آئیں۔ اکبار پاؤں پھسلا۔ دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زنِ جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ بد شکل کو ویسے ہی چھوڑا۔ وہ بڑی محنت سے اُٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی۔ مگر اس زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اس نے ایک دھکا دیا۔ مجھ کو زمین پر گرایا۔ دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اٹھایا تھا میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچانی غنیمت سمجھا۔ وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں[۱]

---

[۱] : قالین [۲] : دریاں [۳] غالباً TAPESTRY مراد ہے۔

بجا دیتے۔ پیچھے میرے دوڑتے آتے۔ بہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہنچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہ ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔ پاؤں میں چوٹ آئی تھی۔ اس سبب سے دو ایک دن قیام کیا۔ بعد اس کے اس امیر زادہ کے ساتھ جو صبوحی شراب بیر پیتا تھا، سیر کو چلا۔ مٹھائی بیچنے والیوں کی دوکان پر گیا۔ دیکھا کہ رنڈیاں خوبصورت تھال مٹھائی کے سلیقہ سے جمائے ہوئے بیچ رہی ہیں۔ جب مجھ سے چار چشم ہوئیں، بے اختیار ہو گیا۔ دل ہاتھ سے کھو گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا قسم مٹھائی سے جو چاہو سو لو۔ میں نے جواب دیا تمہارے لب نوشین کلام شیریں کے سامنے مٹھائی کیا اصل ہے یہ اصل وہ نقل ہے تم خود شہد ہو اس سے زیادہ کیا مٹھائی ہے۔ بھلا سچ کہو۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسیں اور باتیں معشوقانہ فرمائیں۔ اپنے پاس عنایت سے بٹھلایا۔ بندہ ان کی شیریں گفتاری سے چاشنی یاب ہوا۔ جب چلنے کا ارادہ کیا انہوں نے پھر بٹھلایا۔ میں نے کہا مکھی کو اسی قدر شہد پہ بیٹھنا چاہیئے کہ پھنس نہ جاوے۔ میں بھی اگر زیادہ ٹھہروں گا۔ پھنس جاؤں گا۔ پھر میں نے چلتے وقت تھوڑی مٹھائی مول لی اور روانہ ہوا۔ وہی امیر زادہ اور کتنے مکانوں میں لے گیا۔ بیان ان کا نہیں ہو سکتا۔ حق یہ ہے کہ فرنگستان پرستان ہے۔ ہر ایک شخص حسن و جمال میں غیرت مہر درخشاں جو کوئی یہاں آتا ہے۔ وطن کو اپنے بھول جاتا ہے۔

سیہ چشم سبزان رنگین نگاہ بشورنمک از شکر باج خواہ
رہ مایہ داران ایمان زنند بجز و ادبیع دل و جان کنند

جائے فضل و کمال ہے۔ مکان حسن و جمال ہے۔ ملک پارس[۲] دارالسلطنت فرانس نہایت آباداں ہے اور ولایت جوں گلستاں۔ مگر راہ کوچہ بازار کا انتظام لندن سا نہ تھا۔ یعنی لندن میں ایسی سڑک بنی ہے۔ دونوں طرف سے بلند بیچ

---

[۱] اہل لکھنؤ تالیاں بجانے کی بجائے تالیاں دینا بولتے ہیں (امیر اللغات) [۲] پیرس مراد ہے۔

میں پنجی ہے۔ دو طرف راہ بلند پر آدمی آتے جاتے ہیں۔ راہ پست بیچ کی سے جانور اور گاڑی لے جاتے ہیں۔ یہاں سب راہ برابر ہے، یکساں سراسر ہے آدمی اور جانور کی راہ میں کچھ فرق نہیں بلکہ برسات میں بسبب نشیب و فراز فرش سنگی کے راہیں قابل آمد و رفت نہیں رہتیں۔ کہیں کہیں پاؤں پھسلتے ہیں آدمی اور جانور گرتے ہیں۔ مگر جب سے فلپ شاہ بادشاہ تخت پر بیٹھا ہے، راہوں کی تیاری میں جہد بلیغ رکھتا ہے۔ سابق اکثر جا روشنی چراغ و فانوس کی ہوتی تھی۔ بادشاہ موصوف وہاں اب گیس روشن کرواتا ہے۔ عدل و انصاف کا پتلا ہے۔ بہت رسمیں بے جا پہلے جو تھیں اس نے اپنے عہدِ دولت سے موقوف کروا دیں جیسے قمار بازی وغیرہ وہاں کے لوگوں کی عادت تھی۔ اس نے بالکل اٹھا دی۔ ہر امر میں اختیار ہوشیاری رکھتا ہے۔ اس کی تدبیر سے رستہ بھی مثل لندن کے تیار ہوتا ہے۔ مکان قواعد اور سلاح خانے میں گیا۔ بارہ ہزار سپاہیوں کو قواعد میں مشغول پایا۔ پیادے فرانسیس کے قواعد اور قد اور چستی چالاکی میں پیادوں انگلس سے کم تھے۔ دل کا حال نہیں معلوم کہ شجاعت کم یا زیادہ رکھتے۔ سوار داڑھی مونچھ والے البتہ ہیبت ناک تھے۔ قد و قامت میں دراز اور چالاک نظر آتے۔ گھوڑے اُن کے ضعیف البنیان[1] مثل گھوڑوں انگلستان کے گاڑیوں میں بھی گھوڑے چھوٹے لگے۔ لندن میں ایسے گھوڑے دیکھے کہ سُم اُن کے اونٹوں کے سے اور پٹھے ہاتھی کے سے تھے۔ جس قدر صفائی اور صیقل لندن کے ہتھیاروں میں دیکھی یہاں کی فوج کے ہتھیاروں میں نہ تھی۔

---
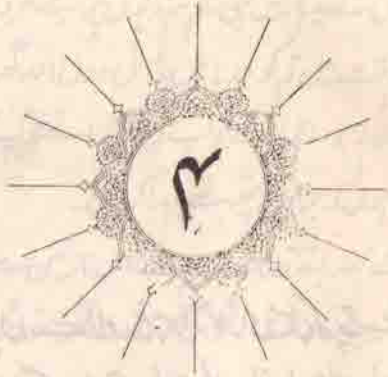
[1] بنیان بمعنی خلقت۔ ضعیف البنیان عموماً انسان کے لئے بولتے ہیں یہاں اس کے معنے کمزور کے ہیں۔

پھر لندن میں

جب ان سیروں سے فارغ ہوا۔ گاڑی میل کوچ سے عام گیا۔ کرایہ پہ
ٹھہرا کر دو تین صاحبوں کے ساتھ سوار ہوا اور لندن چلا۔ راہ میں گاؤں آباد
فرانسیس کے دیکھے، ہر ایک دیوار شہر پناہ رکھتی اور ہر ایک میں قلعہ اور خندق
قلعے میں پل بنے تھے۔ جو گاڑی اس پر سے جاتی۔ تنگی و گرانی[1] اس کی اس پل
سے دریافت ہوتی۔ کوئی جب تک پروانہ سند پاس نہ رکھتا ہو اس میں چہرہ اور
خال و خط اُس کا نہ لکھا ہو۔ شہر دل فرانسیس میں نہیں جا سکتا۔ چلتے چلتے بندہ
جزیرہ بلون میں پہنچا۔ وہاں مچھلی پکڑنے والوں کے جہاز جمع تھے۔ بسبب افراط کے
مچھلی بہت ارزاں بکتے۔ آب و ہوا وہاں کی اچھی۔ بارش برف کی زیادتی۔ یہ
جزیرہ کنارے سمندر کے عجب جائے عشرت فزا تھا۔ زمانہ قدیم سے لبا تھا تین
طرف سے دیوار شہر پناہ کی تھی مگر ایک سمت جد شہر خالی سے آبادی ہوئی خالی۔ ایک
قلعہ قدیمی بھی اس میں تھا۔ وہاں پہنچ کر بوچڑ صاحب کا دل مائل قیام ہوا۔ بپاس خاطر
ان کے آٹھ روز مقام کیا ہر روز سیر و تماشے میں رہتا۔ اسی عرصے میں مجھ سے اور
ایک عورت خوبصورت سے نہایت محبت ہوئی مگر خالی اغراض نفسانی سے تھی۔
سن اس کا پندرہ سولہ برس کا عقل و دانائی میں وحید و یکتا۔ اکثر اس کے ساتھ

[1] ہلکا یا بھاری ہونا

دریا کنارے سیر کرنے جاتا۔ ایک روز میں اور وہ مصروف تماشا اور کوئی مُخل صحبت
نہ تھا۔ اُس نے شیشہ ساعت[1] نکال کر کوکا[2]۔ حال ساعتوں دن کا دریافت کیا۔ گھڑی
پیش قیمت تھی۔ میں نے یہ بات کہی۔ تم ہندیوں پر بے مروتی اور بے رحمی کا طعنہ
دیتی ہو۔ اگر اس وقت میں تم کو دریا میں ڈال دوں اور گھڑی چھین لوں، تم کیا
کرو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے خوب سمجھ کر تم سے اتحاد کیا۔
اتنی عقل و تمیز رکھتی ہوں کہ جواہر کو پتھر سے جدا کر دوں۔

آٹھ دن کے بعد بمقتضائے ضرورت اس نازنین سے جدا ہو کر جہاز گران
ترک پر سوار ہوا۔ اگرچہ مفارقت اس کی کا سخت قلق تھا مگر چار و ناچار صبر کیا۔ دلت
کو ہوا موافق تھی۔ جہاز چل نکلا اور سریع السیر ہوا۔ بندہ دو تین ہمراہیوں کے ساتھ
اس پر بیٹھا تھا اور لوگ بھی اس میں تھے۔ رات کا کھانا کھا کر باتیں کرنے لگے کسی
نے شراب پی کر کچھ قصور کیا تھا۔ اس کا تذکرہ آیا۔ کوئی کہتا قابل تعزیر ہے۔
کوئی کہتا سزاوار بخشش اس کی تقصیر ہے ایک شخص ظاہر میں بہت متقی اور دیندار
تھا۔ علم رکھتا۔ وہ بھی اس کے حق میں باتیں طرح طرح کی کہتا۔ بندہ خاموش بیٹھا
سنتا تھا۔ کسی کی بی بی خوبصورت اس دیندار صورت کے پاس بیٹھی تھی۔ جب
سب لوگوں کو نیند آئی۔ میں نے بھی اس کی باتیں سنتے سنتے کپڑا منہ پر رکھ کر قصداً اپنے
تئیں نیند میں ڈالا۔ اس مرد دانا نے چپ و راست نظر کر کے بزعم خود سبھوں کو
سوتا پایا۔ دروازہ کمرے کا بند کیا اور اس عورت غیر کی سے مشغول لذات نفسانی ہوا۔
میں نے اپنے دل میں سوچا۔ یہ وہی شخص ہے جو دو گھڑی پیشتر دینداری کی باتیں

[1] ریت گھڑی۔ اس کی شکل یوں ہوتی ہے کہ دونوں طرف شیشے کی دو کپیاں اور بیچ میں ایک نلی جڑی ہوتی ہے
ایک طرف ریت بھری ہوتی ہے جو تھوڑی تھوڑی گرتی رہتی ہے جب گھنٹہ پورا ہوتا ہے تو ساری ریت نکلی
کپی میں آجاتی ہے پھر دوبارہ اس کو الٹ دیتے ہیں [2] لغوی معنے چابی دینا مگر یہاں مراد ہے ریت کو دوسری
کپی میں ڈالا۔

کہتا آپ ہی گناہ میں ڈوبا۔ عجب حال ہے اہل دنیا کا۔ ولایت کے سب سامان اور باتیں اور رسمیں اچھی ہیں۔ مگر بعض رسمیں خلاف آئین ہیں۔ ایک ان میں سے مقدمہ خاوند جورو کا ہے بنظر انصاف دیکھنا چاہیئے کہ مرد بہزار محنت و مشقت وجہ معاش حاصل کرتا ہے۔ حقوق والدین سے کہ ان سے زیادہ حق کسی کا نہیں غافل ہوتا ہے۔ دل و جان سے بی بی کی خاطر داری میں مصروف رہتا ہے۔ سخت حیف ہے کہ وہ بی بی اور سے ملتفت ہوئے۔ ننگ و ناموس شوہر برباد کرے۔ ہزاروں لعنت اس مرد ملعون پر کہ پرائی جورو سے مرتکب مباشرت ہو۔ منہ کالا اس عورت کا کہ غیر مرد سے مشغول لذت ہو۔ یہ رسم اس ملک کی اپنے مزاج کے پسند نہ آئی۔ اس لئے کہ اس میں بہت فساد ہے اور برائی۔

قصہ مختصر بعد چند روز کے لندن میں پہنچ کر قدیمی مکان پر اترا۔ اور شہر کی سیر میں مشغول ہوا۔ لی بیس یہودی ایک کلیسا میں لے گیا۔ وہاں کے عبادت کرنے والوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہیں خدا کے بیٹے بلکہ رسول ہیں خدا کے بھیجے۔ اسی طرح انگریزوں میں کئی مذہب دیکھے۔ بلکہ ہر قوم میں سینکڑوں مذہب ہوئے۔ میں نے خوب غور کیا۔ مذہبوں کا پردہ پایا۔ ہر ایک ہوا و حرص دنیا میں پھنسا ہے۔ مذہب کا نام رکھ لیا ہے۔ عمل اپنے طریقہ پہ کوئی نہیں کرتا ہے۔ آخر بعد تحقیقات کے یہ ثابت ہوا کہ مذہب سلیمانی ہی سب مذہبوں سے اچھا ہے۔ کلیہ اس کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو وحدہ لاشریک جانے۔ جو کچھ معاش محنت مشقت سے پیدا کرے۔ کچھ اپنے خرچ میں لاوے۔ باقی خدا کی راہ میں بانٹ دے۔ خدا نے جہاں میں پیدا کیں اقسام کی نعمتیں۔ بندوں کے لئے ہیں تا کھاویں اور بانٹیں۔ جنت و دوزخ اسی دنیا میں موجود ہیں نہ اور کہیں۔ جس کی عمر رنج و مصیبت میں گذرے اس کو دوزخ ہے یہیں۔ جس کی زندگی چین آرام سے بسر ہوتی ہے۔ اس کو ہے بہشت بریں۔ خدا تعالیٰ

رحیم و کریم ہے۔ عدل و انصاف میں نہیں کوئی اس کا سہیم۔ یہ بات خلاف عدل و داد کے ہے کہ زندگی چند روزہ انسان کے لئے بہشت و دوزخ آباد کرے۔ اس زندگی چند روزہ میں اور مصیبتیں کیا کم ہیں۔ سینکڑوں مکروہات و غم ہیں۔ چڑیا اور جانوروں کو باوصف بے عقلی کے اپنے بچوں سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ اڑ کر دور سے دانہ لا کر کھلاتے ہیں اور اس کو بہر صورت تکلیفوں سے بچاتے ہیں۔ حق تعالیٰ جو ستر درجے ماں باپ سے زیادہ محبت اپنے بندوں سے رکھتا ہے کیونکر عقل میں سماتا ہے کہ دوزخ میں ڈالے گا۔ آدمی زاد جب پیدا ہوا۔ فکر دودھ کا ہوا۔ جب کچھ بڑھا محنت تحصیل ہنروں اور نوشت و خواند میں پڑا۔ جب اس سے فراغت پا کر سن بلوغ کو پہنچا۔ جورو کے پھندے میں پھنسا۔ سب چوکڑی بھولا۔ جبکہ عیال دار ہوا اور زیادہ جکڑ گیا۔ عزیز، قریب والدین سب کو بھولا۔ ماں باپ کے مرنے کا غم طرہ اس پر ہوا۔ جب پچاس برس کا ہوا۔ کوئی بینائی سے معذور ہوتا ہے۔ کوئی کانوں سے نہیں سنتا۔ اس سے زیادہ عذاب اور کیا ہوگا کہ ساری عمر بندے کی مصیبت میں گذری۔ اس کا نام دوزخ ہے۔ خداوند کریم و رحیم نے دوزخ اور کہیں نہیں بنائی کہ اس میں پھر بندوں کو ڈالے۔ خلاصہ مذہب سلیمانی کا یہ ہے سوا اس کے گمراہی ہے۔ ہر ایک مذہب بولے نام ہے۔ جو خدا کی راہ پر خرچ کرتا ہے۔ غریبوں مسکینوں کی پرورش مدنظر رکھتا ہے۔ مردم آزادی سے باز رہتا ہے۔ وہی بندہ مقبول ہے کوئی مذہب رکھتا ہے۔ اے یوسف حلیم یہ قصہ بے پایان ہے۔ زبان کو نہیں تاب بیان ہے۔ سر رشتہ سخن کا توڑ باگ قلم کی طرف مطلب کے موڑ۔

پچیسویں تاریخ دسمبر کی تھی۔ اس روز عید انگریزوں کی ہوئی۔ براون صاحب نے جو کپتان جہاز کے تھے میری دعوت کی۔ بموجب طلب ان کے قریب شام کے

لے: شریک

ان کے مکان پر گیا۔ کتنے صاحبوں اور بی بیوں سے جو شریک دعوت تھے فائز ملاقات ہوا۔ ساری رات عیش و عشرت میں رہا۔ صبح ہی رخصت ہو کر اپنے گھر آیا بعد چند روز کے تین دن تک مثل کہرہ کے ایسا برف پڑتا رہا کہ روز درخشاں رات کی طرح تاریک ہوا۔ کچھ نہ دکھائی دیتا۔ پانی دریائے سرپنٹین کا جم گیا۔ فرش مرمر سپید کا سا نظر آتا۔ زن و مرد لوہے کی جوتیاں پہن کر اس پر دوڑتے پھرتے اس پار سے اس پار آتے جاتے۔ میں نے ایسا ماجرا کبھی نہ دیکھا تھا۔ اچنبھا سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔ آخر یادگاری کے لئے میں بھی کبھی اس پار کبھی اس پار جاتا۔ اس عرصہ میں آگس جنیجہ یعنی خزانہ کے مکان میں آگ لگی۔ جو قریب مکان کمپنی کے تھا۔ لوگ سراسیمہ ہو کر دوڑے۔ آگ بجھانے میں مصروف ہوئے۔ ایک کل پانی کی سامنے لاکر کھڑی کی۔ نل اس کے مقابل آگ کے کئے اور دیر تک گھماتے رہے۔ مگر سبب برودت کے پانی کل کے اندر جم گیا تھا ہرگز رواں نہ ہوا۔ جب بہت لوگوں نے محنت کی۔ کل کے اندر گرمی پہنچائی۔ تب پانی نلوں کے راہ سے بہہ نکلا۔ آگ کو بجھایا لیکن بجھتے بجھتے سارا اسباب جل گیا۔ چند روز بعد کپتان لاڈ صاحب نے میری دعوت کی۔ نہایت مہربانی میرے حال پر فرمائی۔ از راہ عنایت مکان ڈیوک صدر لین بہائی شاہ کا تماشا دکھانے اپنے ساتھ لے گئے۔ عمارت رفیع الشان نقش و نگار بے پایاں نظر آئے۔ کمرے اس کے بہت بڑے تھے دروازے اس کے مکان بادشاہی سے زیادہ اونچے۔ آتش خانے سنگ مرمر کے ترشے عجیب و غریب بنے تھے۔ میں نے باوجود سیاحت کے ویسے کہیں نہیں دیکھے۔ محافظ مکان سے پوچھا کہ ان آتش دانوں کے ساخت میں کیا خرچ ہوا۔ اس نے کہا ایک ایک کے تراشنے میں اسی ہزار روپیہ صرف ہوا۔ اسی بات سے دریافت کیا چاہیئے کہ اور صنعتوں میں کیا لاگت آئی ہوگی۔ جس کے فقط آتشدانوں کے تراشنے

میں اتنی مزدوری اٹھی۔ وہ مکان دیکھ کر بندہ بہت محظوظ ہوا۔

ماہِ جنوری میں ایک دن برنڈن صاحب سے کہ اگلے دنوں میں شاہ اودھ کے نوکر تھے ملاقات ہوئی۔ بہت تپاک سے مل کر اپنے گھر لے جا کر میری ضیافت کی دیر تک دوستانہ باتیں رہیں اور عجائبات اور خوبیان لندن کی بیان ہوئیں۔ بعد اس کے ذکر اس پل کا آیا کہ انگریزوں نے دریائے ٹیمز[ط] کے نیچے بنوایا۔ وہ قریب ان کے مکان کے تھا۔ میں نہایت مشتاق دیکھنے کا ہوا۔ آخر ان کے ساتھ پل دیکھنے چلا۔ وہاں جا کر عجیب حال دیکھا۔ اوپر ایک دریا جس میں جہازوں کا لنگر پڑا ہوا تھا۔ بہتا، نیچے اس کے انگریزوں نے پل بنوایا۔ دو طرفہ اس میں راہ آدمیوں کی بیچ میں گاڑی بگھیوں کی۔ تھوڑے دن پیشتر ایک مقام پر لوٹ گیا تھا۔ پانی اسی طرف سے اندر اس کے ہاتھ آیا تھا۔ ٹنل صاحب جو وہاں کے نگہبان تھے کہنے لگے۔ اگر تم کو خوف نہ آتا ہو تو اس جگہ چلو۔ میں اپنے ساتھ لے چلوں۔ میں نے جواب دیا بسم اللہ میں مستعد ہوں۔ کپڑے اور جوتے موٹے پہنے۔ دس آدمیوں نے پلیتے روشن کر لیے۔ اس مقام پر پہنچ کر دیکھا۔ عجب انداز تھا کہ عقل میں نہ آتا۔ جہاں درز پڑی تھی۔ مرمت جاری تھی۔ پیچوں میں لگا کر اینٹ اس جگہ تک پہنچاتے۔ ایک ایک مزدور چھ روپیہ روزینہ پاتے۔ یہاں اس پل کی تیاری میں چوبیس کروڑ روپیہ خرچ ہوا اور اب تک ہوتا جاتا ہے۔ ایک بازار بھی وہاں بنا چاہتا ہے۔ بعد ان امیروں کے ایک دن خیال آیا جو روپیہ میں زادِ راہ کے لئے لایا تھا۔ بہت خرچ ہوا۔ تھوڑا سا باقی رہا۔ اب مصلحت یہی ہے کہ یہاں سے چل دیجئے۔ جب یہ بھی اٹھ جائے گا۔ نہ رہنے میں لطف ہے نہ جانا بن پڑے گا۔ یہ سوچ کر اٹھارہویں تاریخ جنوری کے روانگی کا عزم مصمم کیا۔ اس وقت سے

ط: ٹیمز (THAMES) انگلستان کا مشہور دریا جو لندن شہر سے گزرتا ہے۔ ح، جگہ

وہاں ہر چیز کو کمال محبت سے دیکھتا تھا اور دل سے کہتا کہ ایک دن وہ ہوگا کہ
دیکھنے ان پریوں اور بازار اور گاڑیوں اور راہوں دلکش اور دوست آشناؤں سے
جدا پڑوں گا جیسے مردے کے لئے سامان تجہیز و تکفین کا کرتے ہیں۔ اپنے سامان سفر میں
مستعد تھا اور خشکی کی راہ سے ارادہ سفر کا کیا۔ بوچڑ صاحب اور دوستوں نے راہ دریا
سے چلنے کو کہا۔ مگر میں نے کہا۔ دیکھی ہوئی راہ کیا فائدہ پھر دیکھنا۔

۵

سوئے وطن

آخر اٹھارویں جنوری کی خشکی کی راہ سے اور اسباب بھاری اپنا بوچڑ صاحب کو سونپا کہ کسی کے جہاز پر رکھ کر ہندوستان میں میرے پاس بھیج دینا۔ اسباب ضروری ایک پٹاری چرمی میں رکھ کر اپنے ساتھ لیا۔ ایک جام شراب وین دوستوں کے ساتھ پی کر گاڑی میل کوچ پر سوار ہوا۔ وقت روانگی بوچڑ صاحب راچر صاحب اور کٹی دوست افسوس کھا کر رنجِ جدائی سے رونے لگے۔ میں بھی وہاں سے چلتے وقت ایسا ملول ہوا جیسے حضرت آدمؑ نکلے۔ چونکہ ملتے ملاتے دوستوں سے رخصت ہوتے، مجھ کو دیر ہوئی۔ گاڑی میل کوچ آدمیوں سے بھر گئی۔ کہیں جگہ باقی نہ رہی۔ ناچار کوچوان کے پاس بیٹھا۔ مگر دل پر مفارقت دوستوں کا قلق تھا۔ برف ایسا برستا کہ تمام راہ میں میری ڈاڑھی مونچھ پر جم گیا۔ ڈیڑھ پہر رات گئے کر کوزانڈر میں پہنچا۔ وہ مقام لندن سے چوبیس کوس تھا۔ وہاں سے ایک مزدور نے میرا اسباب میل کوچ سے اتار کر اپنی گاڑی پر رکھ کر مجھ کو ساتھ لیکر سرائے فلکن میں پہنچایا۔ میرے نوکر نے کہا کیا کیا کھانا لاؤں۔ میں نے کہا سردی مارا برف کا ستایا ہوں، آتش پرستی کروں گا۔ پہلے آگ لا۔ اس کے پاس بیٹھ کر تاپوں گا۔ اُس نے آتشدان میں آگ جلائی۔ قریب اس کے بیٹھ کر ایسی مجھ کو آرام آئی کہ آگ مجھ کو مثل آتش پرست عزیز ہوگئی۔ ہر شخص گاڑی سے اتر کر خوشی میں مشغول

ہوا۔ مگر میں مفارقت دوستوں اور شہر جنت نشان سے رنجیدہ اور چپ بیٹھا تھا۔ ایک شخص جبالڑ کو اپنی نوکری پر جاتا تھا، مجھ کو رنجیدہ دیکھ کر قریب آ بیٹھا۔ ہنگامۂ صحبت گرم کیا۔ میں نے اس کی میٹھی باتیں سن کر غم کو دل سے مٹا دیا۔ اس کے ساتھ شراب شیریں دوستوں کو یاد کر کے پی اور ان کے حق میں دعا دی۔ پھر وہاں سے شہر لندن کی محبت سے دل اٹھایا۔ دو پہر رات کو دھویں کے جہاز پر سوار ہوا، نام اس کا مکس تھا۔ حال جہاز والوں کا بسبب برف کے متغیر ہوا۔ برف سطح جہاز پر چار چار انگل جم گیا۔ رسیاں جہاز کی برف جمیں ٹکڑا بلور کا معلوم ہوتیں۔ یہاں تک کہ صبح ہی جہاز جزیرہ فال مت میں پہنچا۔ چاروں طرف اس کے پہاڑ تھا۔ وہاں طوفان جہاز کو آفت نہیں پہنچاتا ہے مگر بغیر ہوائے موافق کے جہاز وں سے نہیں ہلتا ہے۔ پہاڑوں پر سبزی تھی، دل کو اس سے راحت آتی۔ رستے بازار کے لطیف تمام تھے۔ آدمی خوبصورت و خوش کلام تھے۔ وہاں سے لاڈ بنکم صاحب معہ اپنی میم صاحب کے اور ولیم سیڈ صاحب اور کٹی صاحب معہ بی بیوں اپنی کے سوار جہاز پر ہوئے۔ جہاز مصر کی طرف چلا۔ بعد دو ایک دن کے ایک شہر میں پہنچا، نام اسکا دیگو تھا۔ حاکم وہاں کو اسپانیل تھے۔ وہ بھی ہیں قوم انگریزوں سے، جہاز اس جزیرہ میں خط پہنچانے کے لئے ٹھہرا۔ خطوں کو اس طرف ایک چھوٹی ناؤ پر لاد کر روانہ کیا۔ بندہ بھی اس شہر کی سیر کو اس پر سوار ہو کر کنارے اترا۔ شہر دیکھا پر سبزہ گلہائے خنداں۔ مگر بسبب بے انتظامی اور لڑائی بھڑائی کے ویران۔ ایک قلعہ پرانا تھا۔ ٹوٹا پھوٹا ہوا۔ توپوں کو کھود کر زمین میں گاڑا۔ مجھ کو دیکھنے ویرانے ملک اور بے سامانی سپاہ سے لکھنؤ یاد آیا۔ دائیں بائیں پھر اور رنڈیوں حسین کو دیکھا۔ کمر ان کی مانند چیتے کی کمر کے تھی۔ آنکھیں ان کی ہرن کی سی تھی۔ دل اگرچہ صورت دیکھنے ان کی سے نہ بھرا مگر خیال روانگی جہاز کا آیا کہ مبادا جہاز رواں ہوئے۔ اسی سوچ میں تھا کہ جہاز کی توپ کا دھما کا کان تک پہنچا۔ یہ دستور ہے

کہ جب جہاز کا لنگر کھولتے ہیں۔ لوگوں کی اطلاع کے واسطے توپ چھوڑتے ہیں۔ تاکہ جو کوئی کہیں گیا ہو جلدی سے چلا آئے۔ اپنے تئیں جہاز پر پہنچائے توپ کی آواز سنتے ہی گرتے پڑتے میں جہاز پر آیا۔ جہاز وہاں سے چل نکلا۔

رات کو طوفان آیا۔ ہوائے مخالف کا غلبہ ہوا۔ مگر جہاز تباہی سے بچ کر بخیریت رواں تھا۔ مجھ کو خیال زندگی کا آیا کہ اسی طرح جہاز عمر بہا جاتا ہے۔ ستائیسویں جنوری ۱۸۳۸ء عیسوی کو شہر لزبن[1] میں پہنچا۔ وہ ہی دار السلطنت پرتگیزوں کا۔ وہاں جہاز تھے اور بھی کئی ایک ڈونگی[3] پرتگیزوں کی ہمارے جہاز کو راہ بتانے آئی۔ لزبن کنارے دریا ٹیگس[2] کے ہے۔ داہنی طرف اس کے شہر اور پہاڑ جانب چپ کے ہے۔ ڈونگی پرتگیزی اس لئے راہنمائی جہاز کو مقرر تھی کہ اس دریا میں کہیں پانی تھوڑا کہیں اندازہ سے بیشتر۔ جب جہاز ہمارا وہاں پہنچا۔ ہوا کا زور تھا مگر استادی کپتان سے جہاز سلامت رہا۔ ہمارے کپتان اور ناخدائے پرتگیز سے کسی بات پر تکرار ہوئی، یہ تو ڈم ڈم کہتے۔ اکثر طرف ثانی کہتا فورٹ فورٹ پہلے پرمٹ کی جگہ نظر آئی۔ وہ ایک میدان چٹانوں پتھر سے برابر تھا۔ اس میں ایک گھوڑا مع سوار کے پتھر سے تراشا کھڑا کیا۔ نیوٹن صاحب سوداگر میرے دوست تھے۔ وہ اس شہر میں تشریف رکھتے۔ جب میرے آنے کی خبر پائی۔ بہت تکلف سے دعوت میری کی کئی طرح کا کھانا میرے لئے پکوایا۔ جب اس کو کھایا۔ دل کو بھایا پھر سیر شہر کو چلا۔ وہاں کے آدمیوں کو کج اخلاق پایا۔ حسن و جمال عورتوں کا نسبت لندن کم تھا۔ باربرداری کی گاڑیوں میں بیل لگے تھے۔ رستے بازار کے صاف ستھرے تھے مگر دکانیں بمقابلہ لندن و فرانس کے بدقرینے۔ ایک کلیسا عجیب وضع کا بنا تھا۔ تصویریں حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ اور حواریوں کی نفیس بنے ہوئی رکھیں۔ اُن پر

---

[1] لزبن (LISBON) پرتگال کا دار الحکومت اور بڑا شہر ہے

[2] ٹاگس [3] چھوٹی کشتی

کام سونے کا۔ دو تین باغ دیکھے۔ بہت اچھے تھے۔ حاکم اور فرمان روا وہاں کے مثل لندن ایک رنڈی کم سن تھی۔ تناسب اعضا۔ اور جمال بدنی نہیں رکھتی بلکہ فربہ اور جسیم تھی۔ کنارے دریا کے ایک مکان بنوائی۔ وہ نہایت خوش قطع اور نادر تھا۔ بسبب کمی روپے کے ان دنوں بننا اس کا موقوف تھا۔ یوہنے اس کو خوب دیکھا ایک دن ناچ گھر کا تماشا دیکھنے گیا۔ شہزادی حاکمہ بھی آئی میرے قریب بیٹھی۔ شوہر اس کا ایک امیرزادہ بہت خوبصورت اور وجیہہ ہمراہ تھا۔ سن و سال میں بیس برس کا۔ بندہ آدھی رات تک کیفیت دیکھتا رہا۔ پھر اٹھ کر باہر آیا اور ملاح سے کہا کہ ناؤ پر سوار کر کے مجھ کو جہاز تک پہنچا دے اس نے انکار کر کے کہا کہ رات کو ہمارے شہر میں کسی کو ناؤ پر نہیں چڑھاتے۔

اکبارگی مینہ بھی برسنے لگا۔ تب میں مجبور ہو کر سرا میں شب باش ہوا۔ صبح ہی اٹھ کر پھر سیر کو چلا۔ مکانات دیکھے۔ اوندھے پڑے۔ حال ان کا پوچھا لوگوں نے کہا اسی برس کا عرصہ ہوا کہ یہاں ایک بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ساٹھ ہزار آدمی اس میں مر گئے۔ بہت مکان اس میں گر گئے۔ پانی دریا کا اپنے ٹھکانے سے ہٹ گیا تھا بعد اس کے اس آبادی کا جو تم دیکھتے ہو۔ اتفاق ہوا۔ یہ حال دیکھ کر گھر آیا۔ دوسرے دن تیسرے پہر تک پھر سیر کرتا رہا۔ بعد اس کے جہاز وہاں سے رواں ہوا۔ میں اس پر سوار ہوا۔ کتنے صاحب اور بی بیاں اور بھی تھیں۔ بی بی اسمٹ بھی مع دونوں بیٹیوں پری زاد کے اس پر سوار ہوئیں۔ حرکت جہاز سے دونوں پریاں متلی اور ابکائی میں گرفتار ہوئیں۔ جہاز پر چڑھ کر نہایت بیزار ہوئیں۔ سچ ہے۔ سواری جہاز کی عورتوں کو بہت ایذا دیتی ہے۔ مجھ کو ان کی بے چینی سے بیقراری تھی۔ دو تین دن میں جہاز جاتے جاتے تیسرے پہر کو قریب شہر کندس کے ٹھہرا۔ کئی اسپانیول کشتیوں کو ہمارے جہاز پاس پہنچایا۔ اکثر صاحب واسطے سیر شہر کے ناؤ پر سوار ہوئے۔ ہم بھی مدت سے مشتاق اس شہر کے دیکھنے کے تھے ساؤ پر چڑھے۔ بعد اس کے مینہ آیا۔ ہر شخص جہاز

پر پھر گئی مگر بندہ ناؤ پر بیٹھا رہا۔ اسپانیل جو ملاح تھے اپنی زبان میں باہم کچھ باتیں کرتے اور میرے منہ کی طرف دیکھتے، بلا تحاشا ناؤ کو کنارے لئے جاتے۔ ہر چند میں نے کنارے جانے سے انکار کیا پر انہوں نے میری بات نہ سنی۔ ظاہر معلوم ہوتا کہ کنارے جا کر گھڑی اور اسباب طلائی میرا چھین لیتے اور جان سے ہلاک کرتے۔ ناگاہ جہاز کے چھوٹے کپتان نے میرے حال پر رحم کیا۔ چھوٹی ناؤ پر سوار ہو کر میری ناؤ کو خار آہنی سے اپنی طرف کھینچ کر جہاز پر پہنچایا اور اس آفت سے مجھ کو بچایا۔ بسبب بینز کے اس شہر میں جانے کا اتفاق نہ پڑا مگر سامنے سے بخوبی نظر آیا۔ عمارت عالیشان وہاں حسن و جمال کی کان تھی۔ لارڈ بیرن[1] شاعر نے وہاں کے حسن کی تعریف کی ہے۔ داد سخنوری دی ہے۔

اکیسویں تاریخ جنوری ۱۸۳۸ عیسوی کے دو گھڑی رات رہے ہیں۔ جاگا۔ جہاز کے قریب بڑا سا پہاڑ نظر آیا۔ میں متحیر ہوا کہ یہ پہاڑ کہاں سے آیا۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ یہی ہے قلعہ جبالٹر کا۔ یہ شہر سابقہ ترک کے عمل میں تھا۔ جبالٹر مخفف ہے جبال طائر کا۔ طائر نام حاکم کا تھا۔ یہ قلعہ اسی کے نام پر مشہور ہوا۔ پس جبال طائر کہلایا۔ اب بسبب کثرت استعمال کے جبرالٹر[2] نام پڑ گیا۔ ترک سے انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ جب جہاز وہاں پہنچا سب لوگ ناؤ پر سوار ہوئے۔ قلعہ کی سیر کو چلے بی بی آکٹ کی دو بیٹیاں بھی اتریں۔ میں نے ان سے کیفیتیں جہاز کی پوچھیں۔ انہوں نے کہا ہم نے توبہ کی کہ پھر جہاز پر سوار نہ ہوں۔ کبھی قلعہ کے دروازہ پر ایک چوکیدار بیٹھا تھا۔ سب کو اندر جانے دیا مگر مجھ کو روکا۔ اس وجہ سے کہ میں پروانہ سند نہ رکھتا۔ میں نے

ص۱: لارڈ بائرن (GEORGE GORDON BYRON) انگریزی کا مشہور رومانی شاعر

ص۲: مصنف کی یہ معلومات غلط ہیں۔ حقیقت میں جبرالٹر (GIBRALTAR) عربی کا پرانا نام "جبل الطارق" اس مناسبت سے ہے۔ کہ اسے ۱۱-۱۲ء عیسوی میں مشہور مسلمان سپہ سالار طارق بن زیاد نے فتح کیا تھا۔

کہا اپنی خوشی سے تیرے پاس بیٹھا ہوں۔ کہیں نہیں جاتا ہوں۔ مگر میرے کھانے پینے کی فکر کر۔ بعد دو گھڑی کے ایک انگریز آیا۔ میری وضع سے حال لیاقت دریافت کر کے دلاسا دینے لگا۔ اور ایک بلند کرسی پر بٹھا کر کہا۔ تم کچھ رنج اور فکر نہ کرو۔ میں حاضر ہوں تمہاری خدمت گاری کو۔ ناگاہ پرنگل صاحب میرے دوست نظر آئے۔ ولایت سے ہندوستان آتے تھے۔ مجھ کو اس حال میں دیکھ کر تسلی دینے لگے کہ ہم جاتے ہیں۔ تمہاری تدبیر کے لئے۔ یہ کہہ کر وہاں کے حاکم کے پاس گئے میرے لئے پروانہ لکھوا کر چھڑا لائے اور سرا میں اپنے مقام پر لے گئے۔ تعریف مہربانی انگریزوں کی کیا کروں۔ یارائے زبان نہیں رکھتا ہوں۔ پرنگل صاحب اور مجھ سے فقط شناسائی تھی نہ ربط۔ اتحاد و فرط دوستی، پاس شناسائی سے انہوں نے مجھ کو چھڑایا۔ ہندوستان میں ایسی محبت اپنے ہم جنسوں سے کوئی نہیں کرتا۔ میں جب تک دم میں دم رکھتا ہوں گا۔ دم شکر گزاری ان کا بھرتا ہوں۔ قلعہ جبالٹر کا یہ حال دیکھا کہ توپ کے گولوں کا انبار تھا۔ ہر چہار طرف اس کے توپیں لگیں۔ آدمی مقرر ہیں چوکی پہرے کے تئیں۔ گرد قلعہ کے پہاڑ ہیں۔ ان کے گرد دریائے قہار، دریا میں چاروں طرف جہاز جنگی حفاظت کے لئے رہتے ہیں۔ مستعد اور تیار۔ بلندی قلعہ کی چودہ سو فٹ کی۔ ایک مکان اور اس کے سوا کے ہے۔ اس کے گرد بھی توپیں ہیں۔ اونچائی اس کی گیارہ سو پچیس فٹ کی ہے اس پر سے جہاز بتیس کوس کے مفاصلے کے نظر آتے ہیں۔ پہاڑ میں بڑے بڑے غار ہیں۔ انگریزوں نے اسے تراش کر عمارت سنگی بنائی ہے استوار۔ اس میں لوہے کی گاڑیوں پیچدار پر توپیں لگائی ہیں۔ جدھر کل گاڑی کی پھیرتے ہیں۔ منہ توپ کا بھی ادھر پھر جاتا ہے۔ سوا ان کے اور بھی توپیں ہیں چاروں طرف پہاڑ کے سمندر ہے مگر ایک طرف سوکھی راہگذر ہے ادھر سے قریب شہر اسپانیل ہے۔ وہاں سے باؤ کوس پر عمل اسپانیل کا ہے جب چاہتے ہیں اس راہ خشک کر بھی

پانی نا کر بند کر دیتے ہیں۔ کسی غیر قوم آدمی کو رات کے رہنے کا وہاں حکم نہیں دن کو اسپانیل یہاں کی سیر کر جاتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے بھی عمل اسپانیل میں کھیتی کرتے ہیں۔ دن ہی کو چلے آتے ہیں۔ لارڈ دنکم صاحب حسب اتفاق ان دنوں اس قلعہ میں آیا تھا۔ قلعہ دار رسم مہمان داری میں بہ دل وجان مصروف ہوا۔ قواعد پلٹون نمبر تینتیس ۳۳۔ چھیالیس ۴۶۔ باون ۵۲۔ اکیاسی ۸۱۔ بیاسی ۸۲ کی دکھلائی۔ لارڈ صاحب نے قواعد دیکھ بہت خوش ہو کر عنایت مبذول فرمائی۔ جو مسافر وہاں پہنچے چاہیے کہ ضرور اس قلعہ کو دیکھے۔ اگر بارہ لاکھ آدمی اس پر حملہ کریں میری عقل ناقص میں یہ ہے کہ ہرگز فتح یاب نہ ہوئیں بلکہ سابق اسپانیل و فرانسیس اور پرتگیز نے مل کر اس کو گھیرا تھا دو تین برس تک لڑتے رہے مگر فتح یاب نہ ہوئے۔ آخر نا امید پھر گئے۔ غرض کہ ایسا قلعہ مستحکم روئے زمین میں کہیں نہیں ہے۔ ہم نے کرایہ جہاز کا لوزاند سے جبالٹر تک ایک سو اسی روپے دیئے۔ وہاں سے اسپٹ فایر جہاز پر سوار ہو کر تیسری فروری کو آگے چلے۔ کرایہ جہاز کا جبرالٹر سے مالٹا تک کا ایک سو تیس روپے ٹھہرے۔

وقت روانگی جہاز کے دو تین عورتیں اسپین کی نظر آئیں۔ جمال میں غیرت مہر تاباں تھیں۔ دل میرے سے بے اختیار شور اٹھا کہ پھر ان کا دیکھنا کاہے کو میسر آوے گا۔ راہ میں جہاز پر سے پہاڑ اسپین کے نظر آتے۔ زیادتی برف باری سے سپید ہوئے تھے۔ چوتھی فروری کو جہاز ہمارا شہر الجزکے کہ کوہستان ہے پہنچا۔ سابق وہ عمل عرب میں تھا۔ اہل عرب زمانہ حکومت اپنی میں جہازوں کو لوٹتے۔ آدمیوں کو جان سے مار ڈالتے۔ جو کوئی زندہ رہتا اس کو غلام بنا کر زندگی بھر نہ چھوڑتے۔ اس سبب سے جہاز اس راہ سے نہ جاتے۔ اسی خیال سے فرانسیس اس شہر کو اپنے قبض و تصرف میں لائے اب جہاز اس راہ سے بخیریت جاتا ہے۔ کوئی مزاحمت نہیں پہنچاتا ہے۔ ساتویں فروری کو جہاز قریب اس قلعہ کے پہنچا کہ ڈنڈرما نام رکھتا۔ خوب مضبوط بنا اس کے برابر ایک

شہر لیبا۔ جھول نام بہت آباد عرب میں تھا۔ اس سے ایک شہر بطافت بنیاد خوب آباد تونس نام رکھتا۔ چند روز پیشتر وہاں عربوں سے لڑتے تھے۔ دونوں طرف سے ہزاروں آدمی کام آئے۔ سوا اس کے اور شہر بہتیرے دیکھے کہ بہت آباد اور عرب کے عمل میں تھے۔ اس کے بعد شہر جبش اور اٹلے اور اٹنا پہاڑ نظر آیا۔ اس سے شعلہ آگ کا نکلتا۔ مگر بسبب دوری اور تاریکی ابر غلیظ کے دھوئیں کی صورت دکھائی دیتا۔ آٹھویں فروری ۱۸۳۸ء کو ڈیڑھ پہر رات گئے مالٹا میں پہنچا۔ جہاز سے اترا۔ دوسرا جہاز ملینر نام اسکندریہ تک ایک سو بیس روپے کرایہ پر ٹھہرا کر اسباب اپنا اس پر لے گیا۔ اس وقت سب صاحبان عالیشان نے میری سفارش کی۔ چٹھی کرنیل لو صاحب ریذیڈنٹ لکھنؤ کے نام پر لکھ کر مرحمت فرمائی۔ لارڈ دنکم صاحب نے بھی چٹھی میں بہت طرح سے وسعی کی۔ ان صاحبوں کی خوبیوں کو میں بیان نہیں کر سکتا ہوں کہ مجھ مسافر پر کیا کیا عنایت فرمائی۔ میں ملینر جہاز کے کپتان سے دوپہر کی رخصت لے کر مالٹا کی سیر کرنے چلا۔ کپتان صاحب نے مجھ سے چلتے وقت کہا کہ اگر تم کو آنے میں عرصہ کھنچے گا جہاز روانہ ہووے گا۔ تم کو یہیں رہنا پڑے گا۔ میں ڈرتے ڈرتے سیر کو گیا۔ شہر دیکھا آباد۔ خجستہ بنیاد فرش بازار سنگ مرمر سے بنا۔ دو طرفہ میوہ فروشوں کی دوکان پر میوہ چنا۔ زیادتی میوہ جات سے بازار باغ معلوم ہوتا۔ دیکھتے دیکھتے کلیسائے سنٹ جان تک پہنچا۔ وہ بہت قدیم رومن کا بنایا ہوا تھا۔ عمارت اس کی بلند۔ کنگرے فلک پیوند۔ تصویریں حواریوں وغیرہ کی رکھیں۔ بندگی کے لئے کھڑے تھے صاحبان دین دوسری طرف اور ایک مکان میں گیا۔ وہاں پادریوں نے ترک دنیا کر کے رہنا اختیار کیا گوشۂ تنہائی میں تجرد سے موافقت کر کے تعلقات دنیا سے ہاتھ اٹھایا۔ ان کے معتقد اور مرید کھانا

اسکندریہ (ALEXANDRIA) شمالی مصر میں بحیرہ روم کی بندرگاہ جس کا سنگ بنیاد ۳۳۲ قبل مسیح میں سکندر مقدونی نے رکھا تھا اور اسی کے نام پر یہ شہر مشہور رہا۔ نہر سویز بن جانے کے بعد یہ مصر کا اہم تجارتی شہر بن گیا ہے۔

بھیجتے ہیں اور غذائے نفیس ان کو کھلاتے ہیں۔ دنیا دار دل سے ان کو زیادہ موٹا اور فربہ پایا۔ سمجھا کہ گوشت کا بیٹھا محض کھانوں لطیف اور زیادہ معتقدوں کے لئے ہمارا ان سے یہ حرکت بد نظر آئی۔ ماں باپ نے کس محنتوں سے انکی پرورش کی۔ اس خیال سے کہ بڑھاپے میں ہمارے کام آویں۔ افسوس کہ وہ جوان ہو کر اس سعادت سے باز رہیں بلکہ آپ اوروں کے ٹکڑوں پر نظر لگاویں۔ میرے نزدیک بہتر وہ شخص ہے کہ باوجود تعلق دنیوی اور بار عیال و اطفال کے فکر عاقبت سے غافل نہ ہو سوائے اپنی جورو کے اور کسی عورت پر مائل نہ ہو۔ عذاب خدا تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتا رہے۔ حتی الامکان بندگان خدا سے نیکی کرتا رہے۔ درحقیقت وہ پادری گوشہ نشین مانند سانڈوں بنارس کے نظر آتے۔ بے محنت بار برداری کے دانہ گھاس غیروں کا کھا کر موٹے ہوتے ہیں بعد اس کے اور تین مکانوں عالیشان کی سیر کی عمارت ان کی پسند طبیعت آئی۔ پھر وہاں اس سرا میں کہ لارڈ منکم صاحب تشریف رکھتے تھے۔ گیا۔ ان سے اور ان کی بی بی سے رخصت چاہنے والا ہوا۔ دونوں صاحبوں نے اس فقیر کو شراب پلائی۔ جدائی میری سے رنجش خاطر بہم پہنچائی۔ مجھ کو بھی رقت آئی اس لئے کہ جہاز پر ہر روز لارڈ صاحب اور بی بی ان کی شراب وین پلاتی تھیں اور باتوں عنایت آمیز سے دل میرا خوش فرماتی تھیں۔ خدا ان کو آفات زمانہ سے بچائے اور ہمیشہ روز عیش و عشرت دکھلاوے۔

ناگاہ آواز توپ جہاز کی کان میں آئی۔ دانا مندوں نے روانگی جہاز کی خبر پائی۔ بندہ مضطرب ہو کر لارڈ صاحب کے پاس سے اٹھ کر کنارے دریا کے آیا۔ لنگر جہاز کا کھلا دیکھا اور قریب روانگی کے تھے۔ ایک اور جہاز جنگی ایشیہ نام وہیں قیام رکھتا۔ نول صاحب کپتان وکے نے مجھ کو بڑے اصرار سے اپنے جہاز پر بلایا

اور اس کا تماشا دکھلایا۔ چوراسی ضرب توپ اس میں لگیں۔ جہاز مضبوطی میں جوں قلعہ آہنیں۔ از انجا کہ ہمارا جہاز آمادہ روانگی تھا۔ زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ جانا۔ ایک دو کلمہ کہہ سن کر اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ کپتان نے کہا اگر تم آنے میں ایک لحظہ دیر کرتے۔ جہاز روانہ ہوتا۔ تم ہرگز ہم تک نہ پہنچتے۔ بمانند یا در لیں سائل نان طلب کے یہیں اوقات گذاری کرتے۔ بندہ درگاہ الٰہی میں شکر بجا لایا اور جہاز پر سوار ہو کر آگے چلا۔

٦

مصر

تیرہویں تاریخ فروری ۱۸۳۸ء عیسوی کے جہاز ہمارا شہر اسکندریہ میں پہنچا۔
جہاز سے اتر کر معہ دوست و احباب روانہ شہر ہوا۔ کنارے دریا کے لڑکے عرب
کے گدھے کرائے کے لئے کھڑے ہوئے تھے ہر وضیع و شریف کو ان پر سوار کر کے
جاتے۔ ہر چند ابتدا میں اس سواری سے نفرت ہوئی، لیکن بموجب ہر ملکے و ہر رسمے
کے آخر ہم نے بھی گدھوں کی سواری کی اور سرا کی راہ لی۔ گلی کوچے تنگ اور راہی
بہت تھے۔ اس لئے لڑکے گدھے والے آگے بچاتے۔ بچو بچو لیشی لیشی پکارتے
لوگوں کو آگے سے ہٹاتے نہیں تو گذرنا اس راہ سے دشوار تھا۔ بندہ راہ بھر
اس شہر کا تماشا دیکھتا چلا۔ کنارے شہر کے محمد علی شاہ مصر کے دو تین مکان بنائے
ہوئے نظر آئے۔ ایک قلعہ قدیمی تھا وہیں اس میں توپیں ناقص از کار رفتہ
پڑی۔ محمد علی شاہ بادشاہ مصر کا ہے، بہتر برس کی عمر رکھتا ہے، بہت صاحب
تدبیر و انتظام ہے۔ جہاز جنگی اس کے بہ استحکام و صفائی اور سب باتوں میں مثل
جہاز انگریزی، مگر افسروں جہاز کی پوشاک نفاست میں بہ نسبت جہازیوں انگریزی
کے کم تھی۔ عقل شاہ مصر پر صد ہزار آفریں کہ ایسی باتیں رواج دیں۔ غرضیکہ دیکھتا بھالتا
گدھے پر سوار سرا میں پہنچا۔ اسباب اتارا۔ پھر سیر کرنے کنارے دریا کے آیا۔ کپتان طریز
جہاز کے سے ملاقات ہوئی۔ اس نے نہایت اشتیاق سے یہ بات فرمائی کہ آدمیں

نے ذکر تمہارا یہاں کے بڑے صاحب سے کیا ہے اور تمہاری تلاش میں تھا۔ بندہ
بپاس خاطر ان کی ہمراہ ہو کر بڑے صاحب کی ملاقات کو گیا۔ بڑے صاحب اور میم ان
کی نے نہایت عنایت فرمائی اور وقت شام کے دعوت کی۔ بندے نے قبول کر کے
مان لی۔ بعد اس کے صاحب موصوف سے یہ عرض عرض کی کہ میں ارادہ رکھتا ہوں
یہاں کے مکانوں اور عجائبات کو دیکھوں کوئی آدمی ہوشیار اپنا میرے ساتھ کیجئے
کہ ایسے مکانات اور اشیائے عجیب مجھ کو دکھلا دے۔ انہوں نے ایک آدمی رفیق
اپنا میرے ساتھ کیا۔ نام اس کا مصطفےٰ تھا کہ یہ شخص اچھی طرح سے سب مکان تم
کو دکھلائے گا۔ میں نے مصطفےٰ کے ساتھ باہر آ کر پوچھا۔ وطن تیرا کہاں ہے اور نام
تیرا کیا۔ اس نے کہا وطن میرا حبش ہے اور نام مصطفےٰ ہندی۔ زبان میں بات کی مجھے
حیرت تھی کہ رہنے والا حبش کا ہے اردو زبان کیونکر جانتا ہے۔ پھر اس نے چٹھی
نیکنامی اپنی کی دکھائی۔ اس میں تعریف چستی اور چالاکی اس کی لکھی تھی کہ یہ شخص
بہت کاردان[ل] اور دانا ہے۔ ساتھ ہمارے ہندوستان۔ ایران۔ توران۔
انگلستان۔ فرانسیس میں پھرا ہے۔ میں نے چٹھی دیکھ کر اس سے حال لندن کا
پوچھا کہ آیا وہ شہر تجھ کو کچھ بھایا۔ کہا وصف اس کا ہرگز نہیں قابل بیان ہے فی الواقعی
وہ ملک پرستان ہے۔ جن کا میں نوکر تھا۔ انہوں نے لندن میں تین ہزار روپے
مجھ کو دیئے تھے۔ میں نے سب پریزادوں کی صحبت میں صرف کئے یہ سن کر ہم
سب ہنسے اور اس کے ساتھ باہر آئے۔ وہ باہر نکل کر دوڑا۔ غریب بچوں کو جو گدھے
کرائے کے اپنے ساتھ رکھتے۔ دو چار لاتیں لگا کر اپنے ساتھ معہ تین گدھوں تیز قدم
کے لایا۔ مجھ کو اور ہیڈ صاحب اور پرنگل صاحب کو ان پر سوار کر کے چلا اور گدھوں
کو ہانک کر دوڑایا۔ اتنے میں ہیڈ صاحب کا گدھا ٹھوکر کھا کر گرا اور ہیڈ صاحب کو
گرایا۔ وہ بیچارے گر کر بہت نادم اور شرمندہ ہوئے۔ مصطفےٰ نے دو تین کوڑے اس

[ل]: تجربہ کار و واقف کار۔

گدھے والے کو مارے۔ وہ بلبلا کر زمین پر گرا۔ زمین کا چہلا[1] اچھل کر ہیڈ صاحب کے کپڑوں پر پڑا۔ وہ بہت ناخوش ہوئے اور جس سرا میں اترے تھے پھر گئے۔ میں نے مصطفیٰ سے کہا اس قدر ظلم و بدعت بے جا ہے۔ کہا قوم عرب بدذات اور شریر ہوتے ہیں۔ بغیر تنبیہ کے راستی پر نہیں آتے۔ میں نے کہا تم بھی اسی قوم سے ہو۔ انہیں کی سی خلقت رکھتے ہو۔ جواب دیا۔ اگرچہ وطن میرا بھی یہی ہے مگر میں نے اور شہروں میں رہ کر خوبیاں کی سر سے دور کی ہے۔ پھر میں نے مصطفیٰ سے کہا میرا قصد ہے حمام میں نہانے کا۔ وہ ایک حمام میں لے گیا۔ اندر اس کے حوض بھرا پانی کا تھا۔ راہ فواروں سے پانی بہتا۔ کئی ترک کنارہ اس کے بیٹھے لطف کر رہے تھے۔ کوئی قہوہ کوئی چپک[2] پیتا۔ بندہ نے موافق قاعدہ مقرر کے وہاں جا کر کپڑے نکالے۔ پانچ چھ حمامی مالش بدن میں مشغول ہوئے۔ اپنی زبان میں کچھ گاتے جاتے۔ مگر مضامین اس کے میری سمجھ میں نہ آتے۔ جب وہ ہنستے میں بھی ہنستا۔ جب وہ چپ رہتے میں بھی چپ رہتا۔ میں نے کہا مصطفیٰ سے کہ ان سے کہہ دے موافق رسم اس ملک کے بدن ملیں۔ کسی طرح سے کمی نہ کریں۔ ان رسموں سے مجھ کو پرہیز نہیں۔ مذہب سلیمانی میں ہر امر موقوف ہے ایک وقت کا۔ ایک وقت وہ ہوا کہ میں جہاز میں میلا کچیلا تھا۔ ایک وقت یہ ہے کہ نہا رہا ہوں۔ میں ان کو راضی کر دوں گا۔ خوب سا انعام دوں گا۔ انہوں نے بموجب کہنے کے بدن خوب سا ملا اور اچھی طرح نہلایا۔ بعد فراغت کے ایک اور مکان میں لے گیا۔ اس میں فرش صاف تھا۔ گرد اس کے تکئے لگے اس پر بٹھلا کر پوشاک پہنائی۔ مجھ کو اس سے راحت آئی۔ بعد ایک دم کے تین لڑکے خوبصورت کشتیاں ہاتھ میں لے کر آئے۔ ایک میں قہوہ۔ دوسرے میں شربت۔ تیسرے میں قلیاں چپک

ح ۱: پوربی زبان میں دلدل یا کیچڑ کو کہتے ہیں۔ "صاحب فرہنگ جہانگیری" نے چہلہ مگر زبان زدِ عوام چہلا لکھا ہے۔ ح ۲: حقہ

رکھ لائے۔ فقیر نے شربت اور قہوہ پیا۔ حقہ چپک کا دم کھینچا۔ پھر ایک خوشبو مانند عطر کے مانگ کر لگائی۔ بتیاں اگر وغیرہ کی جلائیں۔ حمام کیا بجائے خود ایک بہشت تھا۔ دل میں خیال آیا۔ اگر شاہد شیریں ادا غمزدہ ہو۔ یہ مقام غیرت دہ روضۂ رضوان کا ہو۔ دو گھڑی وہاں ٹھہرا۔ پھر باہر نکل کر کئی روپے حمامیوں کو دے کر بڑے صاحب کے مکان پر آیا۔ نام ان کا ٹن بن صاحب تھا۔ کپتان صاحب جنہوں نے میری تقریب کی تھی۔ وہ بھی موجود تھے۔ جابجا کی باتیں اور ذکر رہے۔ بعد اس کے میں نے ٹن بن صاحب سے پوچھا کہ یہاں افسران فوج سے تمہاری ملاقات ہے یا نہ۔ انہوں نے کہا۔ آگے مجھ سے ان سے بہت دوستی تھی۔ مگر ان کی حرکتوں سے طبیعت کو نفرت ہوئی۔ اس واسطے ان سے ملاقات ترک کی۔ اکثر وہ لوگ میرے مکان پر آکر شراب برانڈی پیتے اور چپک کے اتنے دم کھینچتے کہ مکان دھوئیں سے سیاہ ہوتا۔ لاچار میں نے ان سے کنارا کیا۔ اے عزیزانِ ذی شعور۔ اگر جناب رسول مقبولؐ اجازت شراب نوشی کی دیتے۔ یہ لوگ شراب پی مست ہو کر کیا کیا فساد برپا کرتے۔ باوجود ممانعت کے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ اگر منع نہ ہوتا خدا جانے کیا فتنہ و غضب نازل کرتے لڑ مرتے۔ چنانچہ راہ میں اکثر ترک دیکھنے میں آئے۔ قہوہ خانوں میں شراب بھی ہوتی ہے۔ اسی کو لے کر پیتے تھے۔ دوسرے دن گدھے پر سوار ہو کر شہر کا تماشا دیکھنے گیا۔ آدمیوں کو میلے اور کثیف کپڑے پہنے پایا۔ اکثروں کو نابینا دیکھا۔ سبب اس کا یہ قیاس میں آیا کہ اس شہر میں ہوا تند چلتی ہے۔ مٹی کنکریلی اڑ کر آنکھوں میں پڑتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگ وہاں کے اپنی اولاد کی ایک آنکھ یا اگلے دانت بخوف گرفتاری نوکری فوج محمد علی شاہ کے پھوڑ توڑ ڈالتے ہیں۔ اس عیب سے نوکری بادشاہی سے کہ بدتر غلامی سے ہے بچاتے ہیں۔ لباس وہاں کے لوگوں کا میرے پسند نہ آیا۔ کثیف اور کالا مانند لباس مشعلچیوں تھا۔ قواعد پلٹنوں

کی دیکھی۔ مثل قواعد فوج انگریزی کے تھی۔ ہر ایک سپاہی کے کندھے پر بندوق فرانسیسی۔ سب جوان جسیم اور موٹے مگر قد و قامت سے چھوٹے۔ کپڑے پرانے سڑیل پہنے۔ افسران کے بھی ویسے ہی کثیف پوش تھے۔ اگرچہ ایسے لوگ توانا اور قوی فوج انگریزی میں ہوں، بادشاہ روئے زمین کے مقابلہ میں عاجز ہوں اور زبون، مگر یہاں خرابی میں مبتلا تھے۔ کوئی کسی کو نہ پوچھتا۔ کوئی شخص نوکری فوج شاہی میں بخوشی نہیں قبول کرتا ہے۔ شاہ مصر زبردستی نوکر رکھتا ہے۔ اس لئے کہ خوف مضرت و ہلاکت و قلت منفعت ہے۔ لوگ اپنی اولاد کو عیبی کرتے ہیں، یعنی آنکھ یا دانت توڑتے ہیں تاکہ نوکری سپاہ سے بچیں۔ نوکر ہونے کے ساتھ بھی دائیں ہاتھ پر سپاہی کے بموجب حکم شاہی کے داغ دیا جاتا ہے۔ پھر عمر بھر اسی نوکری میں رہتا ہے۔ ماں باپ، عزیز و اقربا پاس نہیں جا سکتا ہے۔ چھاؤنی فوج کی مانند گھر سوروں کے مٹی اینٹ سے بنی۔ ہر ایک کوٹھڑی میں سوا ایک آدمی کے دوسرے کی جگہ نہ تھی۔ اونچا اس کا ایسا کہ کوئی آدمی سیدھا کھڑا نہ ہو سکتا۔ کھانے کا یہ حال تھا کہ شام کو گوشت چاول کا ہریسا پکتا۔ طباقوں میں نکال کر رکھ دیتے۔ ایک طباق میں کئی آدمیوں کو شریک کر کے کھلاتے۔ معاذ اللہ یہ نوکری کیا بدتر ہے۔ اکبارگی اپنے تئیں دریا یا کنویں میں گرانا بہتر ہے۔ اس شاہ والاشان سے یہ امر بعید نظر آتا ہے کہ لوگوں کو زبردستی سے نوکر رکھتا ہے اور ان پر جبر کرتا ہے۔ خیر ندیدہ تماشا دیکھتے ہوئے باہر شہر کے گیا۔ ایک گورستان دیکھا۔ اس میں ہزاروں قبریں نظر آئیں۔ دیکھنے والے کو باعث حیرت تھیں۔ میں نے لوگوں سے پوچھا۔ اس قدر زیادتی قبروں کا سبب کیا۔ دریافت ہوا کہ یہاں اکثر وبا آتی ہے۔ ہزاروں آدمیوں کو ہلاک کرتی ہے۔ تھوں کی اسی سے آبادی ہے۔ اسکندریہ آباد کیا ہوا اسکندر کا ہے۔ وقت آباد کرنے کے ایک بڑا سا پتھر کھڑا کیا ہے۔ اب

تلک قائم اور کھڑا ہے۔ راہوں اور چوکوں میں تنگی ہے۔ اس سبب سے بیشتر وبا آتی ہے۔ آدمی وہاں کے مفلس و پریشان اکثر تھے۔ بعضے راہ میں فاقہ مست اور خراب پڑے ہوئے مثل سگان بازاری ہندوستان کے۔ دیکھنے ان کے سے سخت متنفر ہوا آگے بڑھا۔ ایک اور پرانا تکیہ دیکھا۔ وہاں فرانسیسیوں نے محمد علی شاہ کی اجازت سے قبروں کو کھودا ہے۔ مُردوں کو شیشہ کے صندوقوں کے دکھا پایا ہے۔ ظاہرا ہزار دو ہزار برس پہلے مُردوں کو شیشے کے صندوقوں میں رکھ کے دفن کر دیتے تھے۔ نہیں مردے صندوقوں میں کیونکر نکلتے۔ اگرچہ عمارت اس شہر کی شکستہ ویران تھی مگر آبادی زمانہ سابق سے خبر دیتی۔ کئی وجہوں سے ثابت ہوتا کہ یہ شہر اگلے دنوں میں پر عمارت اور خوب آباد ہوگا۔ اس واسطے کہ جا بجا اینٹ اور پتھر کا نشان تھا۔ زمین کے نیچے سے اکثر سنگ مرمر نکلتا۔ ان دنوں کئی مکان کو بھی فرانسیسیوں اور انگریزوں کے خوب تیار ہوئے ہیں۔ سوا ان کے اور سب مکان ٹوٹے پڑے ہیں۔

پندرھویں تاریخ فروری ۱۸۳۸ء کی میں اور پرنگل صاحب ہیڈ صاحب لورڈ صاحب باورچی سرکار کے مصر کی کشتی پر سوار ہو کر شہر محمدی کو چلے۔ یہاں سے حال سنیئے۔ رنا و نہر محمدی میں رواں ہوئی۔ کیفیت اس کی اس طرح پر کہ سابق وہ نہر تھی۔ محمد علی شاہ نے اپنے زمانہ سلطنت میں کھدائی۔ مردوں اور رنڈیوں کو زور ظلم سے پکڑا نہر کھودنے میں لگایا۔ سات دن اسکندریہ سے محمدی تک نہر کو کھدوایا۔ یہاں سے وہاں تک فاصلہ چوبیس کوس کا تھا۔ اس محنت شاق رات دن کے میں قریب ساٹھ ہزار آدمیوں کے مرے۔ اب اس شہر میں ناؤ آتی جاتی ہے۔ راہ نہر میں کنارے شہر کے ویرانی گاؤں کے دہات صوبہ اودھ سے یاد دلاتی۔ بسبب ظلم شاہ مصر کے رعیت برباد ہوئی بلکہ بستی اجڑ گئی۔ تمام راہ میں

دیکھتا گیا۔ زمین قابل زراعت کو افتادہ پایا۔ عامل تردد زراعت میں رہتے ہیں مگر لوگ بسبب سخت گیری اور جبران کے کاشت کاری سے کنارہ کرتے ہیں شاہ مصر اگرچہ ہر بات میں مردانا ہے پھر رعیت پر سخت ظلم کرتا ہے ہر شخص اس کے ہاتھ سے دست باخدا ہے۔ نیز چار روز میں اسکندریہ سے محمدی پر پہنچا پر مٹ گھاٹ پر ناؤ سے اسباب اتارا۔ محمدی میں صدہا زن و مرد نابینا نظر آئے۔ بہتیرے لڑکے بغل میں دابے میلے کپڑے پہنے تھے۔ اکثر مدت سے مطلق بہرہ نذر کھتے اور میل بدن کے سبب سے ہر ایک کے کپڑے میں جوں پڑی چنانچہ وہ لوگ جوں مارنے میں مشغول تھے۔ یہ حال دیکھ کر مجھ کو نفرت آئی۔ طبیعت گھبرائی۔ ایک اور امر عجب دیکھا جس ناؤ پر علم انگریزی ہوتا کوئی کچھ مزاحم نہ ہوتا۔ محصول پر مٹ کم دینا پڑتا اور جس کشتی پر نشان ترکوں کا دیکھتے۔ ایذا دے کر محصول زیادہ لیتے۔ سبحان اللہ جس کو حق تعالیٰ صاحب اقبال کرتا ہے ہر ایک اس کا پاس کرتا ہے اور ڈرتا ہے جزیرہ انگریزوں کا چھوٹا اور ان ملکوں کے ساتھ کیا اصل رکھتا مگر بسبب اقبال بے زوال انگریزوں کے یہاں کے لوگ ڈرتے ہیں۔ کسی طرح کی تکلیف اور ایذا کو ان کے متوصلوں کو نہیں پہنچا سکتے ہیں محمدی میں ہر چیز کی تجارت ہوتی ہے۔ خلقت خرید و فروخت اسباب کی کرتی ہے۔ میں یہاں کشتی رود نیل پر سوار ہوا مصر کو چلا۔ پانی نیل کا شیریں اور ہاضم طعام ہے بلکہ مثل معجون کے مقوی اعضائے رئیسہ اندام ہے۔ اسی سبب سے وہاں کے لوگوں کو توانائی میں اوروں سے زیادہ پایا کنارے نیل کے سبزہ زمرد رنگ نظر آیا۔ سبزہ کنارے گنگا کا اس کو دیکھ کر یاد آیا۔ حق یہ ہے کہ ایسا سبزہ اور میٹھا پانی اس کا ہرگز نہ تھا۔ ملاح عربی بہ نسبت ہندوؤں کے ناؤ چلانے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک فقط ایک کرتا پہنتے ہیں۔ وقت ناؤ کھینچنے کے اس کو بھی کمر سے لپیٹتے ہیں۔ بے شرم و حجاب

ننگے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان یا انگلستان کی رنڈیوں کو ان کی ناؤ پر سوار ہونا نہ چاہئیے۔ کشتی ہماری استادی ملاحوں عرب کی سے لطف سے رواں تھی کہ اسی عرصہ میں ایک کشتی علم انگریزی کی نظر آئی۔ اس پر ایک شخص بیٹھا پیالہ شراب کا ہاتھ میں لئے شراب پیتا۔ ایک آدمی نے ہماری ناؤ پر سے اس کو پکارا۔ وہ زبان انگریزی سن کر بہت خوش ہوا۔ اپنی کشتی ہماری کشتی پاس لایا۔ اور دست بدست ہماری کشتی پر آیا۔ نشے میں ایسا مست تھا کہ وقت آنے کے کپڑا اس کا پانی نیل میں بھیگ گیا۔ ایک پیالہ شراب وین مجھ کو پلائی۔ اسی کے ہاتھ کی کھینچی تھی بعد اس کے اپنی ناؤ پر معشوقہ مصری پاس گیا۔ ظاہرا وہ شخص فقط تفریح طبع کے لئے پھرتا تھا۔ مجھ کو پینے جام وین سے ایسا لطف اٹھا کہ سابق ہرگز نہ تھا دل مثل آئینہ زنگ زدودہ کے صاف ہوا۔ کنارے نیل کے بہت جانور ہیں جو شائق شکار بیشتر ہیں چاہیئے کہ وہاں شکار کریں اور تماشا نیل کا دیکھیں۔ بندہ نے بھی شکار بط و قاز وغیرہ کا کیا۔ بہت محظوظ ہوا۔

اٹھارہویں تاریخ فروری کے دو گھڑی رات گئے مصر میں پہنچے شکرانہ خدا کا بجا لائے گرد مصر کے دیوار شہر پناہ عظیم الشان ہے۔ شام سے پھاٹک بند ہوتا ہے۔ اس وقت اندر جانے کا کسی کو نہ امکان ہے۔ ہم سخت متحیر ہوئے کہ اندر شہر کے کیونکر پہنچیں۔ ہل صاحب مصر کی سرا کی باورچی ایک راہ جانتے تھے ادھر سے گئے۔ ہم سب دیوار چڑھے۔ اندر شہر کے کود پڑے۔ خدا نے بڑا افضل کیا کہ چوکیداروں نے نہیں دیکھا۔ ورنہ بلا تحاشا گولی مارتے۔ شاہ مصر سے اجازت اس کی رکھتے۔ ہم ہل صاحب کے ساتھ ان کی سرا میں گئے۔ میز پہ کھانا کھانے بیٹھے۔ کئی انگریز ترکی لباس پہنے کھا رہے تھے۔ ہم ابتدا ان کو ترک سمجھے۔ جب وہ کلام کرنے لگے انگریز ثابت ہوئے۔ ملازم شاہ مصر کے تھے۔ تمغہ بادشاہی نمایاں رکھتے مگر دو شخص نوجوان

بیس برس کے بے تغیر تھے۔ ان سے فقیر نے پوچھا کہ تم یہاں کیوں اور کس لئے
آئے، جواب دیا سیر کے لئے، باپ ہمارا صاحب دولت و حشمت ہے ہم کو سیر
ملکوں کی اس کی اجازت ہے، چنانچہ ہم سیر ملکوں کے لئے پھرتے ہیں تلاش کسی
بات کی نہیں رکھتے ہیں، مجھ کو اس بات سے حیرت آئی کہ اس عمر میں لڑکے ہندوستان
کے کھیل کود میں مصروف رہتے ہیں، لہو و لعب میں ایسے مبتلا کہ اپنے تئیں نہیں
پہچانتے ہیں، یہ کون لوگ ہیں کہ باوجود ثروت و عیش کے اپنے اوپر تکلف گوارا کر
کے شہروں میں پھرتے ہیں، تجربہ نیک و بد زمانہ کا حاصل کرتے ہیں انہیں باتوں
سے انگریز جہاں میں قابض اور مسلط ہوئے ہیں۔ میں نے ان کی صحبت میں سے کئی
پیالے شراب دین پی کر دل کو راحت دی، پھر نیند آئی سو رہا۔ صبح اٹھا، عمارت
سرا کی دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ملاح نیل نے آکر ہل صاحب سے انعام مانگا۔ صاحب
نے اس کو گالیاں دیں اور مارا۔ ایک خرمہرہ انعام نہ دیا مجھ کو اس بات سے رنج
ہوا مگر ملاح کے عوض لڑنا مناسب نہ سمجھا۔ بعض انگریز مردم آزاد سنگدل جو ہندوستان
یا عربستان یا اور جگہ جاتے ہیں بے وجہ ناحق لوگوں کو ستاتے ہیں۔ بخوف شاہ انگلستان
لوگ ان کی خاطر کر جاتے ہیں مگر عملی انگریزی میں ظلم و جبر نہیں کر سکتے ہیں ہل صاحب
عملداری انگریز میں اگر ملاح کو مارتے، وہ بھی ایسا گھونسا ان کے منہ پر مارتا کہ دانت
ٹوٹتے مگر یہاں پاسداری شاہ انگلس سے کسی کو طاقت مقابلہ کی نہیں۔ عالی ظرف باوجود
اقتدار و اختیار کے کسی کو نہیں ستاتے ہیں مگر ایک شخص کوتاہی دست یا خوف حاکم کے سے
ایذا رسانی سے باز رہے۔ اس کی کوئی کیا تعریف کرے کہ اور کے خوف سے ہے قابل تعریف
وہ ہے کہ باوصف حکومت و اختیار کے کسی کو نہ ستاوے بلکہ مطیع ہوتے اور فرمانبرداری
آدمیوں کا شکر خدا کی درگاہ میں بجا لاوے۔ عجز و انکسار کو مصاحب دائمی کرے۔

خلاصہ یہ کہ انتیسویں تاریخ فروری ۱۸۳۸ عیسوی کے بموجب رسم اس ملک کے ہم
گدھے پر سوار ہوئے اور عنایت پرنگل صاحب سے ایک چوبدار بادشاہی راہ بتانے
کے لئے ساتھ لے کر بازار کا تماشا دیکھنے چلے، ہر ایک دوکان اور تنگی راہ وہاں کی
اور خرید و فروخت اشیاء کی مثل بنارس کے تھی، مگر ساخت بازار میں البتہ صورت
دوسری یعنی یہاں درمیان دوکانوں کے چھپر گھاس پھوس کا ڈالا ہے۔ بسبب اس
کے مینہ اور غبار سے صحن بازار کا بچتا ہے۔ دوکانیں حلوائیوں اور باورچیوں کی مانند
دوکانوں ہندوستان کے آباد نان بائیوں کی دوکان پہ ترک و عرب روٹی کھاتے
تھے، دل شاد۔ چھوارا بیچنے والے دکانوں پر بیٹھے چھوارا بیچتے مکھیوں کی ان
پاس ہجوم تھی۔ راہ میں ہندوستان کی طرح جابجا اسباب عمدہ رکھے کسی طرح سے
بگھیوں کے رستے نہ تھے، ایک آدھ راہ سے، بگھی شاہ مصر کی بدشواری جا سکتی۔
قصابوں کی یہ صورت تھی کہ میلے کپڑے پہنے اور ایک چیتھڑا میلا گوشت پر ڈالے
گوشت بیچ رہے تھے۔ آبادی شہر مصر کی ایسی ہے کہ شہر بھر کی چھت ایک دوسری
سے ملی ہے۔ اگر کوئی ایک چھت پر چڑھے، سب چھتوں پر بے تکلف جا سکے۔
اس کثرت آبادی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فصل گرمی میں نہایت گرمی ہوتی
ہوگی۔ سیر کرتے ہوئے ایک قدیمی مکان میں گیا۔ زبانی لوگوں کے ثابت ہوا کہ
فرعون کے زمانہ کا بنا تھا۔ بلندی اور گنبد اس مکان کے جامع مسجد شاہجہان آباد
سے زیادہ۔ گرداگرد اس کے دیوار پختہ ایستادہ مکان عالیشان تھا۔ در و دیوار میں
جابجا نشان خون نمایاں بہت سے تابوت وہاں رکھے۔ عبرت ہوتی ان کے دیکھنے
سے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ در و دیوار میں خون لگنے کا سبب کیا۔ لوگوں نے
بیان کیا کہ ایک قوم عرب نام اس کا مملوک تھا۔ مدت سے اس شہر میں رہتے۔
شجاعت و بہادری میں بے نظیر تھی۔ اطاعت بادشاہ کی بسبب جرأت نہ کرتے۔

سات سو نفر تھے۔ آخر ایک دن شاہ مصر نے ان سے فریب کیا۔ یعنی بہانہ دعوت سب کو اس مکان میں بلایا۔ جب وہ سب جمع ہوئے۔ دروازے بند کروا دیئے اور اپنے لوگوں کو دیواروں پر چڑھایا۔ گولی نیزے تلوار سے ان کو مروایا۔ وہ زخموں سے چور دوڑے دوڑے پھرتے۔ یہ دھبے انہی کے خون سے ہیں جو دکھائی دیتے۔ یہ حال سن کر بہت افسوس کیا میں نے کہ مردانائی و شجاعت سے دور ہے بہت سلہ اوّل عنایت مہربانی سے بلانا۔ پھر دغا بازی سے قتل کرنا خلاف دیانت و امانت کے ہے۔ جو شخص اپنے کچھ پر قائم نہ رہے کتے سے وہ بدتر ہے۔ اس واسطے کہ کتا حق نمک ملحوظ رکھتا ہے۔ پس یہ شخص کتے سے بھی برا ہے۔ دنیا ناپائیدار ہے۔ کسی کو یہاں قرار نہیں ہے افسوس کہ اس پر بھی آدمی نہیں سمجھتے ہیں۔ ظلم و بدعت پر آمادہ ہو قتل انسان کرتے ہیں۔ بالاتفاق ہر مذہب میں ثابت ہے کہ کوئی گناہ قتل بنی آدم سے نہیں زیادہ ہے۔ باوجود اس کے جس کو دیکھئے از راہ نفسانیت خونریزی پر آمادہ ہے۔ انسان نمونہ قدرت کا ملہ حق تعالیٰ کا جو اس کو قتل کرتا ہے۔ دونوں جہان میں اس کا منہ کالا ہے۔ قصہ مختصر وہاں سے پھر کر اس بازار میں آیا کہ لونڈی غلاموں کے بکنے کا وہ مقام تھا۔ بردہ فروش لونڈیاں علانیہ بیچتے ہیں خوف حاکم و کسی نہیں رکھتے ہیں۔ جو لونڈیاں خوبصورت کم سن دیکھتے ہیں۔ ان کو علیحدہ ایک مکان میں پردہ نشین کرتے ہیں۔ جس خریدار کو صاحب عزت و ثروت جانتے ہیں۔ اس مکان میں لے جا کر دکھلاتے ہیں۔ باقی اور لونڈیوں کو سر بازار بٹھلا کر بیچتے ہیں۔ لوگ دیکھ بھال کر مول لیتے ہیں۔ حال ان بیچاریوں کا ان ظالموں کے ہاتھ سے متغیر تھا۔ کسی کا بسبب فاقہ کشی کے بدن میں فقط چمڑا رہا۔ کسی کا سارا بدن ننگا۔ بندہ کپڑے سپید انگریزی پہنے تھا۔ اظہار خریداری لونڈی خوبصورت کا کیا۔ بردہ فروشوں نے اندر مکان کے لے جا کر لونڈیاں خوبصورت دکھلائیں۔

؎ کوتوال شہر

صورت و شکل میں سب پری کے مانند تھیں مگر بسبب تکلیف ان ظالموں کے روٹی کپڑا سے سوکھ کر پوست و استخوان رہیں۔ سب کی سب میری طرف دیکھ کر عاجزی سے اشارہ خریداری اپنی کا کرتیں۔ میں دیکھتے حال تکلیف اور مصیبت ان پریوں سے سخت رنجیدہ ہو کر باہر آیا۔ بخدا اگر مجھ کو مقدور ہوتا۔ ان ستمگار دل ناخدا ترس سے سب کو مول لے کر آزاد کر دیتا مگر لاچار ہوا کہ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔ بجز غم کھانے کے چارہ نہ دیکھا۔ دل میں تعجب آیا کہ اس قدر زیادتی لونڈیوں کے باعث کیا۔ لوگوں نے کہا محمد علی شاہ مصر کا جس ملک کو فتح کرتا ہے اس شہر کے زن و مرد پکڑ لاتا ہے ان کو درماہے کے عوض سپاہیوں کو تقسیم کر دیتا ہے۔ ہر ایک سپاہی ان کو اس بازار میں لا کر سر دست ان ظالموں کے ہاتھ کم قیمت پر بیچ جاتا ہے۔ یہ بتدریج بیچتے ہیں قیمت زیادہ لیتے ہیں۔ شاہ مصر کی دانائی سے بعید معلوم ہوتا ہے کہ رعیت پر اس قدر ظلم گوارا کرتا ہے۔ باوصف کمال ہوشیاری کے خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتا ہے میں حیران ہوا کہ اس ظلم سے قیام سلطنت اس کے کا کیونکر ہوتا ہے آخر ایک دن خدا فریاد مظلوم کی سنے گا۔ ان اعمالوں سے سلطنت اس کی خاک میں ملا دے گا۔ آگے چلا ایک مکان بادشاہی دیکھا بنا تھا۔ ہر ستون اور فرش اس کا ترشا سنگ مرمر کا۔ یقین کہ بعد تیاری کے بہت خوب ہوگا۔ سنگ مرمر جا بجا سے بہت تلاش سے بہم پہنچایا۔ وہ مکان نہایت عالی شان تھا۔ اس کے بعد ایک اور عمارت نظر آئی۔ پاس اس کے دوکان نانبائی کی۔ میں نے پوچھا۔ یہ مکان کس کا ہے۔ لوگوں نے اظہار کیا۔ دیوانے تمام شہر کے اس میں قید رہتے ہیں۔ جو مسافر ادھر سے گزرتے ہیں۔ نانبائی کی دوکان سے روٹی مول لے کر ان کو کھلاتے ہیں۔ میں نے بھی اس دوکان سے روٹی مول لی۔ اس مکان میں جانے کی نیت کی۔ اندر گیا۔ دیوانوں کو دیکھا کتوں کی طرح دست و پا زنجیر میں بندھے چٹائی پر بیٹھے۔ گلوں میں طوق آہنی پڑے۔

کی فنت سے کپڑوں میں جوں پڑی تھیں۔ مکھیوں کے غول ہر ایک پاس بھن بھنا رہے
تھے۔ اسی طرح دوسری طرف رنڈیاں۔ دیوانیاں گرفتار۔ وہ بھی یوں ہی بحال زار۔
ان قیدیوں کا حال دیکھ کر مجھ کو عبرت آئی۔ روٹی ہر ایک کے سامنے پھینک دی ایسے
بھوکے تھے کہ جلدی سے روٹی منہ میں ڈال کر کتوں کی طرح نگل گئے۔ ان کے لئے
سرکار شاہ مصر سے کھانا مقرر تھا مگر کارندوں کی بددیانتی سے ایک ٹکڑا روٹی کا
بھی ان کو نہ ملتا۔ خوراک ان کی مسافروں کے آنے پر ہے۔ سو بھی جو مسافر نرم دل اس
راہ سے گزرتا ہے اور حال ان کا سنتا ہے۔ اس مکان میں جا کر روٹی کھلاتا ہے۔
نہیں تو اپنی راہ چلا جاتا ہے ان میں ایک نوجوان وجیہ لئیق ترکی نژاد عمر میں چالیس
برس کا اسی حال میں مبتلا تھا۔ اس کے پاس جا کر میں نے حال پوچھا۔ زبان ترکی
سے کچھ کلام کیا۔ مگر میں اس کو نہ سمجھا۔ بہر حال وہ شخص عقل و ہوش رکھتا۔ ناحق اس مکان
میں قید تھا۔ یہ ثابت ہوا کہ مصر میں اگر کسی کو کسی سے عناد ہوتا ہے قاضی کو رشوت
دے کر اس کو دیوانہ ظاہر کر کے اس مکان میں قید کرواتا ہے مجھ کو تعجب اور تاسف
آتا ہے کہ رعیت پر خاص دیوانوں پر اتنا ظلم ہوتا ہے بڑا صاحب جو وہاں رہتا ہے
شاہ مصر سے ان کے مقدمے میں کچھ نہیں کہتا ہے۔ سوا اس کے اکثر انگریز اور اس
راہ سے گزرتے ہیں۔ مگر ان دیوانوں کے حق میں شاہ مصر سے کلمۃ الخیر نہیں بولتے
ہیں، باوجودیکہ نیت صاحبان انگریز کی رفاہیت خلائق پہ مصروف ہے اور باگ
ارادے ان کے کی بہبود خلقت پہ معطوف ہے۔ جو کوئی ان بیچاروں کو اس مصیبت
سے چھڑائے۔ دنیا و آخرت میں اجر عظیم پاوے۔ ایک مکان سودائیوں کا لندن میں
دیکھا تھا۔ ہر ایک نفاست سے سنگ مرمر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ پوشاک نفیس پہنے
ہوئے آدمی خدمت کے لئے سرکار سے مقرر تھے۔ ڈاکٹر علاج کے واسطے مقرر۔
ہر طرح کی دوا و غذا سرکار سے میسر۔ مکان ایسا صاف اور بہتر تھا کہ مکھی کا ہرگز گزر نہ

تھا۔ جب کوئی جنون سے صحت پاتا ہے۔ اپنے گھر خیریت سے بھیج دیا جاتا ہے
یا سرکاری ملازم ہوتا ہے۔ یہاں برخلاف اس کے عمل میں آتا ہے۔ کوئی ان دیوانوں
کی خبر نہیں لیتا ہے۔ اگر مسافر آ نکلے۔ ان کو کچھ کھلا دے۔ نہیں تو فاقہ کریں۔ مصیبت
میں رہیں۔ اگر خدا کی قدرت سے بے دوا اور علاج کوئی اچھا ہو جاوے۔ اس
مکان سے نکلنے نہ پائے۔ انگلستان میں کتے بھی ان دیوانوں سے اچھے رہتے ہیں۔
کھانے کی طرف سے ہرگز تکلیف نہیں کھینچتے ہیں۔ یہ عجب بادشاہ اور عجب کارندے
ہیں۔ بنی آدم کو ایسی تکلیف میں ڈال کر روٹی کی خبر نہیں لیتے ہیں۔ یہاں کا حال دیکھ
کر اس تہ خانہ میں گیا کہ فرعون علیہ اللعنت نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس میں قید
کیا تھا۔ دروازہ اس کا ہمیشہ بند رہتا۔ میرے ساتھ چوبدار بڑے صاحب کا تھا
اس لئے ایک عورت نے دروازہ کھولا اور ہاتھ میں مشعل لے کر اندر دکھایا۔ میں نے
چاروں طرف دیکھا۔ فرش زمین پتھر کا تھا اور وہ تہ خانہ سنگستان میں بنا۔ بیچوں بیچ
اس کے ایک کنواں گہرا۔ بعد اس کے ایک اور مکان میں گیا۔ وہ دریائے نیل کے پار
تھا۔ پہاڑ کے مانند بڑا اور اونچا۔ تین کنگرے رکھتا۔ مجھ کو نیل کے اترنے میں
دیر ہوئی۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آدمی پرنکل صاحب کا دوڑا آیا کہ جلد ہی چلے آؤ
نہیں تو دروازہ شہر پناہ کا بند ہو جاوے گا۔ پھر شہر میں پہنچنا دشوار ہو جائے گا۔
اور پرنکل صاحب کا قصد ہے کل یہاں سے روانگی کا۔ بندہ یہ بات سنتے ہی
سیر اس مکان سے پھرا۔ دروازہ شہر پناہ پر آ پہنچا۔ پھاٹک بند ہوتا تھا۔ میں جستی
سے اندر آیا اور اپنے مقام پہ پہنچا۔ بخوبی نہ دیکھنے اس مکان سے بہت تاسف
کیا۔ الا لاچار ہوا کچھ بن نہ پڑا۔ میرے نزدیک مصر میں یہ طریقہ اچھا ہے کہ رات کو کوئی
بے روشنی قندیل کے باہر نہیں نکلتا ہے اگر چوکیدار کسی کو بے قندیل دیکھتے ہیں۔ بے
دھڑک گرفتار کر لیتے ہیں۔ اس سبب سے چور اور شاہ پہچانا جاتا ہے۔ چور چوری

نہیں کر سکتا ہے۔ سوا اس کے ہر محلہ میں ایک پھاٹک لگا ہے رات کو بند ہو جاتا ہے
کوئی ادھر سے ادھر نہیں جانے پاتا ہے۔ نہ شب کو کوئی تماشا ہے کہ آدمی اُس کو
دیکھنے نکلے اور سیر کرے۔ مگر ایک امر قابل دید ہے۔ نادیدہ و ناشنیدہ ہے۔ وہ یہ کہ رات
کے وقت ترک اور عرب قہوہ خانوں میں بیٹھ کر حقہ چپک کے دم کھینچتے ہیں اور شراب
پیتے ہیں۔ داستان گو ان کے سامنے قصے کہانیاں نادرہ کہتے ہیں۔ سابق شراب نوشی
کا رواج نہ تھا۔ محمد علی شاہ کے زمانے سے اس کا بہت چرچا ہوا۔ اس لئے کہ بادشاہ
اور شاہزادہ ولی عہد علانیہ شراب پیتے ہیں۔ سفر اور حضر میں اس کو ساتھ رکھتے ہیں۔
شاہزادہ ولی عہد محمد ابراہیم نام رکھتا ہے۔ زبانی وہاں کے لوگوں کے شجاعت و بہادری میں
یکتا ہے۔ باوصف اس قدر حکومت و اقتدار کے لڑائی کے وقت سامان آرائش کا
ساتھ نہیں لے جاتا ہے۔ خیال سبکباری سے جریدہ رہتا ہے۔ ایک دن لڑائی میں
دو تین اونٹ بوجھ لدے ہوئے نظر پڑے۔ پوچھا کہ یہ اسباب کس کا اور اونٹ
کس کے؟ مصاحبوں نے عرض کیا کہ ان پر اسباب ہمارا لدا ہے۔ بہت ناخوش ہو
کر کہا میں اپنے ساتھ کچھ سامان نہیں رکھتا اور رات کو زمین پہ سوتا۔ تم کو اس قدر
اسباب ساتھ لے چلنا کیا ضرور تھا۔ اس آرام طلبی کی وجہ سے ان کو نوکری سے جواب
دیا۔ الغرض چونکہ مزاج بادشاہ اور شہزادے کا متوجہ شراب نوشی کا ہے۔ ساری فوج اور
رعیت کو اثر اس کا آیا ہے۔ یعنی ہر ایک شراب پیتا ہے چنانچہ سعدی شیرازی نے
فرمایا ہے الناس علی دین ملوکھم[1] قبل اجلاس اس بادشاہ کے مصر میں
انگریزوں کو گھوڑے پر سوار ہونے کا حکم نہ تھا۔ محمد علی شاہ نے اپنے عہد سلطنت سے اس
بات کو خلاف جان کر انگریزوں کو گھوڑے کی سواری کا حکم دیا۔ بہت رسمیں اور حکمتیں ایجاد
کیں جو زمانہ سابق مصر میں نہ ہو سکتیں تھیں۔ ان میں سے ایک یہ امر نیا ہے کہ لوگوں کو
توپ اور بندوق ڈھالنا سکھلایا ہے۔ چنانچہ توپیں تیار کرواتا ہے۔ فوج کو قواعد

[1] عربی زبان کا مقولہ ہے

انگریزی سکھاتا ہے۔ مصوروں کامل کو نوکر رکھتا ہے۔ رعایا کو حکم دیا ہے کہ اپنے لڑکوں
کو فن تصویر کشی تعلیم کروائیں۔ لندن کی طرح تصویر موم کی بھی ان سے بنوائیں۔ وہاں آگے
لوگ اس فن کو برا جان کر نفرت کرتے تھے۔ اب ایسا رواج ہوا کہ ہنر سمجھے۔ جابجا مدرسہ
بنوایا ہے۔ عالموں اور طالب علموں کا درماہہ مقرر کیا ہے۔ بہت سے لڑکے نوکر رکھ
کر انگلستان اور فرانس فن جہاز رانی سیکھنے کے لئے بھیجے۔ اسی طرح صدہا امر خیر
اس نے اپنی ذات سے رواج دیئے۔ غرضیکہ بعض باتیں قابل تحسین و آفرین ہے
بعض رسم ظلم و ستم سے سزاوار نفریں۔ یہ حالات دیکھ کر انتیسویں تاریخ فروری کی
گدھے پر سواری کی اور اونٹ باربرداری کا کرایہ پر ٹھہرا کہ بندہ پرنگل صاحب
اور ہیڈ صاحب کے ساتھ مصر سے سوئیس[1] کو چلا۔ یہاں سے وہاں تک تین منزل
کا فاصلہ تھا۔ تمام راہ کھانا پانی میسر نہ آتا۔ اس لئے ہر چیز ضروری اور کھانا پانی شراب
میوہ اونٹوں پر لاد کر ساتھ لیا۔ راہ میں عورتیں مصر کی دیکھیں۔ برقع ریشمی پہن
کر مقدور والیاں باہر نکلتی تھیں اور جو غریب اور بے مقدور تھیں۔ سوتی برقع پہنے
پھرتیں۔ بسبب برقع کے بدن اُن کا سر سے پاؤں تک چھپا تھا کوئی عضو نظر نہیں
آتا۔ آنکھوں کے برابر ایک ٹکڑا جالی کا سیا تھا۔ اس سے رستہ نظر آتا۔ بعضی کو
دیکھا کہ پردہ اٹھا کے منہ اپنا راہیوں کو دکھاتیں۔ برقع برائے نام پہنے تھیں۔ چہرے ان
کے بے جمال یوسفی عیاں تھا۔ چال ڈھال میں حسن زلیخائی نمایاں مگر اتنا عیب رکھتیں
کہ قد و قامت میں اکثر موٹی تھیں۔ ایک مکان نظر آیا۔ وہ مقبرہ حضرت امام حسینؑ کا تھا۔
لوگوں نے کہا کہ یہاں سر مبارک آنحضرتؑ کا دفن ہوا۔ عمارت اس کی عالیشان ستون
اس کے چاندی کے مستحکم بنیان۔ گرد اس کے قرآن خوان قرآن مجید پڑھتے۔ مراد والے
وہاں آ کر منت مانتے۔ دیکھتے بھالتے کنارے مصر کے پہنچا۔ وہاں دو تین لڑکیوں
خوبصورت نے آ گھیرا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے سوال بخشش و انعام کا کرتیں اور پیچھے

[1] نہر سویز

ہمارے دوڑتی آئیں۔ مجھ کو ان کے جمال اور کمال افلاس پہ رحم آیا۔ ان گلوں کا کانٹوں میں دوڑنا دل کو نہ بھایا۔ بطریق بخشش ان کو کچھ دیا اور رخصت کیا وہ اپنی زبان میں دعائیں دیتی پھر گئیں اور بخشش پانے سے نہایت خوش ہوئیں مصر میں اس قدر غلبہ سائلوں اور فقیروں کا ہوتا ہے کہ مسافروں کو راہ چلنا مشکل پڑتا ہے اور خوف ترکوں سے کوئی عورتوں کی طرف بد نظر سے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ میری زبان جہان کے میووں سے ذائقہ یاب ہوئی۔ مگر کہیں بہتر مصر کی نارنگی سے خوش ذائقہ نہ پائی۔ مٹھائی اس کی مثل شیریں ادائی معشوق۔ کھٹائی اس کی مرغوب طبائع مخلوق مصر سے دو کوس آگے بڑھے۔ کئی مقبرے قدیم صحرا میں نظر آئے اہل عرب سے حال ان کا پوچھا۔ انہوں نے کہا مقبرہ ہارون رشید اور کئی بادشاہوں کا ہے۔ مدت کا بنا ہے۔ سامنے سے عمارت مستحکم اور وسیع نظر آئی۔ مگر بسبب دوروی راہ کے وہاں کی سیر نہ ہو سکی اس خیال سے کہ جہاز دو دن سوئیس سے رواں ہو جائے گا۔ بندہ سرگرم تردد تھا۔ چلتے چلتے صحرائے ریگستان میں پہنچا۔ وہاں ہم سب کھانا کھا کر سو گئے۔ صبح اٹھ کر پھر چلے راہ پر آفت و بلا تھی۔ صورت دانے پانی کی کہیں نظر نہ آئی۔ ہزار خرابی سے قطع مسافت کرتے تھے۔ تیسری منزل تیئیسویں تاریخ فروری کے پرنکل صاحب اور ہیڈ صاحب کہنے لگے ہم آگے چلتے ہیں۔ سوئیس میں جا کر جہاز ٹھہراتے ہیں۔ تم آہستہ آہستہ اونٹوں کے ساتھ آؤ۔ ان کو احتیاط سے آؤ۔ اگر جہاز چلا جاوے گا کچھ بن نہ آوے گا۔ چلتے وقت ہیڈ صاحب نے میرے گدھے کو تیز رفتار قدم باز دیکھ کر اپنی سواری میں لیا۔ اپنا گدھا سست قدم میری سواری کو دیا۔ میں نے چار ناچار قبول کیا۔ وہ دونوں صاحب جلدی سے آگے بڑھے۔ ہم اونٹوں کے ساتھ چلے۔ جب رات آئی۔ بہت تاریکی چھائی۔ چلتے چلتے پاؤں گدھے میرے کا ایک گڑھے میں جا تا رہا۔ میں بھی اس کے اوپر سے معہ تلوار

بندوق کے اس میں گرا۔ عرب جو میرے ساتھ تھے۔ حال پوچھنے لگے۔ میں زبان عربی سے نا آشنا تھا۔ اس وقت اور ہر حال میں طائب طائب[1] کہتا۔ طائب ان کی بولی میں بجائے بہتر کے بولتے اور میں نے کہا نیچ ایسے وقت مصیبت کے انہوں نے یہ سن کر قہقہہ مارا اور غار سے مجھ کو نکالا۔ بڑی محنت اور مشقت کے ڈیڑھ پہر رات گئے سوئیس میں مج صاحب کے مکان پہ جا کر اترا۔ سارا اسباب اونٹوں سے اتارا۔ مج صاحب ملازم شاہ لندن کے تھے۔ پہنچانے اسباب ضروری جہاز کے لئے مقرر سرکار سے تھے۔ اپنے دونوں ہمراہیوں کو خواب غفلت میں پایا جگانا ان کا مناسب نہ سمجھا۔ ہاتھ پاؤں دھو کر کچھ کھانا کھایا اور سو رہا۔ صبح اٹھا حال جہاز کا پوچھا۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں کے آنے سے پہلے روانہ ہو گیا۔ یہ سن کر بہت ملول ہوا کہ یہاں کچھ دنوں رہنا پڑا۔ حال اس شہر کا اس طرح دیکھا کہ کہیں سبزی اور درختوں پھول کا نام و نشان نہ تھا۔ یہاں تک کہ پہاڑ بھی سبزے سے خالی پایا۔ تمام شہر کے کنوؤں کا پانی کھاری ہے۔ نہ کوئی چشمہ شیریں جاری ہے۔ وہاں سے تین کوس کے فاصلے پہ ایک کنواں اچھا تھا نام اس کا میر موسیٰ اور پانی اس کا میٹھا۔ سقے مشکوں میں پانی اس سے بھر لاتے۔ بازار میں لا کر بیچ جاتے خریدار ان پہ ہجوم کرتے۔ شہد کی طرح مول لیتے۔ سوا پانی کے سوئیس میں ہر چیز ملتی۔ آسانی سے بے تکلف میسر آتی۔ جیسے گوشت دودھ۔ دہی۔ پنیر۔ گھی اور تمباکو پینے کا۔ حقہ چیک بھی وہاں خوب بنتا۔ قہوہ خانوں میں شراب اور چائے موجود مہیا۔ ایک سرا پختہ بھی جگہ اترنے مسافروں اور سوداگروں کی۔ یہ شہر مقام تجارت اسباب مصر کا ہے۔ دریائے شور سے لگا ہے۔ بگلے عرب کے یعنی چھوٹے جہاز وہاں آتے ہیں اسباب خرید کر کے جدے اور مکے لادے جاتے ہیں اور وہاں کا اسباب یہاں بیچنے لاتے

---

[1] طبیب

ہیں، پرنکل صاحب نے مج صاحب سے اترنے کی جگہ مانگی۔ انہوں نے ایک جگہ بہتر رہنے کے لئے تجویز کر دی۔ حق یہ ہے کہ مج صاحب مرد دانا تھا۔ لیاقت چوگنی درماہے کی رکھتا اس خرچ مقرر سے کہ سرکار کمپنی سے پاتا۔ اس شہر میں رہنا ہر کسی کا کام نہ تھا۔ قوم گمریک سے کتنے آدمی وہاں رہتے تھے۔ لوگ حال بیان کرنے لگے کہ یہاں گرمی کی فصل میں اکثر تپ و بخار آتا ہے۔ ہر شخص شراب دوا جان کر پیتا ہے انہی دنوں میں نے کلن صاحب سے جو مج صاحب کے مکان پر رہتے تھے۔ ملاقات کی دوستی اور محبت بدرجہ کمال بہم پہنچی وہ تھے رہنے والے ڈبلن کے۔ لیفٹن فوج انگریزی رسالہ، ہارس ٹرین کے سرکار سے رخصت لے کر مصر کی سیر کرنے آئے تھے، اس شہر کو پسند کر کے چندے ٹھہرے۔ ہم اکثر ان کی صحبت میں رہتے۔ بہت سیاح اور جہاندیدہ تھے۔ جب سے وہ اس جوار میں آئے، ترکوں کی طرح ڈھاڑھی[1] بوجھ بڑھا دی، اور پوشاک ترکی پہنتے۔ بندہ بیشتر ان کے ساتھ دریائے شور اور بازار کی سیر کرنے جاتا۔ باتوں شیریں ان کی سے ذائقہ یاب ہوتا۔ قہوہ خانوں میں ہمراہ اُن کے جا کر قہوہ و شراب پیتا اور مج صاحب کے مکان پر جو کنارے دریا کے تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر حقہ چپک پیتا۔ پانی کی لہروں کی سیر دیکھتا، ہر روز نہانے کو ان کے ساتھ سمندر جاتا۔ اسی لطف میں ہفتہ عشرہ گذرا۔ ایک دن دوپہر کو دل گھبرایا۔ کنارے دریا کے جی بہلانے گیا۔ وہاں سے پھر آتا تھا۔ راہ میں ایک پھاٹک کے نیچے ایک بیمار پڑا دیکھا۔ اس نے میرے دیکھتے ہی سوال کیا کہ للّٰہ مجھ بیمار غریب الوطن پر متصدق حضرت عیسیٰؑ کے رحم کر دو اور کہیں رہنے کی جگہ دو۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو کہاں کا رہنے والا اور مذہب تیرا کیا ہے۔ کہا وطن میرا بنبئی[2] اور مذہب میرا عیسوی ہے۔ ایک صاحب والاشان کا نوکر ہو کر اس کے ساتھ جاتا تھا۔ مصر میں پہنچ کر مرض تپ اور بخار میں گرفتار ہوا۔ لاچار ہو کر اپنے آقا سے عذر بیماری کا کیا درماہہ[3] لے کر

---

[1] داڑھی۔ [2] بمبئی [3] تنخواہ

یہاں تک آیا۔ اب یہاں کوئی خبر گیر میرا نہیں ہوتا۔ پھر میں نے اس سے کہا میں مذہب سلیمانی کا یقین اور آئین رکھتا ہوں۔ کوڑی پیسہ پاس نہیں رکھتا ہوں تو اپنے مذہب والوں سے مطلب اپنا ظاہر کر۔ اس نے کہا بہت خوب اور بہتر۔ بعد اس کے میں اسی پھاٹک پاس کھڑا چپک پیتا رہا۔ ایک شخص عیسائی سوئیس کا رہنے والا تسبیح ہاتھ میں لئے سامنے سے آتا تھا۔ اپنے مذہب میں بہت پرہیزگار اور متقی۔ ملک شام میں زیارت مقبرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کی۔ بظاہر اپنے مذہب والوں سے تقویٰ طہارت میں سبقت لے گیا۔ نہایت مرفہ الحال اور صاحب مقدور تھا۔ میں نے اس بیمار سائل سے اشارے آنکھ سے کہا یہ جو صاحب بڑے دیندار آتے ہیں ان کو حال اپنا کہہ سنا۔ جب وہ برابر آئے اس نے گڑگڑا کر کہا۔ میں مذہب عیسائی رکھتا ہوں، مسافرت میں بیمار پڑا ہوں۔ برائے خدا مجھ پر رحم اتنا کرو کہ اپنے گھر لے چل کر میری دوا کرو۔ انہوں نے اس سے یہ بات سن کر پوچھا تو خط صلیبی کھینچنا جانتا ہے اس نے فی الفور خط صلیبی بازو اور سارے بدن پر کھینچ کر دکھلایا اور ان کے پاؤں پر گرا۔ وہ خفا ہو کر سخت کلمے کہہ کر چلے گئے۔ ایک پیسہ بھی نہ دے گئے۔ سوا باتوں سخت و ناروا کے، اسی طرح بہت پادری اور کتنے اور صاحب اس راہ سے نکلے۔ حال اس کا دیکھتے گئے سبھوں سے سوال کیا، مگر کسی نے اس پہ رحم نہ کھایا۔ اس سخت دلی ان لوگوں سے ثابت ہوا کہ عقیدہ درست نہیں ہے کسی کا۔ ظاہر میں پادری اور سب صاحب مذہب عیسائی کا دم مارتے ہیں۔ باطن میں ذرہ بھر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان لوگوں کے حق میں فرمایا کہ حال ان کا مثل مقبرے کے ہے ظاہر میں آراستہ و خوش نما اندر اس کے سوائے ہڈیوں مردہ کے اور کیا۔ اسی طرح میری امت کے لوگ ظاہر میں میری محبت کا دعویٰ کریں گے باطن میں کچھ اس کا خیال نہ رکھیں گے دین عیسائی بالذات بہتر ہے لیکن اس مذہب والے اپنی طریق سے بے خبر ہیں۔ اکثر

آں حضرت علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا کہ فردائے قیامت میں تم سے کہوں گا کہ اے میری امت کے لوگو! میں بھوکا تھا۔ تم نے مجھ کو کھانا نہ کھلایا۔ پیاسا تھا۔ پانی نہ پلایا۔ ننگا تھا کپڑا نہ پہنایا۔ مسافر تھا۔ تم نے اپنے گھر رہنے کا ٹھکانا نہ دیا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ میری امت کے بھوکوں، پیاسوں، ننگوں کو تم نے کامیاب نہ کیا۔ باوصفیکہ سلوک کرنے کا تم کو اختیار تھا۔ القصہ جب اس مسافر بیمار کا کوئی پرسان نہ ہوا۔ میں نے پرنکل صاحب کے آدمی سے کہا کہ اس شخص کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ باورچی خانہ میں رہنے کی جگہ دو۔ وہ اس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ باورچی خانہ میں اتارا۔ الغرض وہاں جہاز کے آنے میں عرصہ تھا۔ لاچار اس اطراف و جوانب کی سیر کا ارادہ کیا۔ پرنکل صاحب اور ریڈ صاحب اور رکلن صاحب کے ساتھ ایک گریک کی کشتی پر سوار ہوئے اور سمندر میں چلے۔ نام اس گریک کا نکلس۔ کشتی بھری ہوئی تھی غلہ سے تھوڑی دور تک ناؤ موافقت ہوا سے اچھی طرح چلی۔ جب بیچ میں جا پہنچی۔ ہوا ناموافق زور سے بہی۔ کشتی ڈگمگائی۔ لہر پانی کی ناؤ تک آئی۔ ہوا کے زور سے ناؤ کبھی اونچی ہوتی۔ کبھی نشیب میں جا گرتی۔ نکلس بوڑھا تھا۔ تدبیر سے عاجز ہوا ایک ملاح اور تھا۔ اس نے لاچار ہو کر اپنے تئیں دریا میں گرا کر ہلاک کرنا چاہا۔ ہم نے منع کیا اور منع کر کے پکڑ رکھا۔ بادبان کی رسی کاٹ دی ناؤ ٹھہرائی لیکن تدبیر آدمی کی ہوا پانی سے کچھ کام نہیں کرتی۔ کشتی ویسی ہی ڈانواڈول رہی۔ کنارے لے جانے کی بھی صورت نہ تھی۔ اس لئے کہ کنارے پر درخت مونگے کے سر بر آور دہ تھے کہ اگر کشتی ان پر جاتی، توڑ ڈالتے۔ یہ وہی مقام تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر آئے۔ پانی خدا کے حکم سے خشک ہوا اور وہ پار اتر گئے۔ ہم لوگ اس مصیبت میں پڑے، خدا کی درگاہ میں دعا کرتے تھے۔ اکبارگی بنگلہ عرب کا نظر آیا۔ ہم نے اُن سے اظہار حال کیا۔ انہوں نے ایک چھوٹی ناؤ بھیج کر اپنے پاس بلایا۔

ہم نے اس ناؤ پر سوار ہو کر ان کے بنگلے پر پہنچنا غنیمت جانا۔ سبب بچنے جان کا ہوا۔ بعد ایک ساعت کے ایسی ہوا موافق چلی کہ کشتی اسی گریک کی بھی بخیریت کنارے پر پہنچی۔ ہم اس بنگلے پر چڑھ کر موضع طور میں آئے۔ وہ وطن یہودیوں کا تھا کئی گھر عرب کے اور دو تین گھر گریک کے تھے۔ اس کی طرز آبادی سے معلوم ہوتا کہ سابق میں خوب آباد ہوگا۔ قسم غلہ سے کوئی چیز وہاں نہیں پیدا ہوتی۔ زمین اس کی سنگستان اور کان نمک کی تھی۔ اس سبب سے درخت میوہ دار اور سبزہ بھی نہ تھا۔ مگر درخت کھجور کا البتہ اگتا۔ ظاہر اکم پانی غلہ اور ہر چیز کی تنگی سے لوگ وہاں سے نکل گئے۔ وطن مالوف اپنے سے ٹل گئے۔ غذا وہاں کے لوگوں کی مچھلی ہے۔ اسی سے ان کو سیری ہے۔ غلہ مصر اور اور طرفوں کو جاتا ہے اس سبب سے گراں بکتا ہے۔ اسی لئے لوگوں نے مچھلی کھانا اختیار کیا ہے۔ پانی کنوؤں کا کھاری ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت شوریت نہیں رکھتا ہے مگر بدمزہ پایا جاتا ہے وہاں دریائے شور میں مچھلی کی زیادتی سے گویا کان ماہی ہے جب بنگلہ یعنی جہازنہ ہمارا وہاں پہنچا۔ آدمیوں معزز کو دیکھا کہ جال شکار کے واسطے دریا میں ڈالا جب اس کو پانی سے اٹھایا، اتنی مچھلیاں بھر گئیں کہ اٹھانا جال کا دشوار ہوا۔ اس مقام سے دو تین کوس کے فاصلہ پر ایک حوض سنا کہ وہ حمام حضرت موسیٰؑ اور مقام تعظیم کا تھا۔ پانی اس کا بھی خوب شیریں نہ تھا۔ اس میں ہم نے جا کر غسل کیا۔ بعد فراغت کے پھر وہاں سے طور کو چلے۔ راہ میں کئی جبا تیتل اڑتے دیکھے۔ میں نے چھرے بھر کر ان پر ایک بندوق ماری۔ اتفاقاً ان میں سے ایک کو زخم لگا کاری۔ وہ زخمی ہو کر گرا۔ میں نے شکر خدا ادا کر کے گوشت اس کا کھایا۔ طور میں ہم کو بہت تلاش کر کے اونٹ بہم پہنچائے۔ ان پر سوار ہو کر وہ طور پر چلے۔ طور سے کوہ طور تک چار روز کی راہ تھی۔ ہم نے اپنی تیز روی سے دن بھر چل کر تین روز میں طے کی۔ راہ میں ایسے ایسے رستے پہاڑ کے دیکھے

کہ بہ سبب تنگی کے دو اونٹ برابر نہ جا سکتے۔ بلکہ سوا اونٹ کے دوسرا جانور ہرگز
تاب و طاقت نہ رکھتا کہ ان راہوں دشوار گذار سے چل سکتا۔ اونٹ عجیب جانور
ہوتا ہے کہ اپنے اوپر تکلیف سہہ کر سوار کو منزل تک پہنچاتا ہے۔ جس جگہ پہاڑوں
پہ اونٹ تھک جاتے   اونٹ والے غزلیں عربی گاتے۔ اکبارگی اونٹ جوش
میں آتے۔ تیز ہو کر چل نکلتے۔ فی الواقعی غزل سرائی بدوؤں کی عجیب کیفیت رکھتی میری
طبیعت بھی اس کو سن کر مسرور ہوئی۔ راہ بھر پہاڑوں پر کہیں سبزہ نہ دیکھا مگر ایک ادھ
چشمہ نظر آیا کہ بلندی سے نشیب میں بہتا اور درخت کھجور کا بھی اس کے پاس
تھا۔ وہاں بیٹھ کر کھانا کھایا، پانی پیا۔ بدن دھویا۔ باقی تمام راہ اپنی ساتھ کی مشکوں
سے پانی پیتا گیا۔ دیر تک وہاں بیٹھ کر ستائے۔ ٹھنڈی ہوا مزیدار پانی پر للچانے
آگے چلنے کو دل نہ چاہتا مگر لاچار قدم آگے رکھا نام اس کا وادی ایمن مقام بنی
اسرائیل کا تھا۔ چالیس برس تک گروہ بنی اسرائیل کا اس میں حیران و پریشان
رہا۔ جا بجا پہاڑوں پر خطوط عربی ہندی عبرانی لکھے۔ ظاہرا وہ سب لکھے ہوئے بنی اسرائیل
کے تھے۔ ہر چند خوض و غور کیا، مگر مضمون اس کا ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا ایک
جگہ نکیر قبرستان بدویوں کا نظر آیا اور اکدال پتھر قبروں انگریزوں زمانہ قدیم کا بھی دیکھا۔
درمیان انہی پہاڑوں کے اونٹ پر نکل صاحب اور کلن صاحب کی سواری کے بیمار
ہوئے اور تھک کر راہ چلنے کے قابل نہ رہے۔ ہم کو سخت حیرانی ہوئی کہ یہاں سے جان
کیونکر بچے گی۔ بدوی اسی جنگل میں دوڑے گئے اپنے بھائیوں کے پاس سے دو
اونٹ لائے۔ کلن صاحب اور پرنکل صاحب ان پر سوار ہو کر چلے۔ تیسرے دن
چلتے چلتے شام کو کوہ طور پر پہنچے۔ دور سے دو پہاڑ نظر آئے۔ ایک باغ نفیس تھا۔
بیچ میں ان کے، دیکھنے اس کے سے میں بہت خوش ہوا۔ پھولا نہ سمایا۔ تمام عمر میں
دو مرتبہ مجھ کو جتنی خوشی حاصل ہوئی ویسی کبھی خیال میں نہیں آتی ہے۔ ایک دیکھنا
زمین جزیرہ کیپ طراوت آباد کا۔ دوسرے بعد از صحرا نوردی مشاہدہ اس باغ ارم

بنیاد کا۔ ان دونوں پہاڑوں میں سے جو داہنی طرف تھا۔ کوہ طور نام رکھتا۔ پہاڑ کے
اوپر ایک قلعہ بنا ہے۔ بلندی میں آسمان سے باتیں کرتا ہے اگر اتنا بلند نہ ہوتا، مال
اور اسباب اس کا لٹ جاتا۔ اس لئے کہ بدوی ہمیشہ مستعد تاراج و یغما رہتے ہیں۔
قابو پانے پر مال و اسباب لوٹ لے جاتے ہیں۔ باغ اور قلعہ میں گریک کے دو سو
پادری ترک دنیا کر کے بیٹھے ہیں۔ تمام عمر عورت سے نہیں واقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ
حال انکا مشہور ہے، معلوم نزدیک و دور ہے مگر حال باطن ان کے کا خدا جانتا ہے
کہ دل مکدر رہے یا صفائی رکھتا ہے۔ قوم گریک کے رئیس نے قلعہ کے اندر ایک مسجد
بنوائی ہے رضامندی بدویوں کے لئے یہ بات بنائی ہے تاکہ بدوی ان کو محض
کافر نہ گنیں، ان کی طرف سے دل میں محبت رکھیں اسی واسطے دو سو بدویوں کو
ہر روز کھانا کھلاتا ہے۔ عناد و خصومت سے باز رکھتا ہے۔ پھر بھی وہ آمادہ
غارت گری رہتے ہیں۔ قابو پانے پر نہیں چوکتے ہیں۔ قلعہ جانے کی راہ ایک دروازہ
مستحکم ہے۔ راہ باغ کی بھی اسی سے توام ہے اور طرف کوئی دروازہ نہیں لگا
ہے۔ وہ ایک بھی خوف بدویوں سے ہمیشہ بند رہتا ہے۔ سابق دروازہ پر گھنٹی تھی۔
کہ مسافر جب وہاں پہنچتے، گھنٹی ہلاتے۔ لوگ قلعہ کے اس کی آواز سے خبردار ہو کر مسافر
کو اندر لے جاتے۔ بدوی کئی بار ان کو اٹھا لے گئے۔ اب انہوں نے لاچار ہو کر دروازہ پر
ایک لکڑی رکھی کھڑکھڑانے کے لئے مسافر جب جاتا ہے وہ لکڑی دروازہ پر
دے مارتا ہے۔ قلعہ والے جب آواز اس کی سنتے ہیں مسافر کو اندر بلا لیتے ہیں۔ ہم
لوگ بھی جب وہاں پہنچے۔ اطلاع کے لئے لکڑی دروازہ پر بجانے لگے۔ قلعہ والے
دوڑے۔ بلندی پر ایک کھڑکی تھی۔ اس کے پٹ کھولے۔ ہم کو دیکھا۔ ہمارا حال پوچھا۔
کلن صاحب نے چٹھی سفارش کی   ان کے نام کی چٹھی دکھلائی۔ انہوں نے ایک رسی پیچ
پر لگی ہوئی نیچے لٹکائی۔ چٹھی پیچ میں رکھوا کر اوپر کھینچ لی۔ بعد اس کے اسی رسی
پیچدار کو پھر لٹکایا۔ ہم کو اور اسباب ہمارے کو اوپر کھینچ لیا اندر لے جا کر مہمانی

میں مشغول ہوئے۔ دو ایک صاحب نہایت مہربانی فرما کر دو چار کلیسوں میں جو وہاں تھے لے گئے۔ ایک کلیسا قدیمی بہت بڑا تھا۔ اندر اس کے اسباب چاندی سونے کا رکھا۔ فرش سنگ مرمر سپید و سیاہ کا مانند خانوں شطرنج کے بنا ہوا جھاڑ چاندی کے چھت اور دیواروں پہ لٹکے۔ فریم تصویر اولیاء انبیاء کے جا بجا لگے قدرت خدا کی اس مکان والاشان سے پیدا۔ دوسری طرف ایک اور مکان گنبد دار تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی جگہ روشنی اور تجلی خدا کی دیکھ کر سجدہ میں آئے تھے۔ اب تلک وہاں جانے والا کانپتا ہے ہیبت سے۔ اندر اس کے بتیاں اگر کی جلتیں اور ہر طرح کی خوشبوئیں تھیں۔ اس کے سامنے ازراہ ادب جوتا پہنے کسی کو جانے نہیں دیتے ہیں۔ گریک اور انگریز اور ہر کوئی برہنہ پا ہو کر زیارت اس کی کرتے ہیں۔ میں نے اور ہمراہیوں میرے نے وہاں جا کر زیارت کی۔ بعد اس کے رہنمائی ان دونوں صاحبوں سے تہ خانہ کی راہ سے جو ملحق باغ سے تھی، باغ میں ان کا تماشا اور سیر دیکھتے رہے عجب باغ نادر و سرسبز تھا کہ نہال خشک قلم مدح نگاری اس کی سے بار ور ہوا۔

درآں باغ مرغان بجوش آمدہ

ز ہر یک دگرگوں خروش آمدہ

درخت بادام پستہ، ناریل، زیتون اور ہر ایک میوہ کے پھلوں سے لدے ہوئے ہر قسم کے پھل اور میوے وہاں موجود تھے۔ وہ پادری تارک الدنیا جو وہاں رہتے، سوائے کھانے کے وہ میوے کھاتے۔ اسی سیر میں شام ہوئی۔ دل کو خواہش طعام ہوئی۔ از انجا کہ مقیموں پر دعوت مسافروں کی لازم آتی ہے، یہی طریقہ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہم ان کی مہمان نوازی پر منتظر رہے۔ زیادہ تر اس سبب سے کوئی جاگہ خرید و فروخت کھانے کی نہ جانتے۔ اتنے میں میز پہ دسترخوان بچھا۔ ستھرے برتنوں صاف کو اس پر چنا۔ دو تین بڑے برتنوں میں چاول تر بتر پلاؤ کی صورت لائے اسی قدر

روٹی سیاہ بدہیئت، ترکاری روغن زیتون کی پکی ہوئی۔ قہوہ اور شراب بھی آئی۔ چاولوں کو دیکھ کر بندہ بہت محظوظ ہوا کہ مدت کے بعد پلاؤ میسر آیا۔ جب کھانا آ چکا اور ہر ایک برتن میز پہ قرینے سے جما۔ کھانا شروع ہوا۔ چاولوں پر میں نے پہلے ہاتھ ڈالا اور ایک لقمہ کھایا۔ تیل کا پکا ہوا پایا۔ ایسا تنفر ہوا کہ پھر کوئی نوالہ اس کا حلق سے نہ اترا۔ مگر ترکاری وغیرہ سے البتہ قدرے قلیل کھایا اور قہوہ بھی پیا۔ ہیڈ صاحب نے بھی میری طرح عمل کیا مگر پرنکل صاحب نے چند لقمہ روٹی کے کھائے بعد اس کے خاموش ہو کر بیٹھے۔ کلن صاحب مرد خود نما تھے، ہاتھ بڑھا کر ایک برتن کے چاول صاف کر گئے۔ پھر دوسرا برتن اپنے آگے کھینچ لیا۔ اس میں سے بھی تھوڑا سا کھایا۔ ہم اور سب لوگ مانع ہوئے کہ یہ چاول تیل کے پکے ہرگز ہضم نہ ہوں گے۔ انہوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ ازراہ جہالت شکم سیر کھایا۔ اور کہا تم اس کھانے کا مزا نہیں جانتے ہو یہ کھانا خوب ہوتا ہے ناحق منع کرتے ہو۔ میں نے ترکوں کے ساتھ اکثر کھایا۔ اس نے کبھی مجھ کو ضرر نہیں کیا۔ کچھ زبان عربی بھی سمجھتے تھے۔ ان لوگوں کے جواب میں تعال ہیں ہیں کہتے۔ ہم لوگ زبان عربی اور گریک کچھ بھی نہ سمجھتے۔ جب کھانے پینے سے فراغت پر قہوہ اور چپک کی نوبت آئی۔ اسی کیفیت میں رات ہوئی۔ کلن صاحب کے پیٹ میں درد اٹھا۔ شور و غل مچایا۔ منگوا کر عرق انگور کا ایک پیالہ پیا۔ تب کچھ افاقہ ہوا۔ مگر ہنوز درد خفیف باقی تھا کہ وقت فجر ہوا۔ میں نے اٹھ کر بعد سلام رسم خاص و عام کے ان کے مزاج کا حال پوچھا۔ انہوں نے حال بتایا اور کہا وہ روغن سوائے زیتون کے کچھ اور ہی تھا۔ ورنہ اتنا رنج نہ دیتا۔ دوسرے دن ہم نے پادریوں سے کہا کہ ہم میں سے کوئی زیتون وغیرہ کھانے کی عادت نہیں رکھتا۔ اگر گھی میسر آئے تو البتہ ہضم ہوئے۔ تو انہوں نے جواب دیا ہم ترک لذات کر کے یہاں بیٹھے ہیں۔ انہی چیزوں کو کھاتے ہیں۔ میں نے پرنکل صاحب

سے کہا۔ قرینے سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ ہم سے کچھ پاویں، راضی ہو کر
کھانے نفیس کھلا دیں۔ پرنکل صاحب میرے کہنے سے راضی ہوئے۔ ایک کو ان میں
سے پانچ روپے دیئے۔ اس دن دوپہر کو جب میز پر دسترخوان بچھا۔ پستہ۔ بادام
انڈا۔ روٹی۔ چاول اور ہر طرح کا کھانا موجود ہوا۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ
باوصفیکہ انہوں نے ترک تعلقات کر کے یہاں بیٹھنا اختیار کیا۔ اس پر بھی دل سے
دنیا کی محبت کو نہ چھوڑا۔ تھوڑے روپے دو پیسے کیا کیا تکلف کیا اور اقسام اقسام
کا کھانا سوائے گوشت کے میز پر لگایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ ان کا اظہار نان خشک
کا بے جا تھا۔ میوے اور کھانے مرغن کھاتے، نہیں تو ایسے موٹے کیونکر ہو جاتے
کہ سب جنگلی سور کی طرح پھولے تھے اور بلبے چوڑے نظر آتے۔ دوسری دلیل یہ کہ میں
نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک شخص ایک برتن کندھے پر رکھے آتا۔ پکی مچھلیوں سے
بھرا تھا۔ ان پادریوں کے لئے لایا۔ مخفی جگہ پر بیٹھ کر انہوں نے کھایا۔ تیسرے پہر کو
میں نے چھپ کر ان کے کھانے کا مکان دیکھا۔ ہر ایک طرح طرح کی نعمتیں کھا رہا تھا اور
شراب و چپک پیتا۔ انہی دنوں دو انگریز ایک نام ڈاکٹر ہال رائے صاحب دوسرا
اینڈرو صاحب وہاں سیر کے لئے وارد ہوئے۔ دونوں دولت مند اور صاحب ثروت
تھے، فقط سیر اور تجربہ اور حصول علموں اور صنعتوں کے پھرتے۔ چنانچہ روم۔ شام اور
عربستان طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ڈاکٹر ہال رائے صاحب جس ملک کو دیکھتا، نقشہ
اس کا کھینچتا۔ اینڈرو صاحب حال ہر ملک کا لکھتا۔ دونوں صاحب پوشاک عربی پہنے
تھے۔ اس لئے ہم ان کو شیخ عرب سمجھے۔ بعد کلام کرنے کے ثابت ہوا ان کا انگریز ہونا
لڑکا حبشی خدمت کے لئے اور ایک ڈیڑھ خیمہ چھوٹا بوجھ ایک گدھے کا ان کے ہمراہ تھا۔
میں بہت اشتیاق سے ان کی ملاقات کرنے گیا۔ اس وقت وہ کھانا کھا رہے تھے۔
دونوں اپنے ہاتھ سے نوالہ اٹھا کر منہ میں لے جاتے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا چھری

کانٹے سے کھانا کیوں موقوف ہے انہوں نے کہا سفر میں اس قدر بوجھ اٹھانا اور
لباس انگریزی پہننا عقل کے خلاف دیکھا۔ عربی پوشاک پہنی اس ملک میں جہاں ہم جاتے
ہیں، لوگ اخلاق سے مل کر اچھی جاگہ عزت سے بٹھلاتے ہیں۔ وہ ایسے تپاک سے
مجھ سے ملے اور کلمات نصائح بیان فرمائے کہ ان کے پاس سے اٹھنے کو دل نہ چاہتا
صاحبان انگریز کیا عقل رسا اور فہم و ذکا رکھتے ہیں کہ باوجود ثروت کے ہمیشہ علم و ہنر
کے طالب رہتے ہیں ایک لحظہ اپنی اوقات برباد نہیں کرتے ہیں۔ مستعد تلاش
امور عجیب ہوتے ہیں، ایک نئی بات حاصل کر کے اہل جہان اور واماندوں کے
لئے یادگار چھوڑ جاتے ہیں ایسی ہی باتوں سے ملک ہندوستان وغیرہ اپنے قبضہ
تصرف میں کیا اور کرتے جاتے ہیں۔ وائے بحال رئیسان ہندوستان کہ زندگی اپنی
بے جا باتوں میں برباد کر دیتے ہیں۔ کبوتر اور مرغ اور بٹیر اور قمار بازی میں مشغول
رہتے ہیں، دنیا اور مافیہا سے خبر نہیں رکھتے ہیں، خوشامدی ان کے پاس بیٹھ
کر تعریفیں فضول کرتے ہیں، غرض وہ تحصیل علوم اور فنون سے کاہل ہیں آمادہ امور
بے حاصل اور لاطائل ہیں۔ اس سبب سے روز بروز مغلوب اور ضعیف ہوتے جاتے
ہیں، انگریز اپنی مستعدی چالاکی سے ان پر غالب آتے ہیں، سابق انگریزوں کے
قبضہ میں سوائے انگلستان کے دوسرا ملک نہ تھا۔ اب انہوں نے اپنی مستعدی سے
کتنے ملکوں کو سر کیا شاہ ہندوستان جو کابل و قندھار تک قبضہ رکھتا اب کاہلی اور نامستعدی سے
مثل شاہ شطرنج کے اپنے گھر میں بھی بے دخل ہوا۔ اے قلم تو ارادہ مطلب نگاری
کا رکھتا ہے اظہار عیب و ہنر سے ہر ایک کو ناحق دشمن اپنا بنا کر بات بڑھاتا ہے۔

قصہ مختصر دوسرے دن بندہ مع احباب ہمراہ گئے اور ایک عرب سقے کے
کوہ طور پر آیا۔ ایک شخص راہ بتانے والا قلعہ سے ساتھ لیا۔ کوہ طور آٹھ ہزار فٹ
بلندی رکھتا۔ اوپر چڑھنے کو ایک زینہ پتھر کا قدیم سے بنا ہوا۔ اس زینہ سے رستہ

آمد درخت کا مشہور ہے کہ وہ ہزار برس کا شاہ گریک کا بویا ہے۔ کوہ طور پہ ایک حوض نظر آیا۔ کنارے اس کے ایک درخت سرو کا لگا۔ اگرچہ حوض پانی سے خالی تھا مگر ایسا تر و تازہ اور سیدھا درخت سرو کا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ آگے بڑھ کر ایک غار دیکھا۔ پانی اس کا خوب سا میٹھا۔ میں اس کو پی کر چپ و راست پھرا۔ پہاڑ عظیم الشان نظر آیا۔ تھوڑا آگے بڑھا۔ نشان پیٹھ حضرت موسیٰؑ کا پتھر میں پایا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰؑ پیٹھ پہاڑ پہ لگا کر حیران ہوئے۔ از راہ اعجاز پتھر میں نقش پیٹھ آنحضرتؑ کا پڑ گیا۔ یہ وہی پتھر اعجاز نشان تھا۔ حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کا بھی معجزہ وہاں تھا۔ یعنی ان کے اونٹ کے سم کا نقش پتھر پر بنا تھا۔ یہ حال سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور عرب سے حال ان کا مفصل سنا۔ عبادت خانہ گریک اور اہل اسلام کا اس پہاڑ پہ تھا۔ یہ سیر دیکھ کر اور مقام پر گیا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے بہت مبالغہ سے پانی مانگا۔ حضرت موسیٰؑ نے عصا اپنا پتھر پہ مار کر چشمہ پانی کا نکالا۔ اب اس میں پانی نہ تھا مگر نشان ثابت ہوتا اور ایک جگہ پر نشان سر گوسالہ پرستش بنی اسرائیل کا تھا جب حضرت موسیٰؑ نے ان کو پرستش سے منع کیا اور غصہ کر کے سمجھایا۔ تب ہی اسرائیل کے سرداروں نے اس گوسالہ کو سر کے بل دے مارا۔ سر اس کا مع سینگوں کے پتھر میں دھنس گیا۔ نشان اس کا اب تلک باقی رہا۔ عرب نے حال کہا کہ اگر مینہ برسے اتنا کہ پہاڑ ڈوبے تو بھی پانی اس گڑھے میں نہ آوے۔ یہ بات میں نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ پر عربیوں کی زبانی سنی۔ ایک اور جگہ تھی وہاں مسلمان بھیڑی بکری کی قربانی کرتے ہیں اور اس قربانی کو سبب برکت اور زیادتی بکریوں کا سمجھتے ہیں آگے بڑھ کر ایک پتھر دیکھا جس پہ بیٹھ کر وعظ کہتے تھے حضرت موسیٰؑ۔ ان سب باتوں کو تو دیکھ کر

ؔ گائے کا بچھڑا۔

بندہ نے اعتماد کیا۔ قدرت الہٰی سے بعید نہ جانا۔ مگر بعض انگریز جو کم عقل رکھتے ہیں ان امروں کو محض جھوٹ جان کر کہتے ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ سمندر سے پار اتر گئے ہوں گے اگر بالفرض پانی بھی سوکھا ہو۔ حال درخت مونگے کے کس طرح راہ سے ہٹے ہوں گے۔ اسی طرح سارے حال۔ قصے کہانی جانتے ہیں دل میں یقین نہیں لاتے ہیں۔ مجھ کو ان کی نادانی پر تاسف آتا ہے کہ جو شخص تحصیل معاش کے فنون سے خبر نہیں رکھتا ہے۔ قدرت خدا اور معجزہ انبیاء سے کیا جان کر انکار کرتا ہے۔ عمداً گمراہی میں بھٹکتا ہے۔ اس واسطے کہ قدرت خدا کی عقل میں نہیں آتی۔ عقل کو کیا طاقت اس کے بھید دریافت کرنے کی۔ حال ان لوگوں کا مانند حال اُس دولت مند کے ہے کہ ایک فقیر لازرس نام نے ساتھ امید ٹکڑے روٹی کے اس کے دروازہ پہ رہنا اختیار کیا۔ مرض جذام میں گرفتار سراپا فگار تھا۔ وہ دولت مند بخیلی کے سبب سے اس کو کبھی پارۂ نان دیتا ہے اور اپنی تن پروری خوب طرح کرتا ہے۔ ایک دن فکر بارہ برس کے سامان کا کرتا تھا۔ ایکبارگی قضا آئی مر گیا۔ وہ فقیر بھی خرابی اور مفلسی میں مرا۔ دولت مند دوزخ میں داخل ہوا۔ فقیر حضرت ابراہیمؑ کی گود میں آرام سے بیٹھا۔ دولت مند نے فقیر کو حضرت ابراہیمؑ کی گود میں بیٹھا دیکھا۔ لجاجت سے کہنے لگے اے نبی اللہ کے مجھ کو بھی اس مصیبت سے چھڑا کر اپنے پاس بلا۔ آنحضرتؑ نے جواب میں فرمایا۔ ہمارے اور تیرے درمیان ایک بڑا غار ہے۔ آنا جانا اس کے سبب سے دشوار ہے تو دنیا میں سائلوں محتاجوں کو اپنے دروازہ سے نکالتا تھا اور خدا کے لئے موتے ہے۔ کچھ نہ دیتا تھا۔ اس کے عوض خدا تعالیٰ نے یہاں تجھ کو اپنی نعمت سے محروم رکھا۔ دولت مند نے پھر عرض کیا۔ میں مستحق اس ظلم و جفا کا ہوں۔ اب یہ التماس رکھتا ہوں کہ ان مردوں میں سے کسی کو ارشاد ہووے تا کہ میرے بھائیوں زندوں کو خبر میری

مصیبت و تکلیف کی پہنچا دے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا اگر انہوں نے کتاب خدا اور رسول مقتدی پر اعتماد نہ کیا۔ ایک مردے کی خبر دینے سے کیا فائدہ ہوئے گا اسی طرح اگر کوئی معجزوں انبیاو کا نہیں قائل ہوتا ہے۔ عاقبت اپنی خراب کرتا ہے۔ میں نے یہ سب معجزے پیغمبروں کے اپنی آنکھ سے دیکھ کر اس کتاب میں لکھے۔ اگر کوئی اعتبار نہ کرے اپنی بلا سے ہم نے بعد زیارت ایسے مکانوں پاک کے بنیت سوئیس پھرنے کی کی۔ ان پادریوں سے اجازت رخصت چاہی۔ چلتے وقت انہوں نے زادراہ قہوہ اور روٹی سیاہ چھوٹی اور تھوڑی سی شکر دی۔ وہ بھی چھ منزل راہ میں پوری نہ پڑی۔ اس خیال سے کہ یہ مسافر انعام نہ دے چلے۔ گھبرائے ہوئے تھے۔ فی الحقیقت ان کو کچھ دینا ضرور نہ تھا۔ اس لئے کہ ہزار روپے کا سالیانہ سرکار شاہ گرجیک سے ان کو ملتا۔ چنانچہ ہر ایک صاحب نصاب تھا۔ میووں باغ کا کچھ حساب نہ تھا۔ سوا اس کے فقیروں کو روپے لینے سے کیا غرض و مدعا۔ بخل اور امساک جبلی سے چلتے وقت ہم کو میووں باغ یا کھانوں نفیس سے سوا روٹی سیاہ اور تھوڑی شکر کے کچھ نہ دیا۔ شاید انہوں نے قول شیخ سعدیؒ کا نہیں سنا کہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔

بزرگان مسافر بجان پرورند
کہ نام نکوشان بعالم برند

ان کو لازم ہے کہ سب روپیہ اپنا خدا کی راہ پر دے ڈالیں اگر بھلائی دنیا و آخرت کی چاہیں نہ یہ کہ بخیلوں کی طرح روپے جمع کر کے اس کی محبت دل میں رکھیں اور مسافروں سے انعام کی خواہش کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ جس چیز کو زیادہ دوست رکھتے ہو۔ بت ہے تمہارا۔ پرستش اس کی کرتے ہو۔ اس زمانہ میں مسلمان ہندو انگریز وغیرہ سے میں کسی کو نہیں دیکھتا ہوں کہ روپے کا عشق دل میں نہ رکھتا ہو۔ سب لوگ مذہب زر پرستی کا رکھتے ہیں۔ اپنے طریقے پر نہیں چلتے ہیں

زیادہ اس سے کیا ہوگا کہ ان پادریوں نے دنیا اور عزیزوں قریبوں کو چھوڑا جنگل پہاڑ پر رہنا اختیار کیا۔ خدا تعالیٰ سے دھیان لگایا۔ افسوس کہ زر پرستی سے باز نہ آئے۔ ہمیشہ طالب روپے کے ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ انہوں نے ہمارے انعام نہ دینے سے چہرہ پر آثار ملال ظاہر کیا۔ میں نے پرنکل صاحب سے اشارہ سے کہہ کر انعام ان کو دلوایا۔ سردار پادری نے روپیوں کو لے کر کپڑے میں مضبوط باندھا اور اپنے مقام پر گیا۔ ظاہرا اسی امید پر ٹھہرا تھا۔ جب پا گیا۔ رخصت ہوا ہم سب جس طرح قلعہ گئے تھے اسی طرح ہنڈولے میں بیٹھ کر نیچے اترے اور روانہ منزل مقصود ہوئے۔ بروقت روانگی گلن صاحب اور پرنکل صاحب کے آدمی سے کسی بات پر تکرار ہوئی۔ وہ ہمیشہ اس کو جان کہہ کر پکارتے اس وقت بھی تعال ہیں تعال ہیں چاند کہتے۔ چاند ان کو کلم کلم کہتا۔ اس بحث و تکرار میں دو گھڑی کا عرصہ ہوا آخر ہم نے مشکیزے پانی کے اونٹوں پر لادے اور آپ بھی اونٹوں پر سوار ہو کر سوئیس چلے۔ سب راستہ کوہستان ہے۔ تکلیف اور مصیبت بے حد و پایاں ہے۔ ہم کو راہ میں ایسی تکلیف ہوئی کہ نہیں طاقت بیان کی تپش آفتاب کی اس درجہ پر تھی کہ ساری جلد منہ اور بدن کی جلی۔ رنگت سیاہ ہوئی۔ پرنکل صاحب اور ہیڈ صاحب اول مرتبہ لندن سے ہندوستان آتے تھے۔ صعوبت سفر سے خبر نہ رکھتے تھے۔ یہ سب تکلیفیں سہی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔ خوراک سوا سیاہ روٹی اور شکر کے کچھ نہ تھی۔ سو بھی بخیال کمی اور ہم نہ پہنچنے کسی چیز کے ایک ایک روٹی حصہ میں آتی۔ سوئیس کے قریب نوبت آدھی روٹی کی بلکہ اس سے کم کی آئی۔ پرنکل صاحب ہمیشہ دودھ گائے اور بھیڑ کا پیتے تھے۔ یہاں تک کہ قہوہ بھی بے دودھ نہ پیتے۔ راہ میں نہ ملنے کے سے سخت حیران ہوئے اگر کہیں گلے بکریوں بدویوں کے ملتے۔ گلن صاحب خوش طبع تھے۔ از راہ خوش طبعی دودھ بکریوں کا پی لیتے۔ پرنکل صاحب کے لئے کچھ

بھی نہ چھوڑتے بلکہ ازراہ سادہ مزاجی ممتن بکریوں کے منہ میں لیتے اور بے تکلف دودھ پیتے۔ بڑا شور و غل مچاتے، مگر وہ کچھ بھی نہ سنتے۔ پتھر پہاڑوں پر سے ڈھکیلتے۔ ایک مرتبہ قریب تھا کہ اس کے ساتھ آپ بھی گر پڑتے۔ مگر عنایت الہٰی سے بچ گئے۔ ایک چھُوری پاس رکھتے، جہاں کہیں ڈیرہ و قنات استادہ ہوتے طناب اور میخیں اس سے کاٹ ڈالتے اور چھوڑ دیتے۔ جا بجا لعال میں تعال ہیں کہتے۔ غرض کہ تمام راہ میں یہی حرکتیں کرتے رہے۔ راہ میں ہم نے ایک بکری کو بدویوں سے مول لے کر ذبح کیا۔ گوشت اس کا کھایا۔ جو باقی رہ گیا، شتر بانان عرب کو تقسیم کر دیا۔ عجب احمق و نادان تھے کہ گوشت پوست مع ناخونوں کے بھون کے کھا گئے فقط سینگ بسبب سختی اور نہ چبائے جانے دانتوں کے پھینک دیئے۔ اونٹ ہماری سواری کے جب منزل پہ پہنچتے، شتربان ان کو پہاڑ جنگل میں چرنے کو چھوڑ دیتے اس اطراف میں سوا ایک قسم سوکھی گھاس کے نہیں ہوتی ہے شام تک اونٹ اس کو چرتے رہتے جب اندھیرا ہوتا۔ اونٹ والے اپنے اپنے اونٹ کو اس کا نام لے کر پکارتے۔ اونٹ اپنے مالکوں پاس بلاتحاشا دوڑ آتے۔ اونٹ والے قریب سیر بھر کے دانہ انکو کھلاتے۔ پانی تین تین روز تک نہ پلاتے۔ مگر باوجود اس کمی دانہ کے بار ثقیل اپنے اوپر لاد کر منزل تک پہنچاتے۔ اگر اونٹ اس طرف نہ ہوتا۔ ریگستان اور کوہستان میں گذرنا دشوار تھا۔

بیچارہ خار میخورد و بار می بُرد

اونٹ والے عرب شام کو بھوسی سے کوئی چیز نکالتے۔ اس کو حریرے کی طرح اونٹ کی مینگیوں میں پکا کر کھاتے۔ عقل اور تمیز سے مطلق بہرہ نہ رکھتے۔ جانوروں کی طرح سب افعال ان کے تھے۔ ہم چلتے چلتے سوئیس کنارے دریا کے جا پہنچے۔ اس کشتی پر کہ سقے پانی میر موسیٰ سے بھرے لئے آتے تھے۔ سوار ہوئے۔ کلن صاحب

چھُری

جلدی سے ایسا کود کر ناؤ پر چڑھے کہ برنکل صاحب ان کے دھکے سے ناؤ میں گر پڑے۔ کلن صاحب نے شرمندہ ہو کر برنکل صاحب کو اٹھا کر بٹھلایا اور عذر کیا۔ انہوں نے راضی ہو کر معاف کیا کہ یہ امر اختیاری نہ تھا بلکہ سہواً ہوا۔ اس میں کیا مقام رنجش کا۔ اس مصیبتوں سے بچ کر سولہویں تاریخ مارچ کے دن جمعہ کے دریا کے پار جا کر سوئیس میں پہنچے اور مج صاحب کے مکان پر اترے انہوں نے فی الفور بہ رسم دعوت کھانے نفیس منگوائے۔ ہم لوگوں کو کھلوائے اس وقت وہ کھانے مزیدار بہشت کے کھانے اور میوے معلوم ہوتے۔ اس لئے کہ بہت دنوں بعد کھانے میں آئے۔

انہی دنوں میں فابر صاحب مع اپنی بی بی کے اور ارکٹ صاحب گورنر جنرل کے بیٹے ہندوستان جانے کو مصر سے سوئیس آئے۔ جہاز کی انتظاری میں مقام کر کے خیمے کھڑے کروائے اور کٹی صاحب ممبئی سے لندن جاتے تھے۔ وہ بھی یہاں پہنچ کر ستانے کے لئے چند روز رہ گئے۔ سب صاحبوں سے ملاقات ہوئی ہر ایک نے مجھ پر مہربانی اور عنایت فرمائی الا فابر صاحب اور ان کی بی بی اور ارکٹ صاحب سے مجھ سے زیادہ تر موافقت ہوئی۔ اس لئے کہ انہوں نے شفقت بزرگانہ میرے حال پر مبذول کی۔ اتفاقاً لشکر بیدل شاہ مصر کے نے آ کر وہاں کئی دن مقام کیا۔ حبش کی لڑائی کا قصد رکھتا۔ خیمہ اور ڈیرہ لشکر کا مانند فوج انگریزی کے صاف اور خوش نما تھا۔ اچھی جگہ پر استادہ ہوا۔ میں نے ان لوگوں سے ملاقات کی۔ ہر ایک کی صورت دردناک اور غمگین تھی۔ حال پوچھا کہ تم لوگوں کو کیا صدمہ ہوا۔ انہوں نے کہا۔ ملک حبش بہت گرمی رکھتا ہے۔ ہم میں سے زندہ بچ کر ایک بھی پھرتا نہیں نظر آتا ہے۔ ہر ایک کی ماں بہنیں سوئیس تک پہنچانے آئیں تھیں گویا اب قبر تک پہنچا چلیں مجھ کو ان کی جوانی پر رحم آیا کہ افسوس ہر ایک جوان مارا جائے گا۔ برداشت گرمی اور مقابلہ اہل حبش کی کون لائے گا۔ بعد دو تین دن کے جہاز المنا سے آیا۔ سبھوں نے پہنچا اس کا غنیمت جانا اور فکر روانگی میں ہوئے۔ مگر میرے پاس روپے خرچ کے تھوڑے

باقی رہے اور کرایہ جہاز کا سوئیس سے بمبئی تک آٹھ سو روپے تھے ہم متردد ہو کر اس بات پر مستعد ہوئے کہ عرب کے بگلے پر سوار ہو کر جدے جاویں ۔ وہاں جو کچھ بن پڑے سو کریں ۔ پرنگل صاحب نے میرا حال دریافت کر کے کہا بگلہ عرب کا جدے میں جا کر ٹھہرتا ہے ۔ جب ہوا موافق ہوتی ہے وہاں سے رواں ہوتا ہے ۔ اس سبب سے تم کو بمبئی پہنچنے تک پانچ چار مہینے کا عرصہ ہوگا ۔ خرچ پاس نہ رہے گا اور زیادہ تردد ہوگا ۔ جب میں جہاز کے مکان دیکھنے جاؤں گا تو صاحب کپتان جہاز سے تمہاری سعی کر کے کوئی جاگہ ٹھہراؤں گا ۔ میں نے ان کا کہنا قبول کیا بہتر ہی سمجھ کر راضی ہوا ۔ جب پرنگل صاحب اور ہیڈ صاحب جہاز پر مکان دیکھنے گئے ۔ کپتان جہاز سے سفارش کر کے میرے لئے بھی ایک مکان ٹھہرا آئے ۔ میں نے ادائے شکر ان کا کیا بعد اس کے اس درویش سائل کے رہنے کا ٹھکانا چاہا ۔ خدا ان صاحبوں کو ترقی مرتبہ پہ پہنچا دے ۔ میرے حال پر کیا کیا عنایتیں فرماتے ۔ میری خاطر سے اس کو بھی جہاز پہ جگہ دی اور یہ بات کہی کہ تم اور لوگوں کرایہ دینے والوں سے زیادہ آرام پاؤ گے ۔ کسی طرح کی تکلیف نہ اٹھاؤ گے ۔

۷
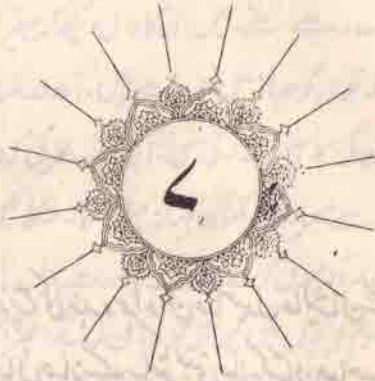
مصر سے بمبئی

تیسویں تاریخ مارچ کی بندہ ہمراہ ان صاحبوں عالیشان کے سوار ہوا ایک کمرہ ہوادار پہ بیٹھ کر خانساماں جہاز کے ساتھ بمبئی چلا۔ کپتان صاحب نے تخفیف کرایہ کے واسطے نام میرا نوکروں میں لکھایا اس سبب سے کرایہ بمبئی تک کا چالیس روپے پر ٹھہرا۔ میں ہوادار کمرے میں خانساماں کے ساتھ بیٹھا آرام سے جاتا تھا۔ خانساماں فارسی نژاد عدل جو نام سراپا عدل تھا کہ اپنے اوپر تکلیف گوارا کرتا۔ مگر مجھ پر کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا۔ ارکٹ صاحب بعد کھانے کے میرے پاس آکر چپکے چپکے باتیں ہمراہ ہر شخص کی کہتے سنتے۔ چلتے چلتے جہاز مخے میں پہنچا۔ قہوہ وہاں کلکتہ سے آتا ہے اور وہیں سے کوئلہ وغیرہ جہاز کے لئے خرید ہوتا ہے۔ اس خیال سے کہ مبادا راہ میں کوئلہ خرچ ہو جاوے۔ جہاز دودی جو دھویں کے زور سے چلتا ہے روانگی سے باز نہ رہے۔ کپتان صاحب نے جہاز ٹھہرایا اور کوئلہ وہاں سے خرید کیا۔ میں نے دور سے مخے کو بہت آباد دیکھا۔ مگر جب وہاں جا پہنچا۔ گلیوں کو تنگ آدمیوں کو لانبا دبلا پتلا پایا۔ ہر ایک بدشکل سیاہ رنگ تھا۔ گرمی کا ایسا زور کہ ٹھہرنا دشوار ہوا۔ قہوہ خانے یہاں کے بُرے تھے۔ مانند قہوہ خانوں مصر کے ستھرے نہ تھے۔ چنانچہ میں نے ایک قہوہ خانہ میں قہوہ پیا پسند نہ آیا۔ سابق یہ شہر عملداری عرب میں تھا۔ اب محمد علی شاہ حاکم مصر نے زور شمشیر سے اس کو قبضہ اپنے میں کیا۔ آدمی شاہ

مصر کے چوکی پہرے کو مقرر تھے۔ توپیں پرانی پڑی تھیں۔ قریب دیوار شہر پناہ کے مسلمان اور انگریز حبش کے جو شاہ مصر کے ہاں پکڑے آئے تھے۔ بھوک پیاس سے دھوپ میں بیٹھے بک رہے تھے۔ میں ان کا حال دیکھ کر بیقرار ہوا۔ جہاز پہ آیا۔ دیکھا کہ مخے کے لوگ کوئلوں کو جہاز میں بھر رہے ہیں۔ آمد و رفت میں گرد و غبار اڑا رہے ہیں۔ صورت ان کی ہو بہو بندر کی سی۔ الا ایک فرق کہ دم نہ تھی کپتان صاحب نے جب جہاز کوئلوں سے بھرا۔ لنگر کھولا۔ جہاز چل نکلا۔ مکلا میں پہنچ کر ٹھہرا۔ میں اتر کر اس شہر میں گیا۔ آدمیوں کو سیاہ رنگ بدصورت پایا۔ وہاں دو تین ہندو پیشہ ور تھے۔ نہیں معلوم عربوں میں کیونکر گزران کرتے۔ پھر ایک چھوٹی ناؤ پر سوار ہو کر جہاز پہ آیا۔ ملاحوں عرب کے لڑکوں نے ناؤ پر مجھ سے کہا کہ اگر ایک پیسہ دو ہمارا تماشہ دیکھو۔ یعنی غوطہ ماریں۔ جہاز کے نیچے سے نکلیں۔ بندہ نے بموجب خواہش ان کے ایک لڑکے کو ایک پیسہ دیا۔ اس نے غوطہ مارا۔ جہاز کے نیچے سے نکل آیا۔ ڈر مچھلی گھڑیال[1] کا نہ کیا۔ میں اس کو دیکھ کر متحیر ہوا کہ یہ لڑکے مچھلی کی طرح تیرتے ہیں۔ انھوں دریا سے ہرگز نہیں ڈرتے ہیں۔ جاتے جاتے جہاز قریب ملک سیلون[2] کے پہنچا ہندی میں نام اس کا لنکا۔ سامنے اس کے سمندر میں دونوں طرف دو پہاڑ برابر سر نکالے ہیں۔ اس کے بائیں سے جہاز کی راہ ہے۔ ہندو ان کو راون کا پل کہتے ہیں لام[؟] لچھمن نے اس وقت لڑائی راون کے بیچ سے توڑا دیا۔ یہ سیر و تماشے جزیروں کے دیکھتا آتا تھا۔ ناگہاں وہ بیمار عیسائی قریب ہلاکت پہنچا۔ علاوہ اس کے دھوپ کی گرمی سے سخت حیران تھا۔ پرنکل صاحب سے حال غلبۂ مرض اور تکلیف دھوپ میں بیٹھنے اس کے کی بیان کی۔ انھوں نے کپتان صاحب سے کہہ کر ایک جگہ سایہ دار اس کے رہنے کو ٹھہرا دی۔ وہ طاقت ایک قدم چلنے کی نہ رکھتا۔ میں نے جہاز یوں سے اس کو اس جگہ پر

---

[1] : مگرمچھ [2] : سیلون

اٹھا لانے کو کہا۔ میرا کہنا کسو نے نہ سنا۔ آخر ایک گورا ولائتی ثواب جان کر اس کو دھوپ سے چھاؤں میں اٹھا لایا۔ القصہ وہ قریب المرگ ہو رہا تھا۔ حال اس کا زیادہ تر بگڑا مجھ سے کہا میرا مذہب عیسوی ہے۔ اس وقت کوئی سرہانے میرے بندگی[1] پڑھے۔ میں نے سبھوں سے کہا کوئی بندگی پڑھنے پر راضی نہ ہوا مگر پرنگل صاحب نے عنایت کر کے سرہانے اس کے بندگی پڑھی۔ بندگی سنتے ہی اس نے قضا کی۔ ہم نے اس کو طریقہ عیسائی پر کفن پہنا کر دریا میں ڈالا اور ڈوب جانے کے لئے ایک گولہ توپ کا کمر اس کی سے باندھا۔ اس کی بیکسی، مفلسی دیکھ کر عبرت آئی کہ بے زر کا دنیا میں کوئی نہیں ساتھی۔ بے روپے کے کوئی حاجت نہیں بر آتی۔ حسب حال یہ شعر یاد آیا:

اے زر تو خدا نہ ای ولیکن بخدا

ستّار عیوب و قاضی الحاجاتی

بعد اس کے سبزہ پہاڑ اور کنارے دریا کے دیکھتے ہوئے خیر و اصلاح سے بمبئی پہنچے۔ وہاں جا کر سب علیحدہ مکانوں میں اترے۔ پرنگل صاحب نے از راہ عنایت فرمایا تم کو مناسب ہے ہمارے مکان پہ رہنا۔ میں نے ساتھ رہنا مناسب نہ دیکھا۔ کثرت صحبت کو موجب کمی الفت سمجھا۔ کنارے سمندر کے قریب قلعہ ایک مسلمان کا مکان تھا۔ بندہ وہاں اترا۔ صندوق کپڑوں کا اس کے گھر رکھ دیا۔ دن بھر شہر کی سیر کرتا۔ رات کو وہاں سو رہتا۔ بستی بمبئی کی دو جگہ پہ تھی۔ ایک اندرون قلعہ، دوسری باہر تھی۔ قلعہ مستحکم و استوار ہے پرتگیزوں کا بنایا ہوا۔ قبل ازیں وہ شہر انہی کے عمل میں تھا۔ ان سے انگریزوں کے قبضہ میں آیا۔ اب صاحبان انگریز نے بازار قلعہ و شہر بہت خوب بنایا۔ گرد قلعہ کے دو کھائیاں گہری بنائی ہیں۔ پنیا سوت[2] تک پہنچائی ہیں۔ دیوار قلعہ کی پختہ ہے۔ اندر اس کے بازار و شہر بستا ہے۔ صبح کو چوک میں اژدحام ہوتا

---

[1] بندگی یعنی عبادت، یہاں دعا مراد ہے۔ [2] تالاب جس میں سوت سے یعنی زمین کے نیچے سے پانی آتا ہے، یہاں بہت گہری کھائیاں مراد ہے۔

ہے۔ رستہ شہر و بازار کا وسعت رکھتا ہے۔ ہمہ چیز بازار میں مہیا تھی۔ مچھلی اور انڈے کی زیادتی۔ ایرانیوں اور پارسیوں کے مکان نفیس بنے تھے بلند۔ ایک کلیسا بھی وہاں تھا فلک پیوند۔ کنارے دریا کے درخت ناریل کے ہرے ہیں۔ سوا ان کے اور درخت سبز بھی لگے ہیں۔ وہ مقام نہایت وسعت و فضا کا ہے۔ عجب لطیف و طراوت فزا ہے۔ شام کو پارسی وہاں جا کر اپنے طور پر عبادت کرتے ہیں۔ انگریز بھی سیر و تماشا دیکھنے جاتے ہیں۔ بندہ بجا اسے سچ کہتا ہے۔ وہ مقام ہر شام نمونہ روضۂ رضوان ہوتا ہے۔ لعل باڑی نام ایک مقام کا ہے کہ نسیم جیو وار ہٹیہ پارسی نے وہاں ایک مکان اور باغ بنوایا ہے۔ عجب جائے عشرت افزا ہے کہ سارا سامان امیرانہ و رئیسانہ اس میں مہیا ہے۔ جھاڑ و فانوس تصویریں امیروں کی اور شبیہیں اور جانور مردے ہر قسم کے مصالح سے بھر کر وہاں رکھے ہیں۔ اکثر امیر شہر کے اس میں جا کر محفل ناچ رنگ کی جما کر عیش و عشرت کرتے ہیں۔ ان سیروں سے فراغت کر کے ماماہرالی صاحبہ کے روضہ میں گیا۔ سراپا زیب و زینت تھا۔ ایک پتھر سونا جواہر جڑا رکھا۔ عجب لطف رکھتا۔ پہاڑ بسبب رطوبت ہوا کے سبز ہو رہے تھے۔ چشم نظارہ طلب کو تازگی بخشی۔ باہر شہر کے ایک پہاڑ ہے۔ پارسی اپنے مردوں کی لاش کو لے جا کر اس پر پھینک آتے ہیں۔ چیل کوے، گدھ اس کو کھا جاتے ہیں۔ پارسی لوگ آتش پرست ہوتے ہیں۔ مگر امورات دنیوی میں عقل کامل رکھتے ہیں کہ انگریزوں میں بیشتر نوکر ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ صاحبان انگریز ان کو معتمد سمجھتے ہیں۔ جو ان میں سے زیادہ عزت رکھتے ہیں جہاز کا کام کرتے ہیں۔ فقیر نے اکثر ان کو صاحب علم و لیاقت پایا۔ لباس ان کا سفید اور بہتر تھا۔ عورتیں ان کی عصمت و عفت رکھتی ہیں۔ بدی پہ ہرگز مائل نہیں ہوتی ہیں۔ اندر شہر کے ایک آتشکدہ ہے۔ برسوں سے اس میں آگ جلتی ہے۔ کبھی سرد نہیں ہونے پاتی۔ سب پادریوں

---

[1] انگریزی دفاتر

نے متفق ہو کر یہ امر ٹھہرایا ہے کہ ہر روز ایک شخص، بموجب حصّہ کے صندل کی لکڑی مول لے کر اس جزیرہ ایک بت آنا ہے۔ اعتقاد اس کا دل میں رکھتے ہیں۔ خلاف مذہب اپنے کو اس میں جانے نہیں دیتے ہیں۔ اتوار کے دن بائیسویں تاریخ اپریل ۱۸۳۸ء عیسوی کے ایک چھوٹی کشتی پر سوار ہو کر جزیرہ الفنٹا میں گیا۔ زبان ہندی میں نام اس کا گورہ پوری اور بمبئی سے چار کوس کا فاصلہ تھا۔ ایک پہاڑ دیکھا اس پر ہاتھی کے قد برابر ایک ہاتھی پہاڑ سے تراشا۔ اور ایک بت خانہ نفیس بھی پہاڑ کا تراشا ہوا تھا۔ اسی طرح اور بہت مکان گرے پڑے تھے۔ اور بت بڑے بڑے پہاڑ کے ترشے نظر پڑے، عجیب و غریب تھے۔ اب شاہ لندن نے ایک شخص اس کی نگہبانی کے لئے مقرر کیا۔ قرینہ سے ایسا ثابت ہوتا کہ مقام پرستش ہندوؤں کا تھا۔ زمانۂ سابق میں خوب تیار و آباد ہو گا۔ بعضوں کے کلام سے ثابت ہوا کہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اُن بتوں کو توڑ ڈالا۔ بعضوں نے کہا، نہیں پرتگیزوں نے اپنی عملداری میں اس بت خانہ کو کھودا۔ راست و دروغ بگردن راوی میرے نزدیک قول دوسرا قرین صداقت ہے۔ اس واسطے کہ پرتگیزوں کو بت اور بت پرستی سے کمال نفرت ہے۔ یہ سیر و تماشا دیکھ کر شام کو ایک ناؤ پر سوار ہو کر اپنے مقام پر آیا۔ جب تلک میں بمبئی میں رہا شام کو سیر کرتے ہوئے پریٹ کے کنوئیں تک ضرور جاتا۔ عورتیں ہندوستان کی جو کنوئیں پر پانی بھرنے آتیں، صورت شکل میں فتنہ روزگار تھیں۔ زیور اور ریشمی لہنگے پہنے ہوئے چھم چھم کرتی آتیں۔ دیکھنے والوں کا ہوش اڑا لے جاتیں جتنا حسن و جمال بمبئی میں تھا، ہندوستان میں کہیں نہیں نظر آیا۔[۲]

تیسویں تاریخ اپریل کی ٹون ہال میں جو قلعہ کے اندر تھا بندہ تماشا دیکھنے گیا۔ دو تین بت پتھر کے ترشے کھڑے تھے ایسے خوب کہ پھر میں نے ویسے کہیں نہ دیکھے۔

---

[۱] ELEPHENTA [۲] ٹاؤن ہال

کئی سطر عبارت ہندوی پتھر پہ کھدے۔ میں نے کیفیت حال بتوں کی استفسار کی۔ لوگوں نے یہ بات کہی، ایک انگریز سیاح ہندوستان سے ان کو لایا ہے۔ بطریق سوغات لندن لیے جاتا ہے۔ فی الواقعی استاد نے ان کو ایسا تراشا کہ ہر ایک قابل تماشا تھا۔ ایک دن پرنگل صاحب نے مالکم صاحب کے مکان پر میری دعوت کر کے بلایا۔ میں بموجب فرمانے ان کے مالکم صاحب کے مکان پر گیا۔ کئی صاحب اور بھی موجود تھے۔ مالکم صاحب اور سب مجھ سے باخلاق پیش آئے، عزت سے بٹھلایا اپنے ساتھ کھانا کھلایا۔ پھر مالکم صاحب نے پرنگل صاحب کی طرح میرے حال پر عنایت فرمائی۔ ازراہ اشفاق یہ بات ارشاد کی، جو کچھ تم کو درکار ہو۔ بے تکلف ہم سے ظاہر کرو، تاکہ ہم اس کو حاضر کریں، تم سے شرمندہ نہ رہیں۔ میں نے کہا آپ کی عنایت میرے حق میں کافی ہے۔ دل میں کوئی آرزو نہیں باقی ہے کہ آپ سے بیان کروں۔ بعد ان باتوں کے میں نے پرنگل صاحب سے کہا کہ بندہ پرسوں قصد رکھتا ہے یہاں سے روانگی کا۔ یہ کہہ کر اپنے مقام پہ آیا۔ چھبیسویں تاریخ اپریل کی پرنگل صاحب کے پاس رخصت ہونے گیا۔ مصوّر اپنے ان سے بخشوائے۔ اس وقت وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میرے بھی آنسو نکل آئے، ہم دونوں بے اختیار روئے۔ پرنگل صاحب کے بھائی کلکتہ میں تھے۔ دو تین قطعہ خط ان کے نام کے لکھ کر مجھ کو دیئے میں رخصت ہو کر گھر آیا۔ راہ خشکی سے کلکتہ کا ارادہ کیا۔ سواری کے لئے گھوڑا تلاش کرنے لگا۔ وہاں گراں قیمت بکتا تھا اس سبب سے نہ لیا۔

٨

بمبئی سے کلکتہ

ستائیسویں تاریخ اپریل کی ناؤ پر سوار ہو کر آگے چلا۔ اس پر ایسا ہجوم آدمیوں کا تھا کہ جنبش کرنا محال ہوا۔ ہزار خرابی سے نو کوس بعد نیچ کی میں پہنچ کر اترا۔ وہاں سے ڈہرہ[۱] پہاڑ کا تین کوس تھا۔ دوسرے دن پا پیادہ بارہ کوس راہ چل کر بڑگاؤں تک آیا اور مقام کیا۔ تیسرے دن پھر بارہ کوس کی منزل طے کر کے پونا میں داخل ہوا پنولی سے یہاں تک زمین اور پہاڑ سبزہ زار سڑک وسیع اور صاف ہموار تھی۔ قرینے سے دریافت ہوتا کہ گھی اس راہ سے آتی جاتی۔ یہ رستہ مانند راہ ولایت لندن کے تھا میں نے پونا پہنچ کر ایک دن مقام کیا۔ یہ شہر پرانا ہندوؤں کا لب دریا ہے ہر ایک مکان ہندوؤں کا رفیع الشان بنا ہے۔ چھاؤنی انگریزوں کی شہر سے باہر دو کوس کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں میں نے چاہا گھوڑا خرید کرنا مگر قابل سواری کے ہاتھ نہ لگا۔ لاچار وہاں سے پیدل روانہ ہوا سات کوس طے کر کے موضع لونی میں پہنچا۔ بعد پونا کے راہ میں نشیب و فراز تھا۔ دو عورتیں مرہٹوں کی نوجوان گھوڑوں پر سوار ہتھیار باندھے جاتیں۔ عجب عورتیں کہ جرات و مردانگی میں مردوں سے سبقت لے گئیں لونی سے گیارہ کوس چلا۔ کرٹے گاؤں میں آکر ٹھہرا۔ صبح اٹھ کر بعادت مقرری راہ چلتا تھا۔ وقت دوپہر اور شدت دھوپ کا ہوا۔ ہزار خرابی کے ریت کے جنگل میں قدم اٹھاتا

---

[۱] لفظی معنی "نشیب" یہاں پہاڑ کا دامن مراد ہے۔

تھا۔ ناگاہ ایک طرف غول آہوؤں کا نظر آیا۔ ایک ان میں سے سیاہ رنگ کا تھا۔ میں نے چاہا شکار کرنا اس کا۔ اس خیال سے اس طرف جاکر ایک گولی ماری۔ اس ہرن کے لگی۔ مگر باوجود گولی کھانے اور زخمی ہونے کے بھاگا۔ میں نے یہ سمجھ کر کہ کہیں گر پڑے گا اس کا پیچھا کیا۔ یہاں تک کہ دوڑتے دوڑتے دور تک گیا کوہستان اور ریگستان میں پہنچ کر تھک گیا۔ ہرن نظر سے غائب ہو گیا۔ دوڑنے اور دھوپ کی گرمی سے ایسا غلبہ پیاس کا ہوا کہ قریب ہلاکت پہنچا بلکہ مرنے میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔ مگر صبر کر کے ایک درخت سایہ دار کے تلے لیٹا۔ لیٹنے کے ساتھ ہی بے ہوش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد جب ہوش ہوا۔ پانی کی تلاش میں چلا۔ دور سے ایک تلاب دیکھا قریب اس کے جاکر سوکھا پایا مگر جا بجا کیچڑ چہلا تھا۔ گڑھوں میں ہاتھ پاؤں ڈال کر پانی ڈھونڈنے لگا حسب اتفاق ایک گڑھے میں کیچڑ ملا ہوا پانی تھوڑا سا ملا جلدی سے اس میں منہ ڈال کر گدلا پانی پیا۔ میرے نزدیک آب حیات سے بہتر تھا گویا اس کے پینے سے دوبارہ زندہ ہوا۔ بعد اس کے اپنے تئیں اس گڑھے میں گرا کر سارا بدن تر کیا۔ پھر اس درخت کے سایہ میں آکر لیٹا اور سویا۔ شام کو آگے چلنے کی نیت کی مگر اعضاء نے یارائے حرکت نہ دی۔ لاچار وہاں رہ گیا رات کے کھانے کو دو میناؤں کا شکار کیا۔ آگ چقماق سے نکال کر گوشت ان کا کباب کر کے کھایا اور اسی گڑھے سے پانی پی کر رات کو وہیں سو رہا۔ ہر چند خوف جانوروں درندہ سے نیند نہ آتی مگر جوں توں کر کے رات بسر کی۔ صبح اٹھ کر راہ راست تلاش کرنے لگا ڈھونڈتے ڈھونڈتے رستہ پتا پہنچا۔ دوپہر کو سپا میں پہنچ کر ٹھہرا۔ دودھ دہی میٹھے کو جی چاہا۔ ہر چند تلاش کیا پر اس اُجاڑ گاؤں میں ہرگز میسر نہ آیا۔ فقط دال خشکے پہ قناعت کی۔ رات وہاں کاٹی۔ علی الصباح اٹھ کر چلا۔ راہ میں قافلہ بنجاروں کا دیکھا۔ عورت لڑکے ملا کر قریب دو سو آدمیوں کے تھے۔ اناج شکر گھی اور جنس بیلوں اور چھکڑوں پر لادے

تھے۔ کئی گائے، بکریاں اور کتے ہمراہ رکھتے۔ میں مدت سے جویائے صحبت اس قوم کا تھا۔ ملنا اتفاقیہ کا غنیمت جان کر ان کے ساتھ ہوا اور کہا کہ میں ارادہ رکھتا ہوں تمہارے ساتھ چلنے کا۔ انہوں نے پہلو تہی کیا کہ ہم آہستہ آہستہ منزل چلتے ہیں۔ آپ قطع مسافت میں تیز روی رکھتے ہیں۔ اس صورت میں ہمارا تمہارا ساتھ نہ نبھے گا۔ میں ان کی پیروی پر راضی ہو کر ساتھ لگا۔ منزل بمنزل جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ہرڑبے میں پہنچا۔ آخر صحبت برآر نہ ہوئی۔ دیکھنے حرکات بد اُن کی کے تاب نہ آئی۔ تفصیل اس کی یہ کہ وہ بنجارے باوجود ہندو تھے مگر بیلوں چھکڑوں اور گونِ[1] لدے ہوؤں کو کمال تکلیف دیتے یعنی اگر بیل ساری منزل میں سے کہیں ٹھہر کر چلتے۔ وہ بے رحم اتنا پیٹتے کہ بیٹھ اور پیٹ بیلوں کے زخمی ہوتے۔ تو بھی وہ پیٹنے سے باز نہ آتے۔ جب مقام پر پہنچے، تھوڑا سا گلو سہ دے کر چرنے کو چھوڑ دیتے۔ ہرگاہ وہ بیل تمام دن محنت بار برداری میں رہیں۔ شام کو دانہ چارہ آدھا پیٹ پاویں۔ کیونکہ زیادہ بوجھ اٹھاویں اور جنگل میں خاک چریں کہ قدم اٹھانے کی طاقت نہ رکھیں۔ آپ وہ بنجارے چھکڑے یا بیل پر سوار مقام تک پہنچتے کھانے مزیدار مرغن پکا کر کھاتے اور گھی شکر ملا کر ناک تک بھر لیتے رات کو بی بیاں اپنی گود میں لے کر سوتے۔ زندگی کے مزے اڑاتے۔ اس سے زیادہ کم بختی اور بے رحمی اور کیا ہے کہ بیلوں بے زبانوں باربرداروں کو بھوکا پیاسا رکھتے آپ پیٹ بھر کھا کر جورو کے ساتھ سو رہتے۔ دوسرے دن پھر انہی پر سوار ہو کر آگے چلتے اور تھوڑے توقف میں بہت سا مارتے۔ میں حال ان کا دیکھ کر سراپا حیرت ہوا۔ اگر ان کے مذہب میں بیل کا گوشت کھانا جائز ہوتا نہیں معلوم کیا مفسدہ برپا کرتے اور بیلوں کو کس طرح ستاتے۔ گاؤ پرستی ان کے ہاں حکم شاستر ہے

---

[1] ہندی لفظ بمعنی بوری بوجھ مراد ہے۔

اس پر یہ حال ابتر ہے۔ شاید اگر یہ حکم نہ ہوتا، ہر ایک بیلوں کے حق میں قسائی[1] بنتا۔ یہ طرفہ ماجرا ہے اور قصہ نیا ہے کہ آپ ان بے زبانوں پر اتنا ظلم و ستم کرتے ہیں۔ اور انگریزوں اور مسلمانوں کو گاؤ خوری پر طعنہ دیتے ہیں جو کوئی بیل کو ذبح کرنے بہتر اس سے کہ تمام عمر بار برداری اور محنت فاقہ کشی میں رکھے انگریز کھلانے نفیس بیلوں کو کھلا کر پال لیتے ہیں بعد اس کے ایک جائے مقرر پر جا کر پیچ سے ایک پتھر ان کے سر پر مارتے ہیں بیل فی الفور مر جاتا ہے۔ کچھ صدمہ اور رنج نہیں پاتا ہے۔ اس صورت میں کس کا ظلم زیادہ ہوتا ہے اور قصور کس کا بہت پایا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ میں برہمی پہنچ کر تاب بے رحمی ان کی نہ لایا۔ وہاں سے ساتھ ان کا چھوڑ کر آگے چلا۔ بارہ کوس چل کر دہ گاؤں میں آیا۔ وہاں سے نو کوس راہ چل کر اورنگ آباد پہنچا۔ ٹامس صاحب کپتان رسالے ساتویں گھے نے جکس صاحب کو ایک خط لکھا تھا۔ وہ میرے پاس بندھا تھا۔ جکس صاحب اورنگ آباد میں رہتے۔ نظام کی پیدل فوج میں کپتان تھے خیال آیا کہ ان کے پاس جاؤں خط ان کا ان کو پہنچاؤں۔ پھر دل نے یہ کہا اگر تو خط ان کے پاس لے گیا وہ اپنے مکان پر اُتار کیں گے۔ تکلیف مہمانداری کی اٹھاویں گے اور اس شہر میں دو تین روز رہنے کا ارادہ تھا اس سبب سے یہ بہتر معلوم ہوا کہ پہلے کہیں اتروں بعد اس کے خط ان کے پاس لے جاؤں۔ قریب دروازہ شہر پناہ کے ایک فقیر کا مکان تھا۔ وہ صاحب کمالوں میں مشہور وہاں تھا۔ میں بھی لباس بدویوں عرب کا پہنے ہوئے تھا۔ اور صورت فقیروں کی رکھتا۔ وہاں جا کر سلام کے بعد کہا۔ میں مسافر اس شہر میں تازہ وارد ہوا ہوں۔ اترنے کی جگہ چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کیا مضائقہ اُتر رہنے کا۔ اس درخت کے نیچے اُترو مگر میں مقید مہمانی کا نہیں رکھتا ہوں۔ تم آپ اپنے کھانے پینے کا فکر کرو۔ میں غنیمت سمجھا درخت

---

[1] قصاب

کے نیچے کمل بچھا کر بیٹھا۔ رات بھر وہاں رہا۔ صبح اُٹھ کر دولت آباد جانے کا قصد کیا۔
اس واسطے کہ قریب قلعہ دولت آباد کے مقبرہ شاہ اورنگ زیب عالمگیر اور مزار دیو[1]
کامل کا تھا۔ اورنگ آباد سے دولت آباد نو کوس کا فاصلہ رکھتا۔ گٹھڑی کپڑوں کی
اور لوٹا تانبے کا شاہ صاحب پاس لے جا کر کہا میرا قصد ہے اورنگ آباد جا کر
زیارت مزار عالمگیر اور ولیوں کی۔ لہٰذا امیدوار ہوں کہ ایک دو روز اسباب اپنا
امانتاً آپ کے پاس رکھوں۔ انہوں نے کہا بہتر کیا حرج ہے۔ لیکن جس دن سے اس
حاجی پاجی نے مجھ کو فریب دیا۔ میں نے ہر کسی کی امانت رکھنا موقوف کیا۔ ایسا نہ
ہو تم بھی ویسا کرو اور مجھ کو ستاؤ۔ میں نے پوچھا۔ اس حاجی نے آپ کو کیا ایذا دی
اور خدمت شریف میں کیا تقصیر کی۔ سابق ازیں ایک حاجی فقیروں کی صورت میرے
پاس آکر اترا۔ تمہاری طرح دولت آباد جانے کے وقت اسباب اپنا میرے تفویض
کر گیا۔ جب وہاں سے پھر اسباب اپنا لیا۔ پھر اس کافر نے دغا دیا۔ اشرفی
اور روپوں کا دعویٰ باطل کیا۔ محکمہ کوتوالی میں نالش کر کے مجھ کو گرفتار کروایا۔
از انجا کہ جھوٹ کو سچ کے سامنے فروغ نہیں ہوتا آخر دعوے بیجا سے شرمندہ
ہو کر آپ ہی قید ہوا۔ اس سبب سے ڈرتا ہوں کہ مبادا تم بھی وہاں سے پھر
کر دعویٰ روپوں کا کرو اور میری عزت پر حرف لاؤ۔ مجھ کو اس کلام سے شبہ ہوا۔
کہ شاید یہ شخص چور ہے جو بصورت فقیر بنا۔ اس کی امتحان کے لئے کنارہ گیا
شیشے کی پچاس گولیوں کو روپے پیسے کی طرح ایک پتھر سے گول اور چپٹا کیا اور ایک
روپیہ بازار سے خوردہ کر کے پیسے ان میں ملائے۔ ایک تھیلی میں رکھ کر منہ اس کے
پر لاکھ لگائی۔ اس پر مہر اپنی کر دی۔ اس کو گٹھڑی میں رکھ کر شاہ صاحب پاس لے گیا۔
بطریق امانت ان کے سپرد کر کے رخصت ہوا۔ انہوں نے گٹھڑی ہاتھ میں لی گراں وزن
سمجھ کر دو چار سواروں کے سامنے جو ساتھ ان کے بھنگ پیا کرتے تھے۔ بات کہی تم

سب شاہد رہو اس شخص کی گٹھڑی میں نہیں روپیہ پیسہ ہے یہ کہہ کر راہی ہوا۔
دولت آباد جا پہنچا۔ راہ میں کئی سرائیں دیکھیں شاہ عالمگیر کی بنوائیں۔ بہ سبب بے مرمتی
کے ہر ایک جا بجا سے ٹوٹی اور خراب پڑی۔ یقین کہ اورنگ آباد اور دولت آباد زمانہ
سابق میں خوب آباد ہوں گے اس لیئے کہ اب تک نشان عمارتوں قدیم کا ہے باقی۔
قریب اورنگ آباد شاہ عالم گیر نے ایک مکان عالیشان بنوایا ہے۔ چاروں طرف
قطعات مستحکم رکھتا ہے۔ اندر اس کے ایک حوض مقابل اس کے ایک مسجد
فلک توامان ہے۔ رہتے ہیں اس میں قرآن خواں۔ مسافر وہاں جا کر ٹھہرتے ہیں۔
حوض سے پانی پی وضو کر کے نماز مسجد میں پڑھتے ہیں۔ میں بھی اس مکان میں
گیا سہ پہر بیٹھا رہا بعد اس کے ایک ولی کے مزار پہ گیا۔ نام اس کا فراموش ہوا۔ مجاور
درگاہ کے ساتھ ہوئے۔ تربت تک لے گئے۔ گنبد کے اندر انڈا شتر مرغ کا لٹکتا
برابر اس کے جھبّا[2] مقیش کا گلدستہ کی طرح لگا۔ چادریں پھولوں اور کمخواب کی تربت
پر بچھیں۔ ایک طرف بتیاں اگر کی جلتیں۔ میں نے اندر جا کر فاتحہ پڑھا اور تھوڑی
دیر ٹھہرا۔ تین روپے کی مٹھائی مول لے کر فاتحہ دے کر مجاوروں کو تقسیم کر دی۔
بعد اس کے کچھ خیرات بھی ان کو دی۔ انہوں نے تھوڑے پھول اور ٹکڑا چادر
تربت کا پھاڑ کر مجھ کو تبرک دیا۔ میں اس کو لے کر باہر آیا۔ ہر چند ارادہ یہ تھا کہ سب
ولیوں کی قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھتا مگر سوال اور تقاضائے مجاوروں سے تنگ آیا۔
اور خوف صرف زائد سے باز رہا۔ فقط اورنگ زیب کے مقبرہ پہ گیا۔ گرد قبر کے کٹہرا
لکڑی کا لگا۔ مقبرہ چنداں نفیس نہ تھا۔ میں دیکھنے اس کے سے عبرت پذیر ہوا کہ یہ بادشاہ
ہندوستان کا کتنے ملک زور شمشیر سے اپنے قبضہ میں لایا۔ اپنے زمانہ میں کس طرح
غلبہ رکھتا تھا۔ اب خاک میں ملا یار لئے حس و حرکت جنبش دست و پا کی طاقت

---

[2] ہندی لفظ جس کے معنی اگچھا یا آویزہ ہے۔

نہیں رکھتا۔ دنیا عجب مقام ہے ہر ایک کا یہی انجام ہے یہ سوچ کر باہر آیا تھوڑی دور چلا ایک باغ نظر آیا۔ اس کے اندر جا کر دیکھا، ہر طرف دیوار پختہ رکھتا۔ ہر سمت مکان نفیس بنا۔ درمیان باغ کے مقبرہ زیب النساء دختر عالمگیر کا تھا۔ وہ سارا معہ تربت کے سنگ مرمر کا تھا۔ گرد قبر کے حوض بھی اسی کا اور ہر طرف تربت کے فوارہ پانی کا۔ چنانچہ ایک فوارے میں میں نے منہ لگا کر پھونکا، دوسرے فوارے سے پانی نکلا۔ بہ سبب بے حرمتی کے گرد جمی تھی بلکہ ہر چیز میں شکستگی آ گئی۔ اغلب کہ اب بھی اگر کوئی درستی کرے۔ آب و تاب اوّل پہ آ دے۔ فوارے بھی جاری ہو دیں اس لیے کہ ابھی تک نقصان سے بچیں ہیں۔ سبحان اللہ جب تیار ہوا ہو گا کیا نفیس بنا ہو گا کہ اب تلک اس میں وہی رونق باقی ہے۔ طبیعت کو دیکھنے سے فرحت آتی ہے ان دنوں نظام الملک آصف جاہ حاکم حیدر آباد سنگ مرمر وغیرہ وہاں کھدواتا ہے اور اپنے باپ کے مقبرہ پر لگاتا ہے اگر چندے یہی حال رہے گا یہ مقبرہ ویران اور برباد ہو گا۔ ایک دن تھا کہ باپ زیب النساء کا بدبہ عالمگیری اور کشور کشائی رکھتا کسی کو دم مارنے کا امکان نہ تھا۔ آج وہ دور ہے کہ اس کے لخت جگر کے مقبرے سے پتھر کھود لئے جاتے ہیں۔ خوف خدا دل میں نہیں لاتے ہیں۔ وہ کچھ خبر نہیں رکھتا۔ یہاں سے ثابت ہوا کہ بموجب مذہب سلیمانی یوسف کمل پوش کے ہر امر ہر ایک وقت پر منحصر رہے۔ برا ہو یا بہتر۔ ایک وقت وہ تھا کہ یہ مقبرہ بنا۔ ایک یہ ایّام ہیں کہ خراب ہوا۔ دنیا مقام پاداش ہے۔ نہ جائے بود و باش مغرور وغیرہ نہ کرے اپنے کاموں کا کہ ایک وقت سزا پاوے گا۔ اس باغ سے باہر ہے ایک تالاب اور بہت سے باغ اور عمارات قدیمی۔ میں نے ان سبھوں کی گنتی نہ کی۔ سارا دن ان مکانوں کی سیر میں آخر کیا۔ دوسرے روز حال عجیب ایک پہاڑ کا سنا کہ دیووں کا تراشا تھا۔ نہایت مشتاق ہو کر اس کو سیر کرنے گیا۔ پہاڑ دیکھا آدھ کوس کے گھیر میں تھا۔ اس پر مکانات عالیشان سہ منزلے پہاڑ سے ترشے بنے۔ ستون بھی پتھر کے تھے۔

بت بڑے بڑے قد آدم بلکہ زیادہ اس سے۔ سنگ کوہ کے تراشے جا بجا کھڑے۔ ایسا ہی ایک طرف دیوہرا پہاڑ کا ترشا بنا۔ ہاتھیوں پیل قد کے سر پہ رکھا۔ وہ بھی پہاڑ سے ترشے تھے۔ قد و قامت میں برابر ہاتھی کے تھے۔ اندر بت خانہ کے ایک بڑا بت سنگی رکھا۔ ہندوؤں میں کیلاس نام اس کا مشہور ہوا۔ برہمن اس میں رہتے ہیں۔ شام کو چراغ اس میں جلاتے ہیں باہر سے وہ بت خانہ چھوٹا دکھائی دیتا ہے مگر معتبر لکھے جگہ ہزاروں آدمیوں کی اور بہت وسعت رکھتا۔ تصویر جانوروں کی مثل بندر وغیرہ کے ترشی تھیں۔ بخدا میں نے ایسی مورتیں کہیں نہیں دیکھیں۔ در حقیقت یہ کام بشر کا نہ تھا شاید جنات اور دیووں نے تراشا۔ حال اس کا سن کر میں قصہ جانتا تھا آنکھوں سے دیکھ کر یقین لایا اگر لاکھوں آدمی برسوں تراشتے۔ ویسی صورتیں اور مکان ہرگز نہ بنا سکتے۔ اندر اس بت خانہ کے نہر تھی۔ جا بجا نہانے ہندوؤں کی ہندو ملکوں دور و دراز سے یہاں آ کر نہاتے ہیں۔ اپنے زعم میں گناہوں تمام عمر سے اس غسل سے پاک اور مبرّا ہو جاتے ہیں۔ اسی سیر و تماشے میں پہر دن باقی رہا۔ میں اطراف پہاڑ کی بلندی نہ دیکھنے پایا۔ اس لئے قصد شب باشی کا وہاں کیا۔ چھرے بندوق سے کئی کبک شکار کر لایا۔ نمک ایک فقیر سے لے کر ان کا کباب بنایا۔ روغنی روٹی[1] کے ساتھ جو پاس بندھی تھی کھا کر پانی اس چشمہ سے پیا اور مقام کیا۔ رات کے وقت اکثر اگو اور جگنو اُڑتے اور وہ بت دیووں کی طرح ہیبت ناک نظر آتے مگر دیو پری اصلی کا نشان نہ پایا۔ صبح اٹھ کر پھر سیر میں مشغول ہوا۔ اکثر مورتیں ایسی نظر آئیں کہ بعضی سر بعضی دھڑ نہ رکھتیں۔ دریافت ہوا کہ شاہ عالم گیر نے توپ کے گولوں سے ان کو بے سر و پا کیا۔ کسی کا سر اڑ گیا۔ کسی کا پاؤں اکھڑ گیا۔ مکانات ٹوٹے۔ ستون گرے پڑے۔ ایک سمت ایک مکان تھا۔ ترشا پہاڑ کا اس کے گنبد پاس

---

[1] اندر سے

کڑیاں ترشیں پتھر کی لگیں، بعینہٖ کڑیاں چوبی معلوم ہوتیں۔ اس میں ایک بت عظیم الشان تھا، وہ مکان کوٹھری بڑھئی کی کہلاتا۔ لوگوں سے معلوم ہوا جس کی یہ سب صنعت تھی، اسی کی یہ صورت ہے۔ ایک نجار تھا جس نے یہ پہاڑ تراشا، تصویر یا ایک بجنیل کی بڑھئی کی کوٹھری میں کھڑی ہیبت ناک بنی تھی۔ لاغری اور نحافت سے ہر جوڑ بدن کا نظر آتا۔ ایک روپیہ ہاتھ میں لئے مٹھی زور سے بند کئے تھا۔ دو ہندو وہاں رہتے تھے، ان سے میں نے حالات اس پہاڑ کے پوچھے ــــ چونکہ عقل و خرد نہ رکھتے، حال مفصل بیان نہ کر سکے۔ اسی قدر کہا کہ یہ دیوؤں کا کام ہے، ہزاروں برس سے بنا۔ اس صحرا میں ایک تالاب بھی تھا اور میدان میں وسعت زیادہ۔ اس قرینے سے مجھ کو ثابت ہوا کہ سابق وہ مقام عملداری ہندوؤں میں آباد ہوا ہوگا، گردشِ زمانہ اب ویران ہوا۔ نام و نشان باقی نہ رہا۔ میں نے بہت ملکوں میں سفر کیا مگر ویسے بت اور بت خانہ اور پہاڑ کہیں نہ دیکھا۔ لہذا بندہ شائقوں کو اطلاع دیتا ہے کہ جو کوئی اورنگ آباد کی طرف جاتا ہے اس کو چاہیئے کہ اس پہاڑ پر جاوے سیر تماشا وہاں کا ضرور دیکھے۔ اورنگ آباد سے اُتر طرف تھا، بارہ کوس فاصلہ رکھتا۔ وہاں سے پھر کر قلعہ دولت آباد میں آیا، صورت اس کی یہ کہ ایک پہاڑ تھا۔ انڈے کی طرح نیچے سے کم عرض اوپر سے چوڑا۔ حاکموں نے تراش کر اس کا قلعہ اور مکان بنوایا، جا بجا توپیں لگیں۔ بلندی میں ہمسائے چرخِ بریں۔ اگر اس قلعہ میں کوئی مثل انگریزوں کے بندوبست کرتا، کسی کو یارائے مقابلہ اس سے نہ ہوتا۔ اب اس میں قبضہ نظام الملک کا ہے۔ ویران اور خراب پڑا ہے۔ حفاظت کے لئے برائے نام سو سپاہی نجیب دروازہ پر بیٹھے ہیں، عجب سپاہی کہ بندوقیں ان کے زنگ آلودہ، کپڑے کالے میلے کچیلے پہنے ہیں۔ جب میں نے وہاں پہنچ کر اندر جانے کا قصد کیا، انہوں نے روکا کہ بے اجازت اور پروانگی

۱؎ چمگادڑ

نظام الملک کے کسی کو حکم نہیں اندر جانے کا۔ اس سبب سے میں اندر اس کے نہ جا سکا، باہر سے بلندی اور وسعت اس کی دیکھتا رہا۔ گرد دولت آباد کے دیوار شہر پناہ پختہ ہے۔ آٹھ سات ہزار آدمی اس میں بستا ہے۔ جب فقیر ان سیروں سے فراغت کر چکا، اورنگ آباد میں جس فقیر کے مکان پر اترا تھا، آنے کا ارادہ کیا۔ راہ میں ایک عورت نوجوان مرہٹن پری زاد زعفرانی اطلس کے کپڑے پہنے ہوئے ملی، نیزہ ہاتھ میں لئے ایک کمیت۱؎ گھوڑے پر سوار جاتی تھی۔

جملش چو در نیم روز آفتاب
کرشمہ کناں نرگس نیم خواب

عجب حسن و جمال درخشاں رکھتی کہ دیدہ خورشید نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھی، چہرہ اس کا درمیان بالوں عنبریں کے یوں چمکتا جیسے سورج کالی گھٹا سے نکلا۔ زیور خورشید طلائی بالوں میں گندھا۔ عجب کیفیت دکھاتا۔ انداز اس کا معشوقانہ تھا، دل دیکھتے ہی لوٹ جاتا۔ جیدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتی، فتنہ برپا کرتی۔ فقیر یونہی جادو چشم ہوا۔ آئینہ سا حیران ہو کر دیکھتا رہا۔ جب قریب آ پہنچی میں نے بے اختیار شوق سے یہ بات کہی، اگر اجازت پاؤں، کچھ آپ کی خدمت میں عرض کروں۔ نگاہ تیز سے میری طرف دیکھا اور اشارے سے حکم کیا۔ میں نے کہا اس مصوّر بے چوں پر صد آفریں کہ تیری یہ تصویر کھینچی نازنین۔ اس کلام سے وہ معشوقہ ہنس کر کہنے لگی۔ اے فقیر صاحب کمال سچ بتا کہ عمل مرہٹوں کا ہندوستان میں کب ہوگا اور کتنے دنوں میں انگریزوں پر زوال آوے گا۔ میں نے کہا اے جان جب میرا نکاح تیرے ساتھ ہووے گا، عمل انگریزوں کا ہندوستان میں نہ رہے گا۔ اس نے کہا فقیر کو نہ

۱؎ سیاہی مائل سرخ رنگ کا گھوڑا

چاہیئے۔ ایسی خوش طبعی اور بہزاد میں نے کہا تمہاری خاطر نازک میں رنج نہ آوے سابق میں رہتا تھا۔ بیچ صحبت پریوں کے۔ ہر وقت ان کے جمال و حسن کا تماشائی اور ہم کلام تھا۔ شامت اعمال سے وہاں سے نکلا۔ پھر وہاں جانے کی آرزو رکھتا ہوں۔ خدا سے استمداد چاہتا ہوں۔ یعنی انگلستان میں تھا۔ وہاں کی رنڈیوں پری وشوں کا جمال دیکھتا۔ اس وقت جو تجھ کو دیکھا۔ دل میں ولولہ آیا۔ اس سبب سے حرف شوق بے اختیار زبان سے نکلا۔ بعد اس گفتگو کے اس معشوقہ رعنا نے ہوا کی طرح گھوڑا تیز کیا اور یوسف حلیم کمل پوش آہ و فغاں کرتا اورنگ آباد کی طرف چلا۔

جب قریب شہر آ پہنچا ایک پرانا مقبرہ دیکھا۔ وسعت اور صفائی خوب رکھتا۔ دو تربوز مول لے کر پانی ان کا پیا۔ اتنے میں ایک فقیر جو وہاں رہتا تھا۔ ملا۔ بہت اخلاق سے پیش آیا۔ حقہ پانی سامنے لایا۔ تخمیناً نوّد[1] سالہ تھا۔ مگر سن اپنا سو برس کا بتلایا۔ نور الٰہی پیشانی اس کی سے چمکتا۔ عقل و دانائی سے بہرہ کامل رکھتا۔ ایسا خوش زبان اور شیریں بیان تھا کہ بندہ صحبت اس کی غنیمت سمجھا۔ اس مقبرہ میں دو قبریں تھیں۔ ساتھ ساتھ اس کی جا کر دیکھیں۔ حال قبروں کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے حال صاحب قبر کا اپنا سا پایا ہے اس سبب سے یہاں رہنا اختیار کیا ہے۔ اسی گفتگو میں تھا کہ میں نے ایک تربوز اس کے آگے رکھا اور تماکو تھوڑا اپنے پاس سے نکال چلم بھر کر اس کے آگے کیا۔ اور مستفسر حال اس کے کا ہوا۔ اس مرد دانا نے مجھ کو فقیر جان کر کہا۔ اگرچہ میں یہ شیوہ و عادات نہیں رکھتا ہوں کہ کسی سے حال اپنا بیان کروں۔ لاکن تم کو زیادہ شائق پاتا ہوں قصہ اپنا کہہ سناتا ہوں۔ میری کیفیت یہ ہے کہ لڑکپن سے جوانی تک سایہ پدری میں فارغ البال اور آسائش سے رہا۔ سوائے تلاوت قرآن پاک اور

---

[1] لہ: نوّے

تحصیل فنون سپہ گری کے پچیس برس تک کوئی کام نہ رکھتا۔ باپ میرا نظام الملک کی سرکار میں امتیازیوں میں نوکر تھا بلکہ اس زمانے میں کوئی بہ سبب آسودگی کے نوکری کی پروا نہ رکھتا۔ رئیس قدردان جویائے اہل سیف و قلم کے رہتے۔ ہر ایک کی بقدر لیاقت عزت کرتے۔ سلطنت ہندوستان میں انگریزوں کا کچھ دخل نہ تھا۔ کوئی ان کا نام و نشان نہ جانتا۔

حسب اتفاق ایک میرے عزیز کی برات تھی۔ محفل رقص و سماع گرم ہوئی۔ میں بھی بمقتضائے قرابت شریک صحبت ہوا۔ ناچ ایک رنڈی کا دیکھتا رہا۔ نام اس کا تراب کنور تھا۔ ایکبارگی تیر عشق اس کی کا دل میں لگا۔ تمام رات اس کے منہ پر ٹکٹکی باندھے رہا اور پوشیدہ اس سے کہا کہ فلانے دن میں کسی باغ میں محفل جماؤں گا۔ دوست آشناؤں کو بلاؤں گا۔ چاہتا ہوں کہ تم بھی اس دن شریک محفل ہو۔ حال دوستوں پر مہربانی کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا ضرور آؤں گی۔ مجھ کو تو بے تابی تھی۔ روز مقرر مجلس آراستہ کی۔ دوستوں کو تکلیف تشریف آوری کی دی۔ تراب کنور بموجب وعدہ آئی۔ رات بھر محفل عشرت گرم رہی۔ اس صحبت میں مجھ کو اس پر اور زیادہ شیفتگی ہوئی۔ بہت سا زر نقد خرچ کیا۔ ذائقہ وصال سے چاشنی یاب ہوا۔ دل یہ چاہتا کہ جس طرح سے قابو پاؤں اس کے ساتھ نکاح کر لوں۔ والد بزرگوار نے حال سنا۔ وعظ و نصیحت سے سمجھایا اور اس امر بے جا سے تابمقدور منع کیا۔ جب میرے خیال میں نہ آیا۔ لاچار انہوں نے بہت روپیہ خرچ کر کے اس رنڈی کے ساتھ میرا نکاح کر دیا۔ مدت تک میں عیش کرتا رہا۔ اس کی محبت سے حظ زندگی اٹھاتا۔ بعد چند روز حضرت قبلہ گاہی نے کار سرکاری پر قضا کی۔ ساری جمع ان کی میرے ہاتھ لگی۔ میں اس روپے کا ملنا غنیمت سمجھا۔ دوستوں کی مہمانداری میں مشغول ہوا۔ ایک سال میں سب اڑا دیا۔ اس عرصہ میں

اس رنڈی کا دل ایک حریف ہم صحبت پر آیا۔ بدبات کا سامنا ہوا۔ چونکہ مجھ کو اس کے ساتھ عشق تھا۔ حرفِ شکایت زبان پر نہ لایا۔ جب سب نقد و جنس خرچ ہو چکا۔ خواب غفلت سے سمجھ کر چونکا۔ ایک گھوڑا باقی تھا۔ اس پر سوار ہو کر تلاش روزگار کو نکلا۔ سعی سفارش چاہنے لگا۔ سوائے بیس تیس روپے کے روزگار میسر نہ آیا۔ سخت حیران ہوا مگر اس کو نہ اختیار کیا۔ اس وقت اس رنڈی نے بھی راہ بے مروتی میں قدم رکھا۔ ترک صحبت کا قصد کیا۔ میں نے کہا تجھ سے میرا نکاح ہوا ہے۔ تو نے مفارقت کا کس طرح ارادہ کیا۔ جواب دیا ہم نے نکاح کو بالائے طاق رکھا۔ جب تک تو مال رکھتا۔ قابل صحبت تھا۔ اب اوقات گذاری کیونکر کرے گا۔ دوست آشنا بھی جو شریک خواں تھے۔ آنکھ چرانے لگے۔ لاچار بندے نے دنیا کے دوں سے دل اٹھایا۔ اس گوشے میں بیٹھ رہا۔

جہاں را ندیدم وفادار یے ۔۔۔ نخواہد کس از بے وفا یار یے

بہ بیدم زہر آشنائے شمار ۔۔۔ بس ست آشنائی من آمرز گار

اب میں یہاں رہتا ہوں۔ خداوند تعالیٰ کو اپنا رفیق جان کر چاہتا ہوں کہ ساری عمر اس جا رہوں اور بعد مرگ یہیں دفن ہوں۔ حال ان دو قبروں کا یہ ہے کہ ایک قبر اس میں سے ایک رئیس زادہ کی ہے۔ دوسری قبر کتے کی۔ میں نے کہا قبر کتے کی آدمی کے برابر بنانا کیا ضرور تھی تب اس نے یوں حقیقت حال کہی کہ حیدرآباد میں ایک امیر صاحب ثروت تھا۔ سرکار نظام الملک سے درماہہ بیش قرار پاتا۔ سوائے اس کے پانچ سو گھوڑے اپنے سرکار میں داغ کروائے۔ بارگیر اُن پہ مقرر کئے۔ یہ فائدہ علاوہ درماہے اس کے سے تھا۔ ایک بیٹا عاشق مزاج رکھتا۔ بعد مرنے اس امیر کے سارا مال و متاع بیٹے کے ہاتھ لگا۔ وہ نوجوان اور کم سن تھا۔ چند بائی کی ایک نوچی پر عاشق زار ہوا۔ تھوڑی مدت میں سب مال و اسباب

لٹایا۔ جب نقد و جنس باقی نہ رہا۔ گھوڑوں کو بیچا۔ آخر چندو لال نائب نظام الملک نے اس کی بدوضعی سے آگاہ ہو کر نوکری سے معزول کیا۔ ناچار یہ شخص حیران پریشان ہو کر گھوڑے پر سوار ہوا۔ ملکوں دور و دراز میں مثل شاہجہان آباد اکبر آباد وغیرہ بتلاش روزگار پھرتا رہا اور ایک کتا ولائتی ساتھ لیا۔ نام اس کا شیرا تھا۔ حسب اتفاق کہیں روزگار خاطر خواہ نہ ہوا۔ اورنگ آباد آ کر بسبب مفلسی کے گھوڑا بیچا اور کنج عزلت میں گوشہ نشین ہوا۔ نوبت فقر و فاقہ کی پہنچی۔ بہ سبب امارت مزاج کے طبیعت کسی سے سوال کرنے کو نہ چاہتی۔ کتا ولائتی جو رفیق تھا۔ رات کو نکلتا۔ نان بائیوں کی دوکان سے روٹی منہ میں لے کر اپنے مالک پاس لاتا۔ نان بائی کتے کی چالاکی سے حیران تھے۔ پتا اور نشان نہ پاتے۔ اورنگ آباد میں شہرہ ہوا تیزی اور چالاکی کتے کا۔ لوگوں نے پکڑنے اس کے کا فکر کیا۔ وہ کتا دن کو باہر نہ نکلتا۔ اس سبب سے کسو نے اس کا پتا نہ پایا۔ بعد چند روز کے اورنگ آباد میں حکیم[1] دار ریاست سرکار نظام الملک سے مقرر ہو کر آیا۔ اس گوشہ نشین کے بزرگوں اور حال ریاست اس کے سے خوب آگاہ تھا اس شخص نے ایک پرچہ کاغذ پر حال اپنا لکھا اور اس کے پاس بھجوایا۔ حاکم نے اطلاع پا کر بہت عزت سے اس کو اپنے پاس بلایا۔ حسب لیاقت درماہہ مقرر کیا اور اپنی بیٹی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا۔ تائید بخت سے پھر امیر ہوا۔ تھوڑے دنوں بعد کتا مرا۔ صاحب اپنے کو داغ مفارقت دے گیا۔ اس نے بہت ماتم کیا۔ عزت آبرو سے اس کو آدمیوں کی طرح یہاں دفن کیا اور مقبرہ بنوا دیا۔ برابر اس کے قبر کے اپنے لئے قبر کی جگہ تجویز کی۔ اور وارثوں سے وصیت کر دی کہ بعد از مرگ مجھ کو بھی یہیں دفن کیجیو۔ یہ قول میرا یاد رکھو۔ نہیں تو فردائے قیامت تمہارا دامنگیر ہوں گا۔ درگاہ خدا میں تمہاری نالش

---

[1] صوبہ دار

کروں گا۔ انہوں نے اقرار کیا کہ تمہارا کہنا عمل میں آوے گا۔ بعد چند روز وہ بھی مر گیا۔ بموجب وصیت وارثوں نے اس کو یہاں لاکر دفن کیا۔ ان دونوں قبروں سے ایک قبر انسان کی ہے۔ دوسری قبر کتے کی۔ حال شخص کا میرے حال سے شباہت رکھتا ہے۔ اس سبب سے یہ فقیر یہاں کا مجاور ہوا ہے۔ تابہ زندگی یہیں رہے گا۔ بعد مرنے کے بھی یہیں دفن ہوگا۔ دوستوں سے وصیت کر چکا ہوں کہ بعد مرنے کے مجھ کو اسی مقبرہ میں دفن کر دیں۔ یہ کلام دھیان رکھیں۔ اس شہر میں وہ مقبرہ کتے کا مشہور تھا۔ میں نے یہ حال سن کر دل میں خیال کیا۔ کیا اچھا کتا تھا کہ اپنے مالک کا حق نمک ادا کیا بلکہ اس نے ایسی رفاقت کی کہ عزیزوں قریبوں سے نہ ہو سکتی۔ گو کتا تھا پر سیرت میں آدمی سے اچھا تھا۔ خیال آیا میں بھی یہاں بیٹھ رہوں۔ اس درویش صاحب کمال سے جدا نہ ہوں۔ پھر دل نے کہا۔ یوسف کمل پوشی اوقات اپنی یہاں بیٹھ کر ضائع کرنا سیر دل جہان سے محروم رہنا ہے۔ لنجوں[1] کی طرح بیٹھنا۔ اوروں سے ہاتھ تاکنا جوانمردی سے بعید ہے۔ تماشائے جہاں قابل دید ہے۔ چل پھر کر کوشش بازو سے کچھ پیدا کیا چاہیئے۔ غریب و غربا کو اپنی وجہ سے آرام پہنچانا چاہیئے۔ مثل شیروں کے شکار کر کے آپ کھا اور اوروں کو کھلا۔ نہ اپنے تئیں گیدڑ کی طرح پست حوصلہ بنا۔ دل کے سمجھانے سے میں اس ارادے سے باز آیا۔ اپنے اوپر جبر کر کے اس فقیر سے رخصت ہوا۔

اورنگ آباد میں اس فقیر کے مکان پر آیا جس کے پاس گٹھری اور لوٹا چھوڑ گیا تھا۔ اس سے ملاقات کی اور گٹھری اپنی مانگی۔ وہ ظاہر میں فقیر باطن میں چور تھا۔ شیطان کو تعلیم برائیوں کی کرتا۔ چیں بہ چیں اور ترش رو ہو کر کہنے لگا۔ تم اپنا اسباب لو۔ اسی وقت میرے مکان سے نکلو۔ تم چور اور راہزن معلوم ہوتے ہو۔ اگر نہ مانو

[1] معذور دل

گے کوتوالی چبوترے میں کہہ دوں گا قید ہو گے۔ ہر چند میں نے کہا۔ حضرت مجھ سے کیا قصور ہوا جو باعث خفگی ٹھہرا۔ انہوں نے کچھ نہ سنا۔ اسی غصے میں گٹھری لا دی۔ میں نے کھول کر دیکھی۔ تھیلی پیسوں اور چپٹے شیشے کی۔ منہ پہ لاکھ بدستور لگی تھی۔ مگر مہر میرے نام کی بالکل بگڑی تھی۔ ظاہرا اس درویش مکار نے تھیلی روپے اشرفی کی سمجھی۔ لاکھ جس پہ مہر میری لگی تھی توڑ کر تھیلی کھولی۔ جب اس میں کچھ جمع نہ دیکھی۔ شرمندہ ہو کر لاکھ بدستور جما دی۔ مگر مہر میری اس کے پاس نہ تھی۔ وہ کیونکر بن سکتی۔ اس سبب سے حرف مہر کے مٹے تھے۔ ہم دیکھتے ہی دریافت کر گئے کہ اس نابکار کو بد دیانتہ لگی۔ اس لئے دل میں رنجش آئی۔ اصل یہ ہے کہ مجھ کو تجربہ اس کو دیانت داری کا منظور تھا۔ ورنہ شیشوں کی گولیوں کو چپٹا کر کے پیسوں کے ساتھ بھرنا کیا ضرور تھا۔ اب اے صاحبان عقل و شعور ملاحظہ فرماؤ کہ ان لوگوں نے ظاہر میں فقیری کا جامہ پہنا ہے۔ باطن میں چوری اور غارت گری خلق مدعا ہے۔ نہیں تو فقیر کو کیا کام تھا کہ میری گٹھری غائبانہ کھول کر دیکھتا۔ میں نے اکثر فقیروں ہندوؤں کو دیکھا کوئی الٹا درخت سے لٹکا۔ کوئی شدت گرمی میں آگ میں بیٹھا۔ اسی طرح فقرائے اہل اسلام کو بھی اپنے طور پہ عبادت میں غرق پایا۔ آخر جب امتحان کیا سب کا مکر و فریب پایا۔ جب وہ فقیر شیطان سیرت نہایت بدمزہ ہوا۔ اس کے مکان کے قریب ایک کھنڈر تھا۔ اسباب اپنا بندہ وہاں اٹھا لے گیا اور گھوڑے کی تلاش کرنے لگا۔ ایک شخص حیدرآباد کا رہنے والا نوکر نظام الملک کا اورنگ آباد میں تعینات تھا۔ اس سے حال خرید و فروخت گھوڑوں کا پوچھا۔ اس نے مجھ کو اپنا ہم دلی سمجھ کر بہت خاطر داری کر کے کہا اندک[2] صبر کرو اور چندے یہاں رہو۔ میں تمہارے لئے

[2] : فارسی لفظ بمعنی تھوڑا سا۔

گھوڑا اقدم باز ٹھہرائے دیتا ہوں۔ جہاں سے بنتا ہے۔ تلاش کئے لاتا ہوں۔
پھر کہا ایک گھوڑا چہار سال فلانے جمعدار پاس ہے۔ ہاتھ پاؤں سے صاف
ہے۔ مگر عجیب نحوست رکھتا ہے جو اس کو مول لیتا ہے نوکری سے برطرف ہوتا
ہے اور اس کے گھر کوئی مر جاتا ہے اس لئے میں تمہارے واسطے نہیں لے سکتا۔
ورنہ بہت خوب ہے اور قیمت مناسب پر ٹھہر جاتا۔ جس نے ان دنوں اس
اس کو مول لیا تھا۔ نوکری سے چھٹ گیا اور لڑکے اس کے نے انتقال کیا۔ اب
وہ ارادہ رکھتا ہے کہ گولی بندوق سے اس کو مار ڈالے۔ میں یہ سنتے ہی اس کا
طالب ہوا اور بیس روپے کو مول لیا۔ بہ جہت نحوست ہی اس شخص کے بھوکوں کا
مارا تھا۔ میرے پاس دانہ گھاس پیٹ بھر کھا کر قد و قامت خوب نکالا۔ میں چند روز
وہاں رہا کوچہ و بازار کا تماشہ دیکھا۔

ایک دن عالمگیر اورنگ زیب کی بی بی کے مقبرے پر گیا۔ فرش اور چھت
سنگ مرمر کا تھا اگرچہ سبب کہنگی کے آب و تاب اولیٰ نہ رکھتا۔ مگر تاہم بہتر اور
نقشہ اس کا مانند روضہ تاج بی بی کے تھا۔ کاریگری اور صنعتوں کے سوا وہ صفائی
میں اس سے کہیں زیادہ۔ اورنگ آباد پہاڑ کے نیچے لبا ہے۔ دیوار شہر پناہ
اور دروازہ آمد و رفت کا پختہ بنا ہے۔ اب جا بجا سے اس میں بھی نقصان آیا۔
زمانہ سابق میں خوب آباد ہوگا۔ اس سرزمین میں میوے تر و تازہ مثل نارنگی و سیب وغیرہ
پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس زمین کو تیار کرے۔ میوے ولایتی پیدا ہو دیں۔ اس زمانے
میں مکان اور عمارت اس کی ٹوٹی پھوٹی ہے۔ رئیسوں سے نام و نشان نہیں باقی
ہے۔ مگر رہنے چکلہ دار کے سے البتہ آبادی ہے۔ اس کے نوکروں ذی رتبہ سے جو
وہاں رہتے ہیں۔ سپید پوشی ہے۔ شام کو چوک میں جماؤ ہوتا ہے۔ ہنگامہ خرید و فروخت
اسباب گرمی پاتا ہے۔ رنڈیاں سات سنگار کرکے اپنے اپنے کوٹھوں، کھڑکیوں

پر بیٹھتی ہیں۔ اپنے تئیں آراستہ کرکے راہیوں کو دکھاتی ہیں۔ مرد نوجوان تماشبین
گھوڑوں پر سوار ہو کر بناؤ کرکے آتے ہیں۔ گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ رنڈیوں سے
اشارے کنائے کرتے جاتے ہیں۔ ان کا حال دیکھ کر مجھ کو افسوس آیا کہ ان میں اور
لندن کے لڑکے اور جوانوں میں فرق ہے۔ زمین و آسمان کا۔ یہ لوگ اپنی اوقات
بے جا باتوں میں برباد کرتے ہیں۔ وہ عاقل ایک لحظ تحصیل علم و ہنر سے خالی نہیں
رہتے ہیں اسی سبب سے ان کے لئے ہمیشہ ذلت و خواری بڑھتی ہے اور ان کے
واسطے ہمیشہ رونق اور ترقی ہوتی ہے بعد اس سیر و تماشے کے کپتان جاکس صاحب
کے مکان پر گیا۔ ان کے نام کا خط تامس صاحب کا لکھا میرے پاس تھا۔ وہ اس
وقت گھر میں تشریف نہ رکھتے، کہیں گئے تھے۔ میں ٹھہر گیا ان کے آنے کا منتظر
ہوا۔ ایک ساعت کے بعد اپنی میم صاحب کے ساتھ بگھی پر سوار آئے۔ میرا حال
پوچھ کر بہت عنایت سے پیش آئے۔ شکوہ و شکایت کرنے لگے کہ تم اتنے دنوں
سے اس شہر میں آئے تھے۔ پہلے سے ہمارے پاس کیوں نہ چلے آئے ہم تمہارے
لئے خیمہ کھڑا کر دیتے۔ مکانات عمدہ اور عجائبات اس شہر کے تم کو دکھلاتے۔ میں
نے جواب دیا۔ میرے آنے سے تم کو یہ سب تصدیعہ ہوتا۔ اس سبب سے میں نے
اب تک حاضر ہونے میں تامل کیا۔ شام کے وقت کھانا منگوایا۔ آپ معہ میم صاحب
کے میرے ساتھ کھایا۔ اور نہایت اصرار سے مجھ کو کھلایا۔ ان کی میم مزاج خلیق رکھتیں
تھوڑے دنوں سے ان کے نکاح میں آئی تھیں۔ ان دونوں میاں بی بی نے میرے
حال پر بہت عنایت فرمائی۔ ساری رات ان کی صحبت میں گذری۔ مجھے ان سے رخصت
ہو کر اپنے کھنڈہر میں آیا۔ گھوڑے نو خریدہ پہ سوار ہو کر ایلچ پور چلا۔ راہ میں اندرے
زینہ دار پختہ دیکھے۔ بہت خوب اور مستحکم بنے مگر بعض قابل پانی پینے کے تھے بعضے

---

۱ تکلیف ۲ گہرے کنوئیں

خراب پڑے۔ سبب اس کا یہ کہ مسافر لاابالی جو اس راہ سے نکلتے انہی کنوؤں میں زینے
سے اتر کر اکثر بول و براز کرتے تھے۔ اس واسطے بعضوں کا پانی بدبو کرتا۔ کثیف
اور خراب پڑا تھا۔ اس راہ میں اکثر کوہستان تھا۔ سننے میں آیا کہ بسبب رہزنوں کے
گذر مسافروں کا اس راہ میں دشوار تھا۔ مگر اب انگریزوں کی شکایت سے نظام الملک
نے حفاظت راہ کے لئے جا بجا سوار مقرر کئے ہیں۔ کنوؤں پر اکثر چوکی پہرے
بٹھلائے ہیں تاکہ مسافر با امن و امان راہ سے گذریں۔ اندر اُن میں بول و براز نہ
کریں۔ انگریزوں کی عقل کو سراہا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی عملداری اور غیروں کے
ملک سے راہزن اور ڈکیت نکلوا دیئے۔ تمام راہ زمین قابل زراعت نظر آئی
مگر ظلم عاملوں سے خراب پڑی تھی۔ رعیت برباد ہو کر اجڑ گئی۔ کہیں بھی خوب آبادی
نہ تھی بلکہ گاؤں کے گاؤں اجڑے پڑے تھے۔ موضع آباداں مسکن دام و دد ہوئے۔
اگر کوئی تردد اس زمین کا کرے، منفعت قرار واقعی ہوئے۔ عامل کوتہ اندیش ناعاقبت بیں
رعیت کا اسباب لوٹ لاتے ہیں۔ اسی کو منفعت سمجھتے ہیں۔ غافل اس بات
سے کہ درحقیقت ملک اجاڑتے ہیں۔ نقصان سرکار کا کرتے ہیں۔ اگر ملک آباد اور
تردد زمین کا ہوتا۔ اس سے چار چند روپیہ آتا۔ یہ حالات دیکھتے چلتے چلتے بٹاڑ
میں آیا۔ اورنگ آباد سے پانچ کوس تھا۔ دوسرے دن دس کوس چلا۔ دیاڑی میں
آ پہنچا۔ وہاں دس کوس کے بعد جعفر آباد میں آ کر ٹھہرا۔ یہ موضع بہ نسبت اور گاؤں کے
آباد پایا۔ ایک پرانا قلعہ اور تالاب اس میں بنا تھا۔ بسبب عرصہ کھینچے بارش مینہ کے پانی
کم رہا تھا۔ جعفر آباد سے دس کوس آگے بڑھا۔ چکلے میں آیا۔ وہاں سے سات کوس
چل کر امرپور پہنچا۔ وہاں سے لکھن بارہ جو سات کوس تھا آیا۔ پھر نو کوس راہ چلا۔ بڑگاؤں
میں داخل ہوا۔ وہاں سے سات کوس کی منزل طے کر کے اکولا میں رات کاٹی۔ اکولا
سے قصبہ دھنڈا میں آیا۔ نو کوس کا فاصلہ تھا۔ وہاں سے دس کوس بعد کپس تلے میں

۱؎ درندے

آیا۔ کپس تلے سے گیارہ کوس بڑھا۔ ایلچ پہنچا۔ یہ رستہ مانند سڑک ملک انگریزی کے
برابر اور صاف نہ تھا۔ میں نے بسبب نشیب و فراز راہ کے اور گڑھوں اور پہاڑ
کے رنج بہت پایا۔ ایلچ پور قریب پہاڑ کے واقع ہوا ہے۔ معتدل یہاں کی آب و ہوا
ہے۔ زمانۂ سابق میں اغلب کہ خوب آباد ہوگا۔ اس لئے کہ اب تک بھی کچھ آباد و معمور
تھا۔ عمارت اور مکان قدیمی گر گئے۔ مگر آبادی سابق سے خبر دیتے۔ یہاں فوج نظام الملک
تعینات رہتی ہے۔ قواعد انگریزی سیکھتی ہے۔ انگریز قواعد سکھانے کے لئے
نوکر ہوئے ہیں۔ یہاں کا لشکر درماہہ ماہ بماہ سرکار سے پاتا ہے۔ قریب پہاڑ کے
ایک میدان خوب صاف ہے۔ اس میں چشمہ پانی کا شیریں اور شفاف ہے۔ پہاڑ
پر ہر قسم کے جانور شکاری موجود تھے۔ جیسے ہرن نیل گائے پاڑھے۔ اگر کسی کو اس
راہ سے گذر ہو اور شوق شکار کا اس کو بیشتر ہو چاہیئے کہ اس پہاڑ پر جاوے جانوروں
کا شکار کرے۔ اس واسطے کہ وہ جگہ نفیس اور نادر ہے۔ محل تماشائے قدرت قادر ہے
غریب آدمی اس جنگل اور پہاڑ سے بانس اور لکڑیاں وغیرہ کاٹ کر بیلوں پر لادتے
ہیں۔ شہر میں لا کر بیچ جاتے ہیں۔ اسی طرح سے اوقات گذاری اپنی کرتے ہیں۔
میں نے دو تین دن ایلچ پور میں مقام کیا۔ سیر و شکار میں مشغول رہا اور بسبب تکلیف
راہ کے ایک آدمی صاحب افغان نامی نوکر رکھا۔ بعد اس کے ناگپور چلا۔ اوّل منزل
دس کوس چل کر چاندا آدر میں آیا۔ وہاں سے نو کوس راہ طے کر کے نیر میں پہنچا۔ راہ میں
بسبب کمی بارش کے کنویں سوکھ گئے تھے۔ لہٰذا پانی کی طرف سے تکلیف کھینچتے
رہے۔ سوا اس کے ساری راہ میں جنگل۱؎ تھا۔ اور خوف و خطر شیر اور چیتے اور
جانوروں درندہ۔ کہیں عمل نظام الملک کا۔ کہیں کسی راجہ کا کہیں کہیں انگریزی تھا
نیر سے دس کوس، قصبہ دردہ میں آیا۔ وہاں سے گیارہ کوس کے بعد کرنجہ میں پہنچا۔

۱؎ ویرانہ۔ جنگل

وہاں سے گیارہ کوس آگے چلا۔ کنڈل واری میں آیا۔ دس کوس آگے بڑھا۔ دامنہ تک
آیا۔ دس کوس اور چلا۔ ناگپور پہنچا۔ شہر سے باہر ایک سرا میں اترا۔ نزدیک اس کے
ایک تالاب دلچسپ تھا۔ چونکہ اس سال مینہ کم برسا۔ پانی کنوؤں کا خشک ہوا۔
اس لیئے زن و مرد شہر کے اسی تالاب سے پانی بھر لے جاتے۔ ناگپور سے دو تین
منزل پیشتر میں نے بازار گاؤں میں سنا کہ یہاں ایک شیر ہے۔ مسافروں کو ہلاک کرتا۔
مگر گاؤں کے آدمیوں کو نہیں ستاتا۔ گائے بکریوں کو نہ کھاتا۔ اس کے پکڑنے کے
لیئے ناگپور کے راجہ نے قریب سو پیادوں کے مقرر کیئے تھے۔ وہ لوگ کہیں پتا اور
سراغ شیر کا نہ پاتے۔ اس سے مجھ کو ثابت ہوا کہ وہ شیر نہ تھا بلکہ کوئی رہزن اپنے
تئیں صورت شیر بنا کر مسافروں کو مارتا اور اسباب ان کا لوٹ لے جاتا۔ اگر میں کچھ
دنوں وہاں رہتا اور دو تین آدمیوں کو شریک حال اپنا پاتا۔ اس رہزن شیر لباس
کا پتا لگاتا اور ضرور اس کو گرفتار کرتا۔ بسبب تنہائی اور روا روی راہ کے چلنا
پڑا۔ ظاہرا وہ شخص وہاں کے حاکم سے سازش رکھتا۔ ورنہ کیا امکان کہ پتا
اس کا نہ لگتا۔ ناگپور کے قرب و جوار سب زمین ریگستان اور کوہستان ہے اور
جابجا شورہ۔ زراعت کا اس میں نہیں نام و نشان ہے۔ انہی وجہوں سے اس شہر
میں شدت حرارت ہے۔ آدمیوں مثل وحشیوں کے ہرگز نہ آدمیت و لیاقت ہے
مکانات ان کے مانند ڈھابلی[۱] کبوتر اور مرغوں کے تنگ و تاریک تھے۔ طرفہ یہ کہ راجہ
کے مکانات ویسے ہی بنے۔ میں نے جب راجہ کا مکان دیکھا قیدخانہ نیوگیٹ لندن
کا یاد آیا کہ وہ بھی اس سے سوگنا بہتر تھا۔ اس کے مکان کے سامنے ایک میدان
پڑا۔ شام کو راجہ اپنے مکان کے باہر آبیٹھتا۔ میدان میں سوار متلاشی روزگار جمع
ہوتے۔ اپنے اپنے کمال اور کرتب دکھلاتے۔ راجہ جس کسی کو پسند کرتا نوکر رکھ لیتا

۱؎ ڈربا

سوار و پیادہ راجہ کے نوکر وردی انگریزی پہنے تھے۔ عجب بدقطع جانور کی
شکل معلوم ہوتے۔ رستے بازار کے نہایت تنگ تھے۔ شام کو مرہٹے عزت دار گھوڑوں
پر سوار سیر کرنے آتے۔ ان کی ایسی قطع حماقت کی تھی کہ حماقت چہروں سے برستی۔ ایک
ایک پرانا قلعہ تھا اس میں لشکر انگریزوں کا رہتا۔ اگرچہ وہ قلعہ قابل تعریف کے
نہیں۔ مگر انگریزوں نے اس میں توپیں جمائیں۔ شہر سے تین کوس نکل کر دریائے
کامٹی ہے اس کے نزدیک فوج انگریزی کی چھاؤنی ہے۔ سوار پیادے اور
توپ خانے اور بہت گورے اس میں رہتے ہیں۔ بسبب قرب کامٹی کے اس
کو چھاؤنی کامٹی کہتے ہیں۔ عمر راجہ ناگپور کی تخمیناً تیس برس کی ہے۔ طبیعت ان
کی مائل عیش و عشرت ہوئی ہے ایک مکان رنڈیوں سے بھرا ہے۔ اب تلک
تلاش اوروں کی رکھتا ہے۔ چنانچہ حال میں ایک رنڈی نہایت حسین بنارس
سے آئی تھی۔ راجہ کے منظور نظر ہوئی۔ ایسا اس پہ فریفتہ اور مبتلا ہوا کہ ایک
لحظہ مفارقت اس کی گوارا نہیں کرتا۔ جو کچھ اس رنڈی کو منظور ہوتا ہے۔ بدل و
جان اس کو بجا لاتا ہے۔ بموجب حکم اس کے کبھی باغ میں جاتا ہے۔ کبھی قریب
تالاب کے مکان بنواتا ہے۔ غرضیکہ بہر صورت اس کی اطاعت میں بسا اوقات صرف
رہتا ہے کہ عقل میں نہیں آتا ہے۔ شہر میں کوئی ہتھیار باندھے نہیں نکل سکتا ہے یہ حکم راجہ کا
ہے۔ شہر سے باہر ایک تالاب اور تھا۔ دونوں تالابوں پہ چوکی پہرہ بیٹھا۔ آدمی یا
جانور کو حکم نہانے بلکہ پاؤں دھونے کا ان میں نہ تھا۔ جس کا جی چاہتا پانی پینے کا البتہ
وہاں سے لے جا سکتا۔ ایک دن بندہ چھاؤنی کامٹی کا تماشہ دیکھنے گیا۔ قبریں انگریزوں
کی دیکھ کر سخت ملول ہوا کہ یہ لوگ کس قدر راہ دور دراز سے بامید بہبود و بہبال
آئے ہوں گے۔ کامیاب ہو کر ارادہ پھرنے ملک اپنے کا رکھتے ہوں گے مگر صیاد اجل
نے مہلت نہ دی۔ وطن جانے کی نوبت نہ آئی۔ اسی حالت میں دوست لندن

کے یاد آئے۔ آنسو بے اختیار بہے۔ بعد ایک ساعت کے خیال آیا کہ رنج و غم سے فائدہ کیا۔ بہتر یہ ہے کہ دوا دلِ غمگین کی کروں اور طبیعت کو بہلاؤں۔ قریب چھاؤنی کے جاکر ایک بوتل شراب دین کی خرید کی اور بھر کر سامنے رکھ لیا۔ اپنا چپک مصری۔ دوستاں کو یاد کر کے کئی پیالے شراب دین کے پئے۔ بعد اس کے چپک پینے میں مشغول ہو کر غم دل سے دور کئے بقول حافظ شیراز ؎

اے نورِ چشم من سخنی ہست گوش کن
تا ساغرت پُر است بنوشان و نوش کن

دو چار گھڑی اسی چین اور خوشی میں اوقات گذاری کی۔ پھر اسی کیفیت و سرور میں گھوڑے پر سوار ہو کر باگ اس کی ڈھیلی کی۔ سوجھائی نہیں دیتا کہ گھوڑا کدھر جاتا۔ اس نے چلتے چلتے ایک پھسلنے پتھر پر پاؤں رکھا اور پھسل پڑا۔ میں بھی اس پر سے گر کر زخمی ہوا۔ تھوڑی دین وہیں زخم میں بلاکر خوب مضبوط باندھا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر ٹنک کو چلا۔ وہاں سے نو کوس تھا۔ اثنائے راہ میں بہ سبب نہ برستے مینہ کے حال آدمیوں اور جانوروں کا پریشان پایا۔ کنوئیں سوکھ گئے تھے۔ اس سبب سے راہ میں پانی کہیں نہ ملتا۔ اکثر جانور پرند نظر آئے کہ شدت پیاس سے درخت پر سے گر کر مر گئے۔ میں نے جیوں تیوں ٹنک میں پہنچ کر مقام کیا۔ دوسرے دن گیارہ کوس چل ڈونگر تال میں آیا۔ راہ میں سارا جنگل اور پہاڑ تھا وہاں ایک جانور بصورت شیر گھانس[1] میں چھپا نظر آیا۔ گھوڑے سے اتر کر گھوڑا نوکر کے حوالے کیا۔ آپ پیدل ہو کر پہاڑ پر ایک پتھر مشبک کی آڑ میں بیٹھا بندوق کو گولی سے بھرا۔ پتھر کے سوراخ سے منہ بندوق کا نکالا تاکہ اس جانور کا شکار کیا۔ حسب اتفاق گولی کا زخم کاری لگا۔ جانور اچھل کر گرا۔ مگر میں خوف سے قریب اس

[1] گھاس

کے نہ گیا۔ ایک اور گولی ماری۔ یہاں تک کہ سرد ہوا۔ تب پاس اس کے جاکر دیکھا چیتا تھا۔ قد و قامت میں بہت بڑا۔ اس کو ساتھ اپنے ڈونگر تال لوا لایا اور ایک روپیہ مزدوری دے کر چمڑا اس کا نکلوا لیا۔ دوسرے دن ڈونگر تال سے دس کوس آگے چلا۔ سو صنج کرٹھے میں آکر ٹھہرا۔ اس دن مینہ خوب برساتھا۔ راہ بھر عجب حال دیکھا۔ لاش ہندوؤں کی جابجا پڑی۔ کوئی تڑپ رہا۔ کسی کی جان نکلی۔ گوشت بدن ان کے کا گیدڑ اور جانور کھا گئے۔ کوئی شفیق نہ تھا کہ ان کے حال پر رحم کرے۔ ایک شخص ان میں سے ہوش و حواس بجا رکھتا۔ میں نے اس سے استفسار حال کیا۔ اس نے کہا۔ ہم لوگ ہندو ہیں۔ رامیشر سے تیرت[1] کر کے آتے ہیں اپنے قافلہ کے ساتھ کاشی جی[2] جاتے تھے۔ یہاں آکر بیمار ہوئے۔ ساتھی ہمارے ہم کو اس حال میں چھوڑ کر چلے گئے۔ اب ہم اس عذاب و مصیبت میں گرفتار ہیں۔ زندگی سے بیزار ہیں۔ بہتیرے بڑے بڑے بسبب بھوک و پیاس کے مر گئے۔ بہتوں کو جانور درندے ہلاک کر گئے۔ گوشت بدن کا کچھ کھایا کچھ چھوڑ گئے۔ ہڈیوں کو بھی توڑ گئے۔ بعض مانند میری حالت نزع میں تڑپ رہے ہیں۔ موت آنے کی راہ دیکھتے ہیں۔ مجھ کو دل میں رنج آیا کہ افسوس اس حالت میں کوئی نہیں ان کا پوچھنے والا۔ باوجودیکہ ہندوؤں کے غول تیرت کئے ہوتے اس راہ سے نکلتے تھے اور وہ گرفتاران مصیبت حال اپنا کہہ کر رام و لچھمن کا واسطہ دلاتے تھے مگر کوئی متوجہ حال نہ ہوا اور کسو نے ان کے حال پر رحم نہ کیا۔ بندہ ان ہندوؤں کی سخت دلی سے متحیر ہوا کہ باوجود بھگتے اور تیرت رامیشر کے اپنی ہم قوموں کا حال نہ پوچھا۔ رامیشر اور کاشی جانے سے کیا فائدہ جو دل میں اس سے سختی آئی زیادہ۔ چاہیئے تھا کہ

[1] صحیح لفظ تیرتھ ہے جس کے معنی مقدس مقام کی زیارت کرنا ہے۔
[2] کاشی ہندی میں بنارس کو کہتے ہیں جو ہندوؤں کا مقدس شہر ہے۔

اگر دل سخت پتھر سا ہوتا، تیرت سے موم سا ملائم ہو جاتا۔ یہاں برعکس ہویدا ہوا کہ تیرت سے اور زیادہ کڑا ہوا۔ صاحبان انصاف ملاحظہ کریں کہ ایسے امورِ بے رحمی اور شقاوت کے کس مذہب میں جائز ہیں۔ ان سے زیادہ سخت دل اور نالائق کون ہوگا کہ اپنے ہم مذہب اور ساتھیوں پہ اتنا ظلم روا رکھا۔ میں نے بہت ملکوں میں پھر کر بے رحمی میں بدو لوگ عرب کو مشتنیٰ کیا تھا۔ مگر حال ہندوؤں کا دیکھ کر ہندوستانیوں پر ختم بے مروتی کا کیا۔ اس سے زیادہ یہ ماجرا کہ جس کو کچھ مقدور رہا، کمینہ ہو یا اشراف۔ شریف ہو یا اجلاف۔ ہندی نژاد اس کی خوشامد کہہ کر دماغ اس کا آسمان پر پہنچاتے ہیں۔ شرافت اور کمینگی کا ہرگز پاس نہیں کرتے تھے۔ سامنے خداوند و پیر و مرشد کہتے ہیں۔ غائبانہ ہزاروں گالیاں دیتے ہیں۔ زبان سے وہ قال و مقال ہے۔ دل میں یہ خیال ہے۔

انہی حرکات سے خدا تعالیٰ نے ان پر غضب کیا۔ سلطنت ہندوستان کی زیرِ قبضہ و تصرف انگریزوں کے لایا۔ یہ ملک وسیع ایسا نہ تھا کہ بآسانی جماعت قلیل سے انگریزوں کے ہاتھ لگتا۔ مگر ان کی طرف بہ سبب نیک طینتی کے تائید الٰہی ہے اور ان پر حرکات ظلم ان کے سے تباہی آئی۔ کوئی کسی سے موافقت نہیں رکھتا ہے۔ بھائی بھائی سے کنائی کاٹتا ہے[1]۔ ظاہر میں اپنے تئیں بھگت اور پرہیزگار بناتے ہیں۔ باطن میں ہر رشتہ نفس سے دام فریب بنتے ہیں۔ یہ پرہیزگاری ظاہر نمائی کی آخرت میں کیا فائدہ دے گی۔ بموجب مثل ہندی دیا دھرم نہیں۔ تورے من میں کیا دیکھے تو مکھ درپن میں۔ زیادہ اس سے لکھنا فضول ہے۔ کلام طویل کرنا عاقلوں کے سامنے نامقبول ہے۔

خلاصہ یہ کہ دس کوس راہ طے کر کے موضع کرہی سے سہنی میں آیا۔ یہاں

[1] کتراتا (ایک راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ لینا) دہلی والے کنی کاٹنا بولتے ہیں۔

سے عمل راجوں کا تھا۔ خلقت یہاں کی نرالی اور انداز نیا ہے۔ بے زجر[1] اور تنبیہ کے کام نہیں نکلتا ہے۔ راہ میں میں نے کنوؤں پر جا کر لوگوں سے بہ خوشامد پانی مانگا۔ کسو نے از راہ بدذاتی گھونٹ بھر پانی نہ پلایا بلکہ ترش[2] سے جواب سخت دیا۔ بنیوں کی دوکانوں پہ جا کر نرمی اور لجاجت سے رات بھر اترے رہنے کی اجازت چاہی انہوں نے بھی میرا کہنا خیال میں نہ لا کر انکار کی۔ جب میں نے دیکھا کہ آشتی سے کام نہیں چلتا۔ انگریزی کپڑے پہن کر اپنے تئیں صوبہ دار فوج انگریزی کا ظاہر کیا۔ جہاں کہیں جاتا۔ اہل حرفہ کو گالیاں دیتا۔ بلکہ جوتیاں مارتا۔ کوئی سرتابی نہ کر سکتا۔ سب موم کی طرح پگھل کر فرمانبرداری کرتے۔ دل و جان سے اطاعت میں مشغول رہتے۔ اسی طرح تلنگے انگریزی جس گاؤں میں جاتے ہیں۔ بیگاری پکڑ کر اس پر اسباب اپنا لاد کر منزل تک لے جاتے ہیں ایک کوڑی بھی مزدوری نہیں دیتے ہیں۔ جب دوکان پہ بنیوں کے پہنچتے ہیں۔ گالیاں بے سبب دے کر قرار واقعی تنبیہ ان کی کرتے ہیں۔ آٹا بہ نسبت اور خریداروں کے ارزاں مول لیتے ہیں۔ چلتے وقت انعام میں گالیاں دے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک بہت اچھا کرتے ہیں۔ وہ نالائق بدذات بغیر اس کے نہیں مانتے ہیں۔ سابق بندہ بدزبانی اور بے رحمی انگریزوں سے ہندوستان میں شاکی تھا۔ روداد سفر اور سابقے ان لوگوں سے ثابت ہوا کہ بغیر بدزبانی اور بے رحمی کے کام نہیں نکل سکتا ہے۔ اگر کوئی صدہا روپے خرچ کرے ویسا ہرگز اجرائے کار نہیں ہوتا ہے۔ غریب مسافر جو ٹٹوؤں پر سوار آتے تھے۔ محافظان راہ زیادہ قیمت ٹٹو سے محصول لیتے پھر بھی نجات نہ دیتے۔ ایک شخص نے میرے سامنے تین روپے کا ایک چھوٹا ٹٹو مول لیا تھا۔ چوکیداروں نے چار روپے

[1] سرزنش [2] بدمزاجی۔ اکھڑ پن

اس کا محصول لیا۔ آخر اس بیچارے نے حیران ہو کر ٹٹو کو ایک طرف چھوڑ دیا کہ اس
آفت جاں سے بچ کر گزرا۔ جا بجا مجھ سے بھی چوکیداروں سے تکرار ہوئی۔
مگر میں وضع ہندوستان سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس سے ان ظالموں سے نجات
پائی۔ اگر کوئی اپنی بی بی ان راہوں میں ساتھ لے جاوے، سخت خرابی میں گرفتار
ہوئے۔ اگر گھوڑے ٹٹو پر سوار چلے دو نا تہ سے محصول دے اگر کوئی عورت
اکیلی اس راہ سے سفر کرے، ممکن نہیں کہ گزر سکے۔ غرضیکہ ہر منزل میں محافظ مثل
منکر نکیر تھے، مسافران کی ایذا رسانی سے دلگیر تھے۔ راجہ ہائے ہندوستان
شامت اعمال اپنے سے محکوم انگریزوں کے ہوئے ورنہ کیا مجال کہ ایسا ملک فسیح الفضا[1]
انگریز فوج قلیل سے لے سکتے۔ یقین کہ اپنی حرکتوں سے ہمیشہ فرماں بردار
اوروں کے رہیں۔ ظلم و جبر غیروں کے اپنے اوپر سہیں قصہ مختصر بندہ تہی سے
نو کوس چلا۔ نرائن گنج میں پہنچا۔ وہاں سے نو کوس کی منزل طے کر کے کنیش گنج آیا۔
پھر نو کوس کے بعد دھوبان میں اترا۔ وہاں سے دس کوس چل کر چری بدی میں
پہنچا۔ پھر دس کوس منزل کر کے جھبل پور میں مقام کیا۔ وہ نواح دل کو بھایا۔ اس پار
جھبل پور کے دریائے نربدا تھا۔ میں شکار میں مشغول ہوا۔ یہ دریا مقام پوجا پاٹ
اور نہانے ہندوؤں کا ہے۔ فی الواقعی پانی اس کا مزیدار اور میٹھا ہے، ہندو راہوں
دور سے آکر اس دریا میں نہاتے ہیں، اپنے نزدیک اس پانی سے سارے گناہوں
کو دھو جاتے ہیں۔ ایک دن میں نے نربدی پر مقام کیا شکار کر کے کئی جانور پکڑ
لایا۔ ایک جگہ گنجان درختوں کا سایہ اور خوب سبزہ تھا۔ اتر کر شکاری جانوروں کا
کباب بنا کر کھایا اور شب باش ہوا۔ بندہ جب نربدا پہنچا، گرمی کا غلبہ تھا۔ اس

---

[1] فسیح عربی کا لفظ ہے جس کے ایک معنی پھیلنے یا کھلے ہونے کے ہیں۔ یہاں کھلی فضا مراد ہے۔ (مرتب)

سبب سے پانی دریا کا گھٹ گیا۔ یہاں تک کہ پہاڑ دریائی جو نربدی میں تھا
نظر آتا کشتی کا رستہ مسدود تھا۔ دوسرے دن خاص جھبل پور میں آکر ایک بنیئے کی
دوکان پر اترا۔ راہ کی ماندگی سے ستایا۔ اس دن ابر تھا دل میں یہ خیال آیا کہ راہ
کے چلنے سے ماندہ ہوا ہوں۔ بہتر یہ کہ ایک آدھ روز یہاں چین کروں بنیئے کی
دوکان کو صاف کروایا۔ عرق انگور پینے میں مصروف ہوا۔ گویوں خوش آواز کو بلا کر
راگ سننے لگا۔ انب[1] خربوزے مول لے کر آپ کھائے۔ باقی گویوں اور نوکر کو تقسیم
کر دیئے۔ اسی عیش و نشاط میں دو تین پیادے کوتوالی کے آکر پوچھنے لگے تم کون
ہو۔ کیا پیشہ رکھتے ہو۔ کہاں سے آئے کہاں جاتے ہو۔ میں نے کہا مسافر ہوں۔
بمبئی سے آتا ہوں، بنارس جاتا ہوں۔ تم کو میرے پیشہ اور مقام سکونت سے کیا
کام، اس سے کیا غرض و انجام۔ وہ موذی تقریر بے جا سے باز نہ آئے۔ بلکہ تھوڑی
دیر بعد کہنے لگے۔ ہمارے ساتھ چلو تم کو کوتوال نے بلایا ہے۔ میں نے ان کا کلام
پوچ و لچر سمجھ کر یہ کہا۔ اگر کوتوال کو تحقیقات منظور ہو تو میرے پاس آکر حال
پوچھ جائے۔ میں اس کے پاس ہرگز نہ جاؤں گا، اپنے عیش میں خلل نہ لاؤں گا۔
میں نے کسی کی چوری نہیں کی اور جیب نہیں کاٹی کہ کوتوال نے مجھ پر طلبی بھیجی۔ شام
تک اسی کیفیت میں رہا۔ رات کو کھانا کھا کر سویا۔ صبح گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چلا۔
ان ہی پیادوں نے آکر روکا کہ کوتوال کا حکم نہیں تمہارے جانے کا۔ میں نے کچھ نہ
سنا، اپنا رستہ لیا دو کوس تک پیادے ساتھ آئے، بعد اس کے پھر گئے۔ ظاہرا
معلوم ہوا کہ کوتوال جھبل پور کا مسافروں کو تہمت دزدی سے گرفتار کرتا تھا اور
ان سے دھمکا کر رشوت لیتا تھا مگر مجھ سے اس کو کچھ وصول نہ ہوا۔ جھبل پور اگرچہ
بہت وسعت نہیں رکھتا تھا۔ مگر آباد اچھا ہے۔ کسی انگریز نے اس کا چوک بنوایا

---

[1] آم

ہے۔ بہت نادر نقشہ اس کا ہے۔ چوطرفہ دیوار ہے اندر اس کے دوکانیں اور
بازار ہے، ہر قسم کی چیز اس میں رکھی ہے۔ شام کو آدمیوں کی بھیڑ ہوتی ہے۔
جھبل پور سے آگے رستہ ہموار ہے، دو طرفہ درخت آنب کے سایہ دار مسافر
سایہ میں راہ چلے، جہاں چاہے آنب کھائے اور ٹھہرے۔ اس سال درختوں
میں آنب لدے تھے، مسافر راہ چلتے آنب کھاتے جاتے۔ یہاں پہاڑ سیاہ
بہت نظر آئے۔ میں جھبل پور سے چلا، نو کوس کے بعد سہوڑا میں پہنچا، پھر نو کوس
چل کر ویری آیا، وہاں سے آٹھ کوس چل کر تہدگنج میں گیا، وہاں سے دس
کوس آگے بڑھا، مہیر میں پہنچا۔ مہیر موضع آباداں ہے، ایک راجہ ہندو حاکم ہے
وہاں۔ اس نے ایک چھوٹا سا قلعہ پختہ مضبوط بنوایا ہے، ہزاروں طوطوں نے
اس کے دیوار کے رندوں میں آشیانہ بنایا ہے۔ گرد قلعہ کے خندق گہری پانی
سے بھری ہے۔ آدمی اس موضع کے نادان بدقطع اور احمق ہیں گویا حیوان مطلق
ہیں۔ ایک شب بندہ وہاں رہا۔ صبح پانچ کوس بڑھ کر امر پٹن میں آیا، یہاں بھی
عمل ایک راجہ کا، انتظام ملک خاک نہ تھا۔ عملداری راجاؤں کی انہی راہوں میں
مسافر اکثر مارے جاتے ہیں راہزن اسباب راہیوں کا لوٹ لے جاتے ہیں کوئی شنوائی
نہیں کرتا ہے کہ یہ کیا ظلم و فساد ہوتا ہے۔ امر پٹن میں پہنچ کر ایک درخت کے نیچے
سو رہا۔ آدھی رات کو بیدار ہوا۔ ایسی چاندنی کھلی تھی کہ رات دن معلوم ہوتی۔ آدمی
کو آواز دے کر جگایا۔ میں نے اس نے دونوں نے جانا کہ تڑکا ہوا۔ وہاں سے اسی
وقت چل کھڑا ہوا، جب دو کوس نکل آیا دو آدمی جنگلی لٹیرے ملے۔ ایک ایک لاٹھی
لوہا لگی ہوئی کندھوں پر رکھے، آواز دی کہ لے مسافر گھوڑا اور اسباب اپنا ہم کو دے
سیدھی طرح گھری رام سے نہیں تو ہم تجھ کو مار ڈالیں گے، گھوڑا اور سب اسباب
لے لیویں گے۔ میرے پاس چقماق بھری ہوئی اور سب ہتھیار تھے۔ دل میں ہراس نہ

؎ جھرو کوں میں

لایا ان کی اس گفتار سے بلکہ یوں جواب دیا تم اپنی راہ جاؤ میرے نزدیک مت
آؤ، ورنہ ایک کو گولی سے مار دوں گا۔ دوسرے کا تلوار سے کام تمام کر دوں گا انہوں
نے یہ سن کر دو کوس تک پیچھا کیا۔ میں بھی ان کے مقابلہ سے غافل نہ ہوا۔ جب
انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ہشیار ہے، اسباب اس کا لینا دشوار ہے۔ آپس میں
کچھ صلاح کی اور اپنی راہ لی۔ میں درگاہ الٰہی میں شکر بجا لا کر آگے بڑھا لیکن ابھی تک
صبح صادق کا پتہ نہ تھا۔ تب یہ بات ثابت ہوئی کہ چلتے وقت رات بہت باقی
تھی۔ تھوڑی دور آگے چلا دیکھا کہ ایک مہاجن راہ میں بیٹھا معہ متعلقوں کے رو
رہا ہے۔ میں نے پوچھا حال کیا ہے۔ اس نے کہا میں ناگپور جاتا تھا جب یہاں آ
کر پہنچا دو ڈکیت آئے، اسباب میرا لوٹ لے گئے اور لاٹھی لوہے لگی ہوئی سے
مجھ کو زخمی کیا۔ اب مجھے کچھ نہیں بن پڑتا اگر کچھ خرچ پاس ہوتا۔ گھر پھر جاتا یا
منزل مقصود تک پہنچتا۔ سخت حیران ہوں، الٰہی کیا کروں۔ میں اس کا حال دیکھ
کر بہت کڑھا مگر کچھ نہ بن آیا۔ لاچار اپنا رستہ لیا۔ دس کوس چل کر زیعان میں آیا۔ سنا کہ
ایک سوار سپاہی پیشہ پچاس سواروں کے ساتھ بڑے ٹھاٹ سے گوالیر سے نوکری
چھوڑ کر یہاں آیا ہے، ارادہ نوکری راجہ کا رکھتا ہے۔ میں نہایت مشتاق دیکھنے
اس کا ہوا۔ جا کر اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو دیکھا۔ فی الواقعی جوان وجیہہ اور
دیدار و تھا۔ چنانچہ وہاں کے راجہ نے اس کو پانسو روپے درماہے کا نوکر رکھا اور
ہمراہیوں اس کے کا بھی درماہہ حسب لیاقت مقرر کیا۔ بعد اس کے قلعہ اور شہر
کی سیر دیکھنے گیا۔ راستہ بازار کا تنگ تھا، مکان راجہ کا بہ نسبت اور مکانوں کے
اچھا بنا۔ اگرچہ قابل تعریف نہ تھا۔ گرد قلعہ اور شہر کے خندق کی طرح چاروں
طرف دریا ہے، پانی اس میں پتھر اور پہاڑ سے آتا ہے۔ عجب کیفیت دیتا ہے
جب یہ سیر و تماشا دیکھ چکا۔ سات کوس رہ نوردی کر کے منکونا میں آیا۔ بسبب

گرمی اور نہ برسنے مینہ کے کنوئیں سوکھے تھے۔ حالات تشنگی شہدائے کربلا کی یاد آئی۔ چھ کوس کے بعد مئو میں پہنچا۔ اس ویرانے گاؤں میں بھی پانی کا یہی حال تھا۔ وہاں سے سات کوس چلا بن منا میں آیا۔ بعد اس کے درمن گنج میں پہنچا چار کوس کا مفاصلہ تھا۔ درمن صاحب نام کسو انگریز کا ہے اس نے یہ گنج ڈالا ہے اس سبب سے نام اس گاؤں کا درمن گنج مشہور ہوا۔ یہاں سے عمل انگریزی تھا۔ پہاڑ پر سے رستہ چلتا ہے۔ ڈیڑھ کوس تک نشیب و فراز رکھتا ہے۔ جو کوئی اسباب اس راہ سے لے جاتا ہے وہاں کے پرمٹ میں محصول دینا پڑتا ہے۔ سابقاً ہندوستانی لوگ مقرر تھے۔ محصول ہر شے کا لے کر جمع کرتے آخر انہوں نے تغلب تصرف کیا۔ انگریز دل نے یہ عہدہ ان سے نکال کر ایک سارجنٹ کو بجائے اُن کے مقرر کیا۔ وہ لیاقت نوشت و خواند کی نہ رکھتا۔ فقط بہ سبب امانت داری کے معتمد علیہ سرکار کا ہوا۔ ہندوستانی عجب عقل ناقص رکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہیں۔ اگر چوری نہ کرتے کیوں اس عہدے سے موقوف ہوتے۔ وہ پہاڑ رفیع الشان تھا۔ نشیب و فراز بے حد و پایاں رکھتا۔ آدمی بمشکل اس راہ سے جاتا۔ بگھی یا گاڑی کا ہرگز گذر نہ ہو سکتا۔ صاحبان انگریز نے جابجا سے پہاڑ کاٹ کر رستہ برابر اور ہموار کیا بلکہ اب بھی درست کرتے جاتے ہیں اس سبب سے اب بگھی چھکڑے بھی اس راہ سے جا سکتے ہیں۔ میں جب وہاں پہنچا لوگوں نے آگے بڑھنے سے منع کیا کہ یہاں ایک شیر لاگو رہتا ہے۔ ہر روز ایک آدمی مارتا ہے تم یہاں ٹھہرو آگے مت بڑھو۔ جب سو پچاس آدمیوں کا جماؤ ہو آگے جانے کا قصد کرو۔ پہلے میں نے ان کا کہنا خیال نہ کیا کہ میرے پاس بندوق بھری ہے۔ اگر شیر سامنے آوے گا۔ مار دوں گا۔ سوا اس کے میں خوفناک مقابلوں پر گیا افضال الٰہی سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ یہاں بھی صدمہ سے بچوں گا مگر پھر قول سعدی شیرازی رحمۃ اللہ

کا یاد آیا۔

گرچہ کس بے اجل نخواہد مُرد تو مرو در دہانِ اژدرہا

اس وجہ سے ٹھہر گیا۔ جب بہت لوگ جمع ہوئے۔ سب مل کر غل کرتے ہوئے اس پہاڑ ناہموار سے نیچے آئے۔ میں بھی ان کے ساتھ آیا۔ چڑھاؤ اتارے تھک گیا۔ ایک درخت سایہ دار کے نیچے اتر رہا۔ آدھی رات کو باران رحمت برسا۔ میں نے کمل اوڑھ لیا اور وہیں رات بھر بسر کیا۔ صبح اٹھ کر قصد چلنے کا کیا اپنے زانو کے نیچے دو بچھوؤں سیاہ کو بیٹھے پایا۔ فضل الٰہی شامل حال تھا کہ انہوں نے ڈنک نہ مارا۔ میں نے چمٹے سے اٹھا کر گھاس میں ڈالا پر جان سے ان کو نہ مارا۔ اگرچہ یہ امر خلاف عقل تھا۔ مگر اس وقت بمقتضائے وحدانیت یہی بہتر معلوم ہوا وہاں سے چپتی چالاکی سے سات کوس طے کر کے لال گنج کی سرا میں پہنچا۔ کٹی منزل سے ایک صوبہ دار کسی راجہ کا نوکر مع چندے رفیقوں اپنے کے ہمراہ ہمارے تھا اسی طرح ایک کہار بھی دور سے ہمراہ ہمارے آتا۔ میرزاپور کا رہنے والا تھا۔ بہت دنوں کے بعد روپے اشرفی جمع کر کے اور کپڑے نفیس اپنی جورو کے لئے بنوا کر نوکری پر سے گھر اپنے آتا تھا۔ کم بختی نصیبہ سے یہ سمجھ کر کہ گھر قریب آ پہنچا۔ لال گنج کی منزل میں ہم سے علیحدہ ہو کر شراب نوشی میں مشغول ہوا۔ ہم لوگ سرائے لال گنج دو ہیں پہنچے تھے کہ کہار بھی آیا زخمی روتے پیٹتے۔ میں نے حال پوچھا کہا کیا کہوں غضب ہوا میرے سارے روپے اور اشرفیاں دو تین چوروں نے زبردستی چھین لیا اور مجھ کو زخمی کر کے ننگا نکال دیا۔ میں نے کہا تو نے از راہ بے عقلی و حمقی ہمارا ساتھ چھوڑا جو اس مصیبت و تکلیف میں گرفتار ہوا۔ میں بہ سبب ماندگی راہ کے لاچار ہوا نہیں تو ضرور ان رہزنوں کا پتا لگاتا۔ دل میں خیال آیا کہ عمل انگریزی میں بھی باوجود اس قدر انتظام کے ظلم صریح ہوتا ہے۔ پس اور حاکموں ہندوستان کو

بسبب بے انتظامی کے الزام دینا بجا ہے اگر انگریز مثل اورنگ زیب عالمگیر کے رہزنوں کو جان سے ماریں تو البتہ اس پیشہ والے رہزنی سے باز آئیں۔ فقط تہدید زبانی سے کام نہیں نکلتا ہے۔ انتظام قرار واقعی نہیں ہوتا ہے۔ الغرض صبح وہاں سے سات کوس چلا۔ میرزا پور سا گر ایک سرا میں اترا۔ عجب سرا کہ مکان اس کے معدن حرارت۔ بھٹیاریاں رانڈوں کی صورت میلے کپڑے پہنے سینکڑوں چیلڑ[1] اس میں بھرے۔ صفائی ستھرائی کی یہ حالت تھی کہ رینٹ[2] ہونٹوں تک لٹکتی۔ کوئی اپنے سر کے بال کھجلاتی کوئی اپنے چوتڑوں پر ہاتھ دوڑاتی۔ مسافر اپنی شامت سے اگر وہاں آنکلا۔ عذاب دوزخ میں گرفتار ہوا۔ یعنی ہر ایک اپنی طرف بلاتی ہے۔ ایک مکان تاریک و تنگ میں اتارتی ہے۔ وہاں مچھر ہجوم لاتے ہیں۔ ہڈی چمڑا زخمی کر ڈالتے ہیں۔ میں بھی اس سرا میں اترا۔ ایک تو گرمی مکان اور تکلیف مچھڑوں سے حیران تھا۔ دوسرے لید اور گوبر کی بو دماغ کو پریشان کرتی۔ طرفہ اس پر یہ کہ ہر ایک بھٹیاری آدھی رات تک آپس میں لڑے ان وجہوں سے نیند آنکھ میں حرام ہوئی۔ یہاں کی تکلیف سے لندن کی سرا یاد آئی کہ وہاں کیا کیا آسائش تھی۔ مسافر جب وہاں پہنچتا ہے۔ ایک شخص سپید پوشش دروازے تک آتا ہے بڑی عزت اور تکلف سے دوسرے مکان بلند میں لے جاتا ہے۔ شیشہ آلات در و دیوار میں لگے۔ کوچ مخملی بچھونوں کی ہر چہار طرف بچھی۔ ہوا کھڑکیوں کی راہ سے جو آتی ہے مانند نسیم بہشت روح میں قوت دیتی ہے۔ مکھی یا مچھر کا ہرگز اس میں نام و نشان نہیں۔ نیچے کے مکان میں میزوں پر ہر طرح کے کھانے چنے ہوتے بعد تزئین مسافر کو جس کھانے کی تمنا ہے۔ میز پر مہیا ہے۔ جب کھانے کی نوبت آئے۔ ایک پریزاد سامنے بیٹھ کر بین بجائے۔ بعد فراغت کے شراب وین خوشبودار اور

[1] چیلڑ۔ اس کو چلوا یا چیلڑ بھی کہتے ہیں (فرہنگ اثر) [2] ناک کی غلاظت

میوے ہر قسم کے مزیدار لا کر کھلاتی۔ صبح کے وقت ایک رنڈی نہایت حسین سرہانے آ کر ملائم آواز سے آہستہ آہستہ جگاتی ہے اور آواز امروز روز خوش کی مسافر کے کان میں سناتی ہے۔ سوا اس کے اور پریاں پوشاک نفیس پہنے سامنے آتی ہیں۔ تراش خراش میں ایک سے ایک نرالے انداز دکھاتی ہیں علاوہ اس سے کوچ گاڑی فرش مخملی وغیرہ کی سواری کے لئے جگہ ملتی ہے ایک دن میں سو کوس کی منزل پر بے رنج و تکلیف پر پہنچا سکتی ہے۔ مسافر سفر میں ایسی آسائش پاتا ہے کہ گھر بھول جاتا ہے۔ ان سراؤں کو اگر بہشت کہوں بجا ہے۔ اور اگر باغ ارم سے تشبیہ دوں روا ہے انگریز لوگ اگر ہندوستان کے مکانوں اور سراؤں کو ناپسند کریں ہو سکتا ہے اس لئے کہ لندن کے مکانوں یا سراؤں سے یہاں کا کوئی مکان اور سرا نسبت نہیں رکھتا ہے۔

ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اس نواح میں چار کوس کے بعد ہر چیز ملتی ہے بلکہ جا بجا بستی ہے۔ یہاں اگر مسافر سارا دن چل کر بہزار خرابی سرا میں پہنچے۔ عذاب دوزخ اور سخت بلا میں مبتلا ہوئے بھلا انگریزوں کو یہ سرا کیونکر بھاوے۔ جب ہم ہی لوگوں کو پسند نہ آوے۔ قصہ مختصر بندہ ایک دن سیر و تماشے کے لئے وہاں رہا بازار اور دریا کی سیر کو گیا ایک جگہ ایک فقیر فربہ لحیم و جسیم ہندو مذہب بیٹھا تھا۔ سر سے پاؤں تک ننگا۔ عورتیں ہندوؤں اور مہاجنوں کی اس کے[1] ۔ ۔ ۔ کو پوج رہی تھیں اپنے نزدیک گویا عبادت کرتی تھیں۔ کوئی بہت ذوق شوق سے اس کو ہاتھ میں لے چومتی۔ کوئی پھول اور چاول اس پر چھڑکتی۔ وہ فقیر ننگا عجب صاحب نصیب تھا

[1] یہ اور اس کے آگے پانچ مقامات پر مصنف نے ایسا لفظ لکھا ہے جو نامناسب اور عریاں ہے لہٰذا حذف کر کے جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہے (مرتب)

کہ اندر کے اکھاڑے میں بے پروائی سے بیٹھا نظارہ جمال پری زادوں کا کرتا ایک
نے ان پریوں میں سے گاڑھے دودھ میں قند کا چورہ ملایا۔ بہت خوشامد و لجاجت
سے اس بے حیا کو پلایا۔ مجھ کو یہ ماجرا دیکھ کر بے اختیار غصہ آیا۔ یہی جی چاہا کہ
اس مردک بے شرم کو ایک لاٹھی ماروں اور رنڈیوں کو تو اس کے پاس سے ہٹا
دوں۔ پھر جو غور کیا یہ امر مناسب نہ سمجھا ناچار صبر کیا۔ اس واسطے کہ وہ رنڈیاں
بہت حسن اعتقاد سے ۔ ۔ ۔ پوجتی تھیں۔ صورت تہدید میں اس نابکار کو رنج
ہوتا اور وہ بھی آزردہ ہوتیں۔ مزاحمت کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل میں خیال آیا
میں بھی سپہ گری اور دوا دوش[1] ملکوں کی چھوڑ دوں۔ ننگا ہو کر اپنے تئیں مہاریشی
بناؤں اور ان رنڈیوں حسینوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ پجواؤں۔ زندگی کا مزہ اور لطف
پاؤں۔ نوکری میں اذیت ہے پر اس فقیری میں عجب کیفیت ہے پریاں اطاعت
میں حاضر رہتی ہیں۔ دودھ اور موہن بھوگ[2] لا کر کھلاتی ہیں۔ بھلا یہ مزہ
نوکری میں کہاں۔ اس سے اُس سے تفاوت زمین و آسمان۔ ہندو عجب بے تمیز
ہوتے ہیں کہ اپنی جوروؤں کو برہنہ مکار فقیروں کے پاس بھیج ۔ ۔ ۔ ۔ پجواتے
ہیں۔ چاہیئے تھا ان کو اس امر بے جا سے روکنا سو برعکس بخوشی اجازت دیتے
ہیں۔ ننگے آدمی سے مرد آنکھ بچا جاتے ہیں حیف ہے کہ اس کے پاس رنڈیاں جا
۔ ۔ ۔ پوجیں۔ یہ کیا حرکت لچر ہے اور کیسی رسم ابتر ہے خیر بندہ یہ حال دیکھ کر
سرا میں آیا۔ لوگوں سے یہ قصہ نقل کیا ایک بھٹیارے نے کہا تم نے ابھی کیا دیکھا
یہ تو ذرا سی بات ہے اگر فلانے گھاٹ پر چھپ کر جاؤ دیکھو ان کی کیا کیا حرکات ہے۔
میں بہت مشتاق ہوا۔ رات کو اس گھاٹ پر جا کر مخفی بیٹھا۔ ڈیڑھ پہر رات
گئے دو تین جوگی سنڈھے نوجوان مٹھائی ہاتھ میں لئے آئے اور دو تین حسین

---

[1] دوڑ دھوپ [2] حلوا بیٹھا

رنڈیاں مہاجنوں کی بیبیاں ساتھ لائے۔ ایک ڈونگی پر سوار ہو کر دریا پار گئے
ایک باغ میں نفیس بچھونا بچھا کر چین سے بیٹھے۔ بندہ بھی چالاکی کر کے ایک چھوٹی
ناؤ پر سوار ہو کر پار اترا۔ کرائے اس کے کا ایک روپیہ دیا۔ ان کی آنکھ سے چھپ
کر ایک کنارے بیٹھ رہا۔ انہوں نے مجھ کو نہ دیکھا۔ پہلے سبھوں نے مل کر مٹھائی
کھائی۔ بعد اس کے ان میں اور رنڈیوں کے درمیان بات چیت کی نوبت آئی
یہاں تک ہنگامہ عیش و نشاط گرم ہوا کہ جوگیوں نے ان سے مساس کیا آخر طرفین
سے قوائے شہوانی جوش میں آئیں۔ جوگیوں نے ساق بلوریں ان پریوں کے ہاتھ
میں لے کر کمر سے کمر ملائیں۔ کیفیتیں صحبت کی اٹھائیں۔ جام وصال ان کے
سے بادہ نوش ہوئے۔ ساری فقیری اور جوگ بھولے۔ جب فراغت کر چکے
اس پار آئے۔ رنڈیاں اپنے گھر گئیں جوگیوں نے ایک درخت کے نیچے
آسن مارے اور مونگے کے مالا ہاتھ میں لے کر رام رام جپنے لگے یہ ماجرا دیکھ اوّل
دل میں آیا کہ ضرور ہی ان حرامزادیوں کے حال سے ان کے وارثوں کو خبر کرنا چاہیئے
پھر یہ سمجھا کہ اگر یہ حال جا کر ان سے کہوں۔ وہ بے عقل ہیں شاید برخلافی مذہب
باعث خصومت جان کر آمادہ مقابلہ ہوں۔ ناحق بات بڑھے۔ حاکم تک پہنچے
بہرحال اس مقدمہ میں سکوت کرنا بہتر معلوم ہوا۔ سرا میں آیا۔ ہندو عجب عقل ناقص
رکھتے ہیں کہ ننگ و ناموس کا کچھ خیال نہیں کرتے ہیں۔ یعنی از راہ حماقت جوگیوں
طویل القامت۔ بدمستوں کو صاحب کمال جانتے ہیں۔ بے تکلف اپنی جوروؤں کو
ان کے پاس بھیج کر خراب کرواتے ہیں۔
قصہ مختصر بندہ سرائے میرزا پور سے گھوڑے پر سوار ہو کر آگے چلا۔ سولہ
کوس منزل طے کر کے بنارس پہنچا۔ یہ شہر میرا دیکھا ہوا تھا۔ پر اس بار بھی خوب پھرا اور
سیر دیکھتا رہا۔ رستہ بازار کا مانند شہروں ہند کا تنگ تھا۔ الا خوب آباد ہے اور

---

[1] چھونا۔ ہاتھ پھیرنا

اسباب سب قسم کا ملتا۔ قصائی جو بکری کا گوشت بیچتے تھے ایک بڑی دوکان
مگر بہت انحلا پر بیٹھے تھے۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے گوشت کو ایک کثیف چیتھڑے
پر رکھے ہوئے اوپر سے ایک اور میلا کپڑا اوڑھائے خریداروں کو اس کے دیکھنے سے
نفرت آئے۔ بیچتے وقت ہزاروں مکھیاں گرتیں۔ بھتیری اس میں حل ہوتیں۔
ہندوستان میں یہ شہر عمدہ مشہور ہے جب اس کا یہ دستور ہے اور قصبات دیہات
کا کیا مذکور ہے۔ برخلاف انگلستان کے کہ وہاں قصائی پوشاک سپید اور نفیس پہنے
دوکان رشک گلستان پر نفاست سے بیٹھے ہیں۔ ٹکڑے گوشت فنر کے
مانند دستوں پھول کے برابر لٹکا کر بیچتے ہیں۔ ایک طرف پارچے اور ہبرا مسلم
لٹکی۔ دوسری طرف چھٹی قیمت ہر ایک کی لکھی۔ جو خریدار آتا ہے بے تکلف چٹھی
کے موافق قیمت دے کر ٹکڑا گوشت کا لے جاتا ہے اسی طرح مچھلی اور مرغی بیچنے
والوں کا حال ہے۔ وہاں کے سب دوکانداروں کی یہی چال ہے۔ دوکان داروں
کو بیشتر سے جنہد کیا رصفائی سے ان پر جوبن تھا افسوس کہ ہندوستانی اپنے اپنے
فنون میں کامل ہیں رصفائی ستھرائی ہر چیز کی سے غافل ہیں۔ بنارس میں کنارے
گنگا کے ایک مکان عالیشان بنا ہے سابق وہ بت خانہ تھا۔ عالمگیر نے اپنے عہد
میں اس کو کھدوا کر بطور مسجد بنوایا ہے اب وہ تماشا گاہ خلائق ہوا۔ بندہ بھی ایک
روز اس کو دیکھنے گیا۔ بدویوں کی پوشاک پہنے تھا۔ کئی راجہ ہندو اور مسلمان صاحب
آبرو وہاں موجود تھے۔ میری وضع نرالی دیکھ کر حیران ہو کر پوچھنے لگے۔ تم کون ہو
کہاں سے آتے ہو۔ میں نے کہا فقیر ہوں پھرتے پھرتے ادھر بھی آ نکلا۔ انہیں
اس تقریر سے غرض کیا۔ انہوں نے نہ مانا زیادہ اصرار کیا۔ میں نے جواب دیا کہ مرد سیاح
جادو پیما ہوں۔ ملک فرنگستان سے آتا ہوں۔ وہ بہت متعجب ہوا کہ اللہ بہت
دور سے آئے۔ اب یہ بتاؤ کہ انگلستان بنارس کی سی آبادی رکھتا ہے۔ یہاں کا

لہ لفظی معنے کمان کا چلہ

سا مکان اور محل بلند سنگین وہاں بھی بنتا ہے۔ یہ سن کر میں ہنسا انہوں نے تعجب
کیا کہ سچ کہو ہنسنے کا باعث کیا۔ تب تو میں نے کہا۔ وہ ملک روئے زمین میں جنت
خانہ ہے اس کے سامنے یہ شہر اور عمارت اس کی پاخانہ ہے۔ اس شہر ناہموار کو
اس سے کیا نسبت۔ اس میں اس میں بڑا تفاوت۔ وہاں ایسی فضا اور وسعت ہے
کہ گویا نمونہ جنت ہے اگر وہاں ایسی تنگی اور عفونت ہوا ہوتی۔ انگریزوں کی زیست
اصلا نہ ہوتی۔ یہاں کی سی بے حیائی اگر وہاں کے لوگ کرتے انگریز ان لوگوں کو
جان سے مارتے۔ یہاں کے لوگ عجب بے حیا ہوتے ہیں کہ ایک لنگوٹی غرقی[لہ] سے
سے ستر ڈھاکتے ہیں۔ اس سے مقام بول و براز نظر آتے ہیں پردہ کسی زن و مرد
سے شرم و حیا نہیں رکھتے ہیں۔ انگلستان میں مرد اور عورت تہرے چوہرے
کپڑے پہنتے ہیں۔ یہ کیا ممکن کہ سارے بدن میں اکہرا کپڑا بھی پہنیں۔ اس سرزمین
میں بہ نسبت ہر اقلیم کے میوے اور نعمتوں کی زیادتی ہے روز بروز ثروت و
حشمت کی ترقی ہے انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہاں یہ سب امر میسر ہوتے
ہیں انگریز کیوں اس شہر کو چھوڑ کر تلاش معاش میں اور ملکوں میں پھرتے ہیں
تم ہندوستانی ہو کر لندن کی تعریف کرتے ہو۔ شاید وہاں انگریزوں کے ساتھ
کھانا کھایا اور ان کے مذہب میں آئے ہو اس سبب سے ان کا دم بھرتے ہو۔
میں نے کہا تم غلط کہتے ہو کوئی کسو کے ساتھ کھانے سے اس کے مذہب میں نہیں
آجاتا ہے۔ مذہب دل سے تعلق رکھتا ہے۔ ساتھ کھانے اور زیادتی صحبت غیر مذہب
والے سے مذہب میں کچھ خلل نہیں آتا۔ میں نے اگرچہ انگریزوں کے ساتھ
کھایا۔ پر اس وجہ سے ان کے مذہب میں نہیں آیا۔ جب تک دل سے ایمان نہ
لاؤں اور ان کے مذہب میں نہ آؤں میں مذہب سلیمانی رکھتا ہوں۔ موافق اور

لہ غرقی بھی لنگوٹی کو کہتے ہیں۔

مخالف دونوں سے صلح کرتا ہوں۔ میں نے تم سے جو تعریف لندن کی کی، ساری حق اور صحیح تھی۔ ان میں مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ انگریزوں سے مجھ کو علاقہ نہیں اور یہ جو تم نے کہا کہ اگر انگلستان میں یہ ناز و نعمت ہوتی۔ انگریز لندن سے کیوں باہر نکلتے، صورت اس کی یوں ہے کہ اس اقلیم کی وسعت پانسو کوس کی ہے، ہمیشہ لوگوں کی اولاد بڑھتی ہے، اگر سب وہیں رہتے، مکان رہنے کے نہ ملتے۔ اس واسطے بعضے اس شہر کو چھوڑ کر عربستان یا ہندوستان وغیرہ میں جاتے ہیں، نقد و اسباب جمع کر کے پھر اپنی ولایت آتے ہیں۔ اسی سے خیال کرو اگر اس ملک میں یہ لطف و خوبی نہ ہوتی۔ کیوں انگریز اور شہروں سے روپیہ جمع کر کے وہاں چلے جاتے اور جو کہ سامان خاطر خواہ نہیں پاتے ہیں، جہاں جاتے ہیں وہیں بسر کرتے ہیں، اس صورت میں انگریزوں کا اور ملک میں رہنا بہ لاچاری ہے گویا بلبل باغ کی رہنے والی کو قفس میں گرفتاری ہے۔

جب پنجرے سے چھوٹے، باغ میں اڑ جائے۔ انگریز بھی جب طاقت پائیں۔ ملک بیگانہ سے لندن میں جادیں، اور یہ جو ہندی مشہور کرتے ہیں کہ انگریز ہندوستان میں اکثر ثروت پاتے ہیں لندن سے محتاج آتے ہیں محض جھوٹ کہتے ہیں، اس ملک کا انتظام ایسا کہ جب لڑکا کسی کے ہاں پیدا ہوا۔ دائی کی گود میں سونپا یہاں تک کہ سن شعور کو پہنچا، صفائی کا یہ عالم کہ کوئی کپڑا میلا یا متعفن اس کے پاس تک نہیں آنے پایا۔ پھر مکتب گلزار آئین میں فرش سفید بچھاتے ہیں پوشاک صاف ستھری پہنا کر اس کو پڑھاتے ہیں، ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں ناز و نعمت سے پرورش دیتے ہیں۔ بعد اس کے زیادہ مستعدی کے لئے اسکول بھیجتے ہیں، وہاں بھی ہزاروں روپے عوض تعلیم وغیرہ کے دیتے ہیں، بعد فراغت ان سب باتوں کے کسی عہدہ ادنیٰ میں سو سوا سو روپے کا نوکر شاہی ہوتا ہے۔ بتدریج رتبے

اور عہدہ اعلیٰ کو پہنچتا ہے بھلا اگر ان کو دولت و حشمت نہ ہوتی۔ صورت تعلیم و تربیت اس صرف زائد سے کیونکر ہو سکتی۔ خورد و بزرگ وہاں کے پر شرم و حیا لڑکوں کا ایسا فہم رسا کہ ثروت آبائی پر مغرور نہ ہو کر مثل عوام کے ہزاروں محنت و مشقت سے علم و ہنر حاصل کرتے ہیں۔ باپ ان کے ان باتوں سے نہایت راضی اور خوش ہوتے ہیں۔ لڑکے ہندوستان کے باپ کی حشمت پر غرہ کرتے ہیں، کسبیوں کی صحبت میں اوقات برباد کر کے انجام کار نہیں سوچتے ہیں کہ بعد باپ کے ہم تدبیر معاش کس ہنر سے کریں گے۔ زندگی اپنی کیونکر بتائیں گے۔ طرفہ ماجرا یہ ہے کہ باپ ان کے ان کا حال لہو و لعب دیکھ کر فکر مال سے غافل ہو کر خوش ہوتے ہیں۔ درشتی کا کیا مقام کلمہ پند و نصیحت بھی نہیں کہتے ہیں۔

القصہ یہ کلام کر کے اس مکان سے سرا میں آیا۔ ارادہ کلکتہ جانے کا کیا۔ اس سبب سے کہ میں جریدا[1] راہ خشکی سے آیا تھا اسباب ضروری لندن سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ باقی کپڑے اور اسباب اپنا راہ دریا سے کلکتہ میں روانہ کر دیا تھا یہاں آ کر کپڑے پرانے ہوئے اس واسطے اور زیادہ ہم کلکتہ جانے پر مستعد ہوئے خرچ راہ کا میرے پاس تھوڑا رہا، یقین کہ خشکی کی راہ سے پورا نہ پڑتا۔ اس وجہ سے ناؤ کی تلاش کرنے لگا، بہت جستجو سے ثابت ہوا کہ کئی برہمنوں نے شریک ہو کر ایک کشتی ٹھہرائی ہے۔ کلکتہ کی طرف ان کی جوائی ہے۔ بندہ نے ان کے پاس جا کر اظہار کیا کہ میں بھی تمہارے ساتھ کلکتہ چلوں گا۔ انہوں نے یہ بات کہی۔ ہمارے تمہارے شرکت نہ نبھے گی۔ تم ترک کہلاتے ہو، گوشت جانوروں کا کھاتے ہیں۔ ہم لوگوں کو اس سے نفرت ہے پھر بھلا ہمارے تمہارے کیا لطف صحبت ہے میں نے کہا،

---

[1] تنہا

بہر صورت تمہاری اطاعت کروں گا۔ راہ بھر گوشت نہ کھاؤں گا جب یہ قول وقرار ہو چکا ناؤ کا کرایہ ٹھہرایا۔

پھر پانچویں تاریخ جولائی کے ان برہمنوں کے ساتھ ناؤ پر سوار ہو کر کلکتہ چلا بموجب اقرار ساری راہ روٹی گیہوں کی اور ماش کی دال کھایا کیا۔ مفری صاحب جو شریک حصہ ہملٹن صاحب کمپنی کے تھے۔ بسبب بیماری کے ایک بڑی ناؤ پر سوار ہو کر تبدیل آب و ہوا کے لئے پٹنہ کی کوٹھی میں اپنے بھائی ڈاکٹر راجرڈ صاحب پاس آتے تھے۔ راہ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ دور سے مجھ کو دیکھ کر بہت اشتیاق سے آواز دی کہ اے یوسف کمل پوش سلیمانی مذہب کہاں جاتے ہو اور کدھر سے آتے ہو۔ میں ان کی ناؤ پر جا کر دو گھڑی ٹھہرا۔ حال اپنا بیان کیا پھر رخصت ہو کر اپنی ناؤ پر آیا۔ برہمنوں نے کلام انگریزی جب میری زبان سے سنی حیران ہو کر پوچھنے لگے۔ سچ کہو تم کون ہو اگر مذہب مسلمانی رکھتے ہو زبان انگریزی کہاں سے سیکھے ہو۔ میں نے کہا اس کا تعجب کیا۔ بہت مسلمان کلکتہ میں رہتے ہیں۔ انگریزی بولی بول سکتے ہیں۔ وہ تو بہت گھبرائے تھے، پر میرے سمجھانے سے سمجھے۔ چلتے چلتے ناؤ ہماری قریب جنگی پور کے پہنچی۔ بابت محصول پرمٹ کے وہاں روکے گئے اور بہت کشتیاں دیر سے رکیں تھیں اس لئے کہ بے محصول دیئے کیونکر جا سکتیں۔ میں نے پوچھا سبب کیا جو محصول دینے میں اتنا عرصہ کھینچا۔ لوگوں نے کہا بابو فلانا یعنی داروغہ گھاٹ کا ابھی سوتا ہے جب میں نے یہ حال سنا آدمی کے ہاتھ کہلا بھیجا۔ بابو صاحب کتنی دیر میں جاگیں گے دریافت ہوا دو تین گھڑی بعد خواب راحت سے فراغت پائیں گے چار ناچار میں نے ناؤ کو ٹھہرایا اسی عرصہ میں ایک فقیر لنگڑے[1] گونگے نے ناؤ کے سامنے آکر اشارے انگلیوں سے سوال کیا۔ مجھ کو اس کی پانگٹے[1] اور بے زبانی پر رحم آیا۔ روٹی اور ترکاری

[1] لنگڑا پن

منگوا کر دینے لگا۔ اس حرامزادے نے تکرار کر کے سر ہلایا کہ مجھ کو پیسہ دو روٹی نہ لوں گا۔ کچھ کوڑیاں دیں وہ بھی نہ لیں تب میرے ساتھیوں سے ایک برہمن نے روغنی روٹی نکال کر دی، وہ بھی دیکھ کر انکار کی، پیسہ مانگتا ہے اور کچھ نہ لیتا۔ معلوم ہوا کہ پیٹ بھرا ہے۔ شرارت اور بد ذاتی سے مانگتا ہے۔ ہم نے سکوت کیا اور نہ اس کو کچھ نہ دیا۔ وہ کسی طرح نہ مانتا۔ ناؤ پر ڈھیلے پھینکتا۔ ہم اس کے ہاتھوں سے تنگ آئے ناچار ہو کر اس کی پیٹھ پر دو تین کوڑے مارے دکھلانے کو گونگا تھا۔ کوڑے کھا کر صاف بولنے لگا۔ لنگراہٹ بھی جاتا رہا۔ گالیاں سخت دیتا۔ میں نے خوب سمجھایا کہ اس حرکت سے تو باز آ اس نے ہرگز نہ مانا اور کہا تم کو تھانہ دار پاس لے چل کر قید کرواؤں گا۔ مجھ کو اور زیادہ غصہ آیا اس کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ایک گڑھے کیچڑ بھرے ہوئے میں دے مارا سارا بدن اس کا کیچڑ سے بھر گیا لیکن اگلی باتوں سے باز نہ آیا۔ آخر میں اس کی بے حیائی سے لاچار ہوا چار پیسے دے کر رخصت کیا بعد اس کے کچہری پرمٹ میں آکر کہا۔ ہم نے چار گھڑی سے ناؤ کو یہاں ٹھہرایا۔ بابو صاحب ابھی تک آرام خواب میں ہیں۔ ہم ناحق عذاب میں ہیں۔ نائب اور گماشتوں اس کے نے رنجش سے کہا سینکڑوں کشتیاں رکی ہیں ستم ہیں کیا صاحب کا ہرگز جو اتنی دیر میں گھبرا گئے۔ ہم تک شکوہ لائے چار گھڑی کیا اگر چار روز بھی تمہاری ناؤ یہاں رہے۔ بعید نہیں بلکہ حق بجانب ہے۔ میں اس فقیر کی حرامزدگی سے پہلے ہی سے جل رہا تھا ان کے کلام سن کر آگ بگولا ہو گیا مگر جواب تند نہ دے سکا۔ اپنے تئیں سنبھالا۔ بقول شخصے قہر درویش بجان درویش غصہ ضبط کیا۔ اسکول گھر میں ایک ماسٹر انگریزی لڑکوں کے پڑھانے پر مقرر تھا۔ میں نے لاچار ہو کر اس کے پاس جا کر زبان انگریزی میں کہا۔ تمہارے شہر میں یہ کیا اندھیر اور زیادتی ہے۔ مسافروں کی ناؤ چار چار روز رکی جاتی ہے بندہ محصول

دیتا ہے ناحق داروغہ گھاٹ کشتی روکتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے میرے ساتھ بابو کے مکان پر جا کر محصول دلوایا اور جھٹ پٹ روانا[1] لکھوا کر مجھ کو دیا انگریزوں کی رائے صائب کو یہ امر بعید نظر آتا ہے کہ ان کی عملداری میں بسبب غفلت کے ایسا ظلم صریح ہوتا ہے وہ بابو یعنی داروغہ پرمٹ جس کو انگریز جانتا۔ فی الفور روانا کشتی اس کی کا لکھوا کر روانہ کرتا مگر ہندوستانیوں پر جبر تھا شاید کوئی انگریز لباس ہندوستانی سے وہاں نہیں آیا نہیں تو حال اس کا کھل جاتا اور تدارک قرار واقعی ہوتا۔

چلتے چلتے پچیسویں تاریخ جولائی کے ناؤ ہماری کلکتہ پہنچی۔ دوستوں آشناؤں سے ملاقات ہوئی۔ سبھوں نے میرے حال پر شفقت کی۔ ملٹن کمپنی اور کرانصاحب نے یہ بات کہی کہ تم کرایہ کی حویلی نہ لو ہمارے مکان پر اترو میں نے کثرت صحبت باعث کمی الفت سمجھ کر نہ مانا۔ محلہ ٹیک خانہ میں ایک مکان بیس روپے کرایہ کا مع تنخواہ باغبان کے کر رہا۔ بیچ میں عمارت نفیس اور مکان خوش وضع تھے۔ گرداگرد درخت میوے اور پھولوں کے۔ جب میں لندن جاتا تھا سیر اس شہر کی بخوبی کر چکا تھا مگر اس خیال سے کہ شاید انقلاب زمانہ سے کچھ صورت بدلی ہو پھر پھر اہ حال وہاں کا دیکھا۔ جن دوکانوں پر چھپر پڑے تھے۔ کھپریل بنی جن راہوں میں تنگی تھی، وسعت ہوئی۔ جو دوکانیں سابق بد قطع تھیں۔ اب کے مرتبہ مرتب اور تیار دیکھیں۔ زمانہ عجب انقلاب دکھاتا ہے کہ کسی آدمی یا جگہ کو سدا ایک حال پر نہیں چھوڑتے۔ بعد اس کے اور مکانوں میں جن کو پہلے نہیں دیکھا تھا دوستوں کے ساتھ دیکھنے گیا۔ لطف و صنعت سبھوں کا بنظر غور دیکھا۔ چنانچہ مارچ صاحب نے گلڈ ہال میں ہارسن صاحب نے ٹوڈن ہال میں۔ کرانصاحب نے میوزیم اور اور جاؤں پر لے جا کر تماشا دکھلایا۔ وصف ان مکانوں کا زبان سے بیان نہیں ہو سکتا۔ بنگالیوں

---

[1] روانگی کا اجازت نامہ مراد ہے

کے لڑکے دیکھے بے تکلف مثل ولائیتوں کے کلام انگریزی کرتے چرچا علم کا روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اگر یہی حال بیس برس تک رہتا ہے۔ یقین کہ وہاں رہنے والوں سے کوئی بے علم و جاہل نہ رہے گا بلکہ بجائے خود ہر ایک استاد بنے گا۔ لڑکے بنگالیوں کے شوق دلی سے علم انگریزی پڑھتے ہیں۔ مدرسوں میں استاد فارسی خوان بھی نوکر رہتے ہیں۔ علم فارسی لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح عربی کے لئے عالم کامل جانب شاہ لندن سے مقرر ہوئے ہیں۔ طالب علموں کو صرف نحو منطق ریاضی ہیئت فلسفہ حکمت پڑھانے میں مستعد رہتے ہیں۔ اگرچہ بندہ عربی فارسی میں دخل نہیں رکھتا ہے کہ بیان کمالات ان کے کا تفصیل کرے مگر ایک عالم کے دو تین شاگردوں سے ملاقات ہوئی۔ کامل پائی ان کی عقل و دانائی۔ اس دلیل سے ثابت ہوا حال مستعدی مدرسوں کا کہ جن کے ادنیٰ شاگردوں میں یہ عقل رسا ہے کیا مذکور ان کے علم و فضیلت کا۔

غرضیکہ کوشش انگریزوں سے کلکتہ دار العلم ہوا ہے۔ قلعہ کلکتہ کا سب قلعوں سے زیادہ مضبوط ہے اور تین سینکڑوں توپیں اس میں لگیں۔ اگر روپیہ آدمی کے پاس موجود ہو جو چیز کہیں نہیں ملتی۔ اس شہر میں میسر آتی ہے۔ عجب نادر شہر اور بستی ہے اگر کسی پاس روپیہ اور مال ہووے وہاں جا کر مزہ زندگانی کا لوٹے کہ ہمہ چیز وہاں ملتی ہے۔ ہر ملک کے آدمیوں کی صورت نظر آتی ہے۔ کنارے گنگا کے چنپا گھاٹ پر ہر روز ایسی کیفیت ہوتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس بھول جاتی ہے۔ ہر طرف سبزہ اگا ہے۔ جاڑے گرمی اور ہر فصل میں ہرا رہتا ہے جہاز روم اور روس اور حبش کے یہاں آ کر مقام کرتے ہیں۔ صاحبان انگریز اور بی بیاں بگھی پر سوار ہو کر وہاں ہوا کھانے جاتے ہیں۔ گھوڑے اور بگھی مانند ہم لندن کے یہاں کرایہ پر ملتے ہیں روز بروز سب سامان اور انداز لندن کے سے

ہوتے ہیں۔ صاحب علم اگر اس شہر میں جائے ہرگز مفلس و محتاج نہ رہنے پائے سڑکیں یہاں کی ہموار اور صاف آئینہ مثال کوڑی یا مردے جانور پڑے رہنے کا کیا مجال۔ رستے ایسے ہی پختہ بنے کہ پانی یا جو کچھ اس پر گرے، دونوں طرف ڈھلے۔ ایک قسم آدمی پہاڑی جو ڈھانگر کہلاتے ہیں۔ سرکار سے کئی ہزار روپے درماہہ سوا چھکڑوں کے پاتے ہیں۔ وہ تمام شہر کا کوڑا اور گندا پانی موریوں کا چھکڑوں پر لاد کر باہر پھینک آتے ہیں۔ اب ہندوستان میں کوئی شہر مقابل اس کے نہیں نظر آتا ہے۔ بندہ از راہ انصاف سچ کہتا ہے میں اسی سیر و تماشے میں دو مہینے وہاں رہا اور حال سفر اپنے کا بطور کتاب جمع کرنا چاہا مگر پاس میرے خرچ تھوڑا سا رہ گیا تھا اور کوئی یار و مددگار نہ ہوا لاچار قصد روانگی کا کیا۔
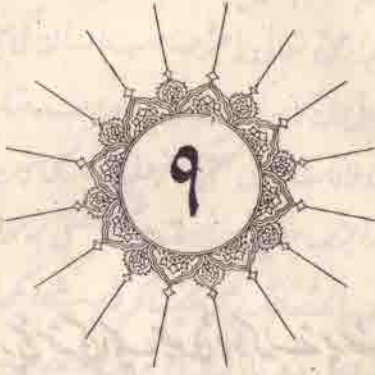
ساتویں تاریخ ستمبر کی ایک چھوٹی ناؤ کرائے پر مقرر کر کے گنگا کی راہ سے بنارس چلا۔ اس سال گنگا بڑی طغیانی پر تھی اور بسبب بڑھنے پاٹ کے آب کے باغوں میں بہتی۔ یعنے اپنی جگہ اصلی سے بہت بڑھی تھی۔ زور بہنے اپنے کے سے سینکڑوں درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر ڈوبایا۔ دو تین دن تک ہم کو کنارہ نہ نظر آیا۔ لاچار ہو کر ایک آنب کے درخت میں ناؤ کی رسی کو باندھا۔ شب بھر وہاں مقام کیا۔ صبح پھر روانہ ہوا۔ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اس مرتبہ گائے بھینسوں کو پانی میں ڈوبتے۔ سینکڑوں سانپ بچھو ہماری ناؤ پر چڑھے آتے۔ بہزار خرابی دن رات چل کر دیوان گنج میں بھاؤ سنگھ کی کوٹھی میں ڈاکٹر راجرٹ صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ تجارت نیل اور ریشم کی کرتے تھے۔ راجرٹ صاحب اور ان کی میم نے نہایت شفقت و عنایت فرمائی۔ میں نے بہر صورت وہاں آسائش پائی۔ سچ تو یہ ہے کہ بندہ نے ان کی میم صاحب کی سی عورت خلیق کم دیکھی۔ کہ مسافر نوازی میں بدل و جان مصروف ہوتی۔ بندہ تین دن عیش و عشرت میں رہا تفریح طبع کے واسطے شکار بھی کیا۔ رمفری صاحب سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بیماری سابقہ سے صحت پائی تھی۔ بہت گرم جوشی سے پیش آئے۔ دیر تک ذوق شوق سے ہم آغوش رہے۔ بعد تین دن کے فقیر نے نیت چلنے کی کی۔ راجرٹ

صاحب اور میم صاحب سے رخصت چاہی۔ دونوں صاحبوں نے یہ بات کہی ابھی نہ جاؤ۔ چند روز یہاں رہو۔ میں نے بہت کہہ سن کر راضی کیا اور رخصت ہو کر وہاں سے روانہ ہوا۔ حق تعالیٰ راجرٹ صاحب اور ان کی میم صاحب کو ترقی مراتب پر پہنچا دے کہ دل ان کا مسافر نوازی پر مصروف رہتا ہے۔ ولایت میں ان کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی میرے حال پر کمال مہربانی فرمائی تھی۔ جب بندہ راجرٹ صاحب سے رخصت ہو کر کشتی پر سوار ہو کر چلا۔ راہ میں ایک دن تیسرے پہر دریائے گنگ میں ایک کو ڈوبتے دیکھا۔ ملاحوں سے کہا۔ شاید یہ کوئی آدمی ہے۔ ڈوبتا۔ اگر کوئی تم میں سے جائے اور اس کو میرے پاس لائے موافق مقدور کے انعام دوں گا۔ ملاحوں نے جواب دیا اس دریائے قہار میں اپنے تئیں گرانا عاقبت اندیشی سے دور ہے اور ناؤ کو بھی اس طرف لے چلنا سراپا فتور ہے مبادا صدمہ پانی کا پہنچے ناؤ ڈگمگا کے ڈوبے اسی طرح سینکڑوں آدمی ڈوبتے ہیں۔ ہم کس کس کو دریا سے نکالیں۔ جب ملاحوں نے میری بات نہ سنی اور کسی اور نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی۔ میں نے بے اختیار ہو کر دل میں کہا۔ اگر طبیب دوا مریض کی نہ کرے۔ مواخذہ وار ہو وے۔ میں تیر نے میں دخل رکھتا ہوں۔ اگر اس کو دریا سے نہ نکالوں گنہگار خدا کا ہوں بلا تحاشے آپ دریا میں کودا۔ اس ڈوبتی عورت کو نکال کر کنارے لا کر کہا اگر تجھ کو منظور ہو میری ناؤ پہ آ کہ تیری دوا کروں۔ صورت صحت دکھلاؤں۔ اس کم بخت نے نہ مانا۔ دل میں کچھ اور ہی خیال کر کے کہا میں کیوں تیری کشتی پہ آؤں تو دھرم میرا برباد کرے گا۔ میں نے دل میں کہا۔ سبحان اللہ جس سے نیکی کی وہ کچھ اور ہی سمجھے۔ کلام شیخ سعدی رحمۃ اللہ کا یاد آیا۔ نکوئی با بداں کردن چنانست
کہ بد کردن بجای نیک مرداں

آدمی کو چاہیئے کہ نا قدردان کے لئے جان اپنی محل ہلاکی میں نہ ڈالے اور بڑوں کے ساتھ برائی سے درگذر نہ کرے یہ حال دیکھ کر اپنی ناؤ پر سوار ہوا اور منزل مقصود کا رستہ لیا۔ چلتے چلتے منگیر پہنچا۔ ناؤ سے اتر کر شہر میں گیا۔ شہر چنداں وسعت نہ رکھتا مگر آباد خوب تھا۔ آب وہوا وہاں کی اور شہروں سے معتدل اور بہتر تھی۔ قریب دس کے کئی پہاڑ ان پر سبزی لگی۔ متصل اس سے ایک چشمہ پانی کا خوشگوار کئی مکان سارجنوں کے اس قرب میں تیار۔ سارجن مع اپنی بی بی لڑکوں کے لب جو بیٹھے مچھلیوں کا شکار کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر آثار شگفتگی اور بشاشت کے نمودار۔ پیشہ ور وہاں کے اپنے اپنے فن میں کمال رکھتے۔ عمدہ عمدہ چیزیں کنارے گنگا کے لاکر مسافروں کشتی نشینوں کے ہاتھ سستی بیچتے چنانچہ میرے سامنے پنجیری عجیب وغریب اور گوشت اور مچھلیاں اور سب چیزیں ارزاں بیچیں۔ ایک شخص نے چھ مچھلیاں بڑی ایک روپیہ کی مول لیں۔ میرے نزدیک اس قیمت پر مفت تھیں۔

وہاں سے ایک پالکی کرایہ پر لے کر سیتا کنڈ کے جنگل میں گیا۔ شہر سے تین کوس پرے تھا۔ وہاں پہاڑ بسبب روئیدگی کے سبز ہو رہے تھے درخت میووں سے لدے ہوئے۔ آواز جانوروں کی موزوں۔ سبزہ اگا زمرد گوں ویسی زمین ارم تزئین ہندوستان میں کم نظر آئی۔ سبزی اور ہوائے سازگار اس کی دل کو بھائی اس دشت پر فضا میں تین چار تالاب برابر تھے۔ خوشگواری میں ایک دوسرے سے بہتر سرد پانی سبھوں کا۔ اتا بیچ والے کا نہایت گرم تھا۔ وہی سیتا کنڈ کہلاتا اگر کوئی اس میں ہاتھ ڈالتا۔ شدت گرمی سے آبلہ پڑ جاتا۔ میں یہ ماجرا دیکھ کر قدرت الٰہی پر غش کر گیا کہ سبھوں میں پانی سرد ہے۔ بیچ میں جلتا آگ سا۔ کئی ٹھلیاں[1] مول لے کر ٹھنڈا اور گرم ملایا۔ جب وہ حد اعتدال پر آیا۔ اسی

[1] چھوٹا گھڑا

سے نہایا۔ عجیب تاثیر اس کی تھی کہ کسالت اور ماندگی دور ہوئی بعد اس کے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا شیشہ عرق انگور کا جو ساتھ لے گیا تھا کھولا۔ ٹھنڈا پانی اس چشمہ شیریں کا ملا کر دوستوں کو یاد کر کے دو تین پیالے اس کے پیئے زندگی کے مزے اور لطف حاصل کئے۔ جب وہ چشمے خوشگوار اور کوہ وصحرائے سبزہ زار دیکھا بے اختیار دل میں آیا کہ ساری عمر یہاں بیٹھ کر یاد خداوند میں مصروف رہوں طریقہ اسلاف پر گلہ بکریوں اور گھوڑوں کا چراؤں مگر بن نہ پڑا۔ مشکل نظر آیا۔ بعد چار گھڑی کے وہاں سے پھر آیا۔ ناؤ پر سوار ہو کر راہی ہوا۔ عظیم آباد پہنچ کر دو دن سیر کرنے کو رہا۔ وہ شہر کنارے گنگا کے ہے۔ بہت آباد۔ مگر یہاں کی آب وہوا میں رطوبت ہے۔ اکثر لوگوں کو مرض پر صعوبت ہے۔ یعنی رہنے والے یہاں کے اکثر مرض فتق[1] یا فیل پائی[2] میں گرفتار ہیں۔ سبھوں کا رنگ زرد دبلے اور نزار ہیں۔ قریب اس کے دانا پور ہے۔ وہاں انگریزوں کا توپخانہ اور لشکر ہے۔ آب وہوا وہاں کی بہ نسبت عظیم آباد کے بہتر ہے۔ یہ سب سیر دیکھ کر بنارس میں آیا۔ یہاں آکر ایک چھکڑا کرایہ کا ٹھہرایا۔ اسباب اپنا ناؤ سے اتار کر اس پر لادا اور گھوڑا نجم کا مول لیا ہوا جو وقت جانے کلکتہ کے یہاں چھوڑ گیا تھا اس پر سوار ہو کر دار السلطنت لکھنؤ چلا۔

عمل انگریزی سے بخوبی نبھ آیا مگر شاہ اودھ کے عمل میں زمینداروں نے جا بجا کوس دو کوس کے بعد بابت کوڑیوں محصول کے سخت ستایا۔ ہر چند کہتا تھا میرے چھکڑے میں نہیں کوئی اسباب محصول کا پھر تم کس چیز کا محصول مانگتے ہو۔

[1] ایک مرض کا نام جس میں فوطے پھول جاتے ہیں

[2] ایک مرض کا نام جو عموماً مرطوب آب وہوا میں ہوتا ہے اور اس سے پاؤں سوج کر موٹے ہو جاتے ہیں۔

ناحق اور بے وجہ ستاتے ہو۔ اس کا جواب یہ دیتے۔ تم ہمارے گاؤں سے آ
نکلے ہو۔ اس کا محصول دو۔ جا بجا اس بات پر تکرار ہوئی۔ پر کسو نے میری بات نہ
سنی۔ آخر لاچار ہو کر ایک کتا ولایتی جو اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے گلے میں رسی
ڈال کر چھکڑہ سے باندھا۔ جہاں کوئی زمیندار رہگذری کی کوڑیاں مانگتا۔ میں
جواب میں کہتا۔ یہ کتا اور چھکڑہ ہے کپتان ڈاسن صاحب کا۔ سارا اسباب تم کو سونپتا
ہوں۔ میں کپتان صاحب پاس جاتا ہوں۔ تم اس کی حفاظت کرو۔ مبادا کچھ
کم ہو جواب وہی میں پھنسو۔ نام انگریز کا سنتے ہی سب خاموش ہو جاتے۔ نرمی
اور ملائمت سے پیش آتے۔ طرفہ تر یہ ماجرا ہے قابل استہزا ہے کہ جو لوگ ملازم
شاہ اودھ کی نگاہ بانی کے لئے مقرر ہیں۔ وہ بھی کوڑیاں تحصیلتے ہیں۔ آمادہ تر
محافظت راہ کی جیسی جیسی کچھ کرتے ہیں لوگ خوب جانتے ہیں۔ زمین اس نواح کی
قابل زراعت اور بہت بہتر ہے مگر بسبب ظلم عاملوں کے ہزاروں بیگھ خراب
افتادہ اور ابتر ہے بلکہ گاؤں کے گاؤں جا بجا جلے پڑے ہیں سوائے جانور وحش
درندہ کے کہیں آدمی نہیں نظر آتے ہیں۔ شاہ اودھ کی طرف سے جو چکلہ دار[1] آبادی
ملک اور تحصیل روپے کے لئے جاتا ہے۔ حاکم سابق سے زیادہ ظلم و بدعت کرتا ہے
اپنے منفعت کے خیال سے خوف خدا اور بادشاہ سے غافل ہوتا ہے رعیت
کو ظلم سے اجاڑ دیتا ہے۔ عاملوں کے یہ ہتھکنڈے ہیں کہ وقت تردد کے اسامی
اور زمینداروں کو دلاسے سے بلاتے ہیں۔ پٹہ قبولیت روپے بیگھہ کا لکھواتے
ہیں۔ جب غلہ تیار ہوا دو روپے بیگھہ مانگتے ہیں۔ اپنے قول و قرار سے بدل
جاتے ہیں۔ اس وجہ سے کسان بھاگتے ہیں۔ زمیندار عاملوں سے مقابلہ کرتے ہیں
اور بد قولی کے سبب سے ایک کوڑی نہیں دیتے ہیں۔ عامل فوج بادشاہی
بلوا کر گڈھی[2] قلعہ ان کا کھدواتے ہیں۔ گائے بیل اور غلہ ان کا بیچ کر دگنا تگنا دیہ

---

[1] جاگیردار۔ صوبہ دار۔ ناظم علاقہ [2] گڑھی۔ چھوٹا قلعہ

سمجھاتے ہیں۔ زمین یہاں کی قابل زراعت ہے پر افسوس کہ چکلہ داروں کی
بدعت ہے۔ شاہ اودھ بہ سبب کثرت مشاغل کے اس امر سے غفلت رکھتا ہے
ورنہ ان ظالموں بوم صفت کو اس ظلم ناحق سے متنبہ کرتا۔

بندہ یہ حالات دیکھتے قرب و جوار لکھنؤ کے پہنچا۔ ایک گاؤں میں آ کر ٹھہرا
شکار میں مشغول ہوا۔ ایک چڑیا کو چھرے سے مارا۔ پچاس آدمی جنگلی دوڑ پڑے
ڈھال تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے کہ تم نے ہمارے گاؤں کے جانور کو کیوں مارا
سبھوں نے آ کر مجھ کو گھیر لیا۔ میں مقابلہ کرنا ان سے مناسب نہ سمجھا۔ نرمی اور آشتی
سے پیش آیا۔ لیکن وہ لوگ بد ذاتی سے باز نہ آتے۔ آمادہ میرے قتل پر تھے۔ کوئی
کہتا اس کا سر کاٹ ڈالو۔ کسی کے خیال میں آتا نہیں۔ زندہ پکڑ لے چلو۔ جب میں
نے دیکھا کہ جان مفت جاتی ہے کوئی تدبیر نہیں بن پاتی ہے انگریزی بولی
میں گفتگو کی۔ انہوں نے انگریز سمجھ کر طرح دی اور اپنی راہ لی۔ اس دن اگر میں
اپنے تئیں انگریز نہ بناتا۔ بے شک و شبہ مارا جاتا۔ اسی طرح سینکڑوں آدمیوں کا
خون ہوتا ہے۔ کوئی کسی کا حال نہیں پوچھتا ہے۔ وہاں سے بچ کر خدا خدا
کر کے متصل لکھنؤ کے آیا۔ ایک چھٹی میں کپتان ممتاز خاں منگنس صاحب بہادر
کو لکھا کہ اگر آپ کی مرضی ہو میں حاضر ہوں۔ نہیں تو اور کسی طرف جاؤں کپتان صاحب
نے اس کے جواب میں چھٹی عنایت آمیز لکھ بھیجی کہ ضرور آؤ مجھ کو۔ تمہاری انتظاری
بندہ بموجب حکم کے ان کے مکان پر گیا فیضیاب ملازمت ہوا۔ انہوں نے نہایت
مہربانی فرمائی اور دعوت و مہمانی کی۔ ایک خیمہ کھڑا کروایا۔ اس میں فقیر کو اتروایا۔ بعد
چند روز میں نے قصد اور سمت کا کیا۔ انہوں نے باز رکھ کر فرمایا تم یہاں رہو اور رسم سابق
اپنے کے درستی کرو۔ بندہ چٹھیاں سفارش کی افسروں ولایت کی لکھی ہوئیں کرنیل لو
صاحب بڑے صاحب اور پاٹن صاحب چھوٹے صاحب کے نام پر لایا تھا۔ دونوں
صاحبوں کو لے جا کر دکھلائیں۔ انہوں نے کمال اخلاق اور عنایت سے پیش آ کر یہ باتیں

کہیں کہ ہم کو شاہ اودھ کی فوج میں سفارش کرنے کا اختیار نہیں۔ مہربانی زبانی ان کی سے شکر گزار ہوا۔ اگرچہ خوبی ایام سے کچھ بھی نہ اجر لئے کار ہوا میں نے یہ حال کپتان مینگنس صاحب سے کہہ کر رخصت ہونے کا قصد کیا۔ انہوں نے اپنے نزدیک کرایہ کا میرے رہنے کے لئے ٹھہرا دیا اور جدا ہونا میرا ہرگز گوارا نہ کیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد تدبیر کر کے سرکار شاہی میں عرضداشت کی، اور اسامی قدیمی بحال کردائی یعنے اپنے ہمراہی رسالہ سواروں اور توپخانہ کی صوبہ داری دی کھانے میں اپنے شریک رکھا چنانچہ آج تک وہی طور چلا جاتا ہے کہ بندہ ان ہی کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ کپتان صاحب نے جس قدر عنایت میرے حال پر فرمائی۔ زبان طاقت نہیں رکھتی ہے اس کی شکر گزاری کی جب تک جیوں گا ان کا احسان مند رہوں گا۔

ان دنوں ڈاکٹر کار بائن صاحب نے از راہ اشفاق چھٹی سفارش میری کی افسران فوج انگریزی کے نام پر میرے پاس لکھ بھیجی تھی کہ اگر تم کو منظور ہو ان کے پاس جاؤ۔ پلٹن انگریزی میں جو قندھار جاتی ہے تمہاری نوکری ضرور ہو جاوے گی۔ بندہ فقط پابندی مہربانیوں کپتان صاحب موصوف کے سے وہاں جانے سے باز رہا ورنہ بے شک وشبہ وہاں جاتا۔ اس شہر میں جتنے صاحب لوگ رہتے ہیں میرے اوپر کمال شفقت فرماتے ہیں چنانچہ جس دن بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب یعنی کالفیلڈ صاحب اور ولکی صاحب اس شہر میں آئے تھے۔ شاہزادہ ولی عہد صاحب عالم بہادر ثریا جاہ ان کے استقبال کو تھوڑی دور تک گئے تھے۔ بندہ بھی ہمرکاب بنظر انتساب تھا۔ ولکی صاحب نے راہ میں نظر عنایت سے میری طرف دیکھا۔ جب آکر اپنی کوٹھی میں داخل ہوئے اور کار و بار ضروری سے فراغت کر چکے میری یاد فرمائی اور بلا کر بہت سی مہربانی

کی۔ بعد اس کے بڑے صاحب سے میرا ذکر کیا۔ اپنے ساتھ لے جا کر مشرف ملازمت کروایا۔ بڑے صاحب نے بھی قدر دانی کی۔ بمقتضائے ریاست قرب لباط لوسی سے عزت دی۔ بندہ گاہ اب بھی ولکی صاحب اور کالفیلڈ کے پاس جاتا ہے۔ وہی عنایات سابقہ اپنے حال پر مزید دل پاتا ہے۔ جب سے کالفیلڈ صاحب اس ملک میں آئے، مزاج محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کا انتظام ملکی پر مصروف کر لائے ہیں۔ نصیر الدین حیدر جو سابق یہاں کے تخت نشین تھے روانہ خلد بریں ہو کر دریا پار کی کربلائے نو تعمیر میں مدفون ہوئے۔ میں ان کا نمک خوار خدمت گزار ہوں۔ نہایت ملول ہو کر ان کے مقبرے پر گیا۔ دیکھا کہ بجائے فرش حریر و ریشم کے فرش زمین خوابگاہ ہوا اور جسم نازک ان کا جو پھولوں کا بار بار جانتا۔ ہزاروں من اینٹ پتھر کے نیچے دبا کوئی رفیقوں اور جلسہ والوں سے پاس نہ رہا۔ دنیا عجب مقام ہے۔ کبھی اوج کمال پہ پہنچاتی ہے کبھی خاک میں ملاتی ہے۔ ایک دن وہ تھا کہ وہ حضرت خلد منزل تخت سلطنت ہندوستان پر جلوہ فرما تھے۔ نوکر اور خدمت گزار حسب مراتب اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر تسلیمات بجا لاتے۔ رنڈیاں ناچنے گانے والیاں الحان داؤدی اور حسن یوسفی سے دل تماشائیوں کا پھسلاتیں۔ جام طلائی و نقرئی میں شراب بھر بھر کر اہل محفل کو بطور دور پلاتیں۔ وہ خود بدولت کمال عیش و عشرت سے زرریزی میں مشغول ہوتے۔ فقرا اور مساکین کو دفعتاً تونگر کر دیتے۔ کوئی ہندوستانیوں سے باقی نہ رہا کہ ذلہ ربائے خوان انعام شاہ خلد آرامگاہ کا نہ ہوا کوئی اہل علم و کمال اس اقلیم میں نہ آیا کہ قدر دانی اس مغفور مبرور سے ترقی مدارج پر نہ پہنچا زندگی میں وہ حال تھا۔ آج یہ ماجرا نظر آیا کہ جنبش دست و پا کی طاقت نہیں رکھتے ہیں مثل خزانہ تہ خاک و خشت دبے ہیں۔ بندہ شاہ سلیمان جاہ کا مقبرہ اور حال بیکسی ان کی کا دیکھ کر سخت ملول ہوا اور دیر تک سرہانے قبر کے کھڑے ہو کر روتا رہا۔

حال وفات ان کے کا اس طرح سنا کہ نمک حراموں نے زہر پلا کر مارا۔ افسوس صد افسوس ان کم بختوں نے غضب کیا کہ ایسے بادشاہ فیاض کو یوں برباد کیا۔ بعد انتقال ان کے مرزا فریدون بخت عرف منا جان جو اپنے تئیں صلب شاہ خلد آرامگاہ سے جانتے تھے اور شاہ سلیمان جاہ حالت حیات اپنی میں نوشتہ مہری اپنا متضمن ابطال دعوئ فرزندی ان کے کا سرکار کمپنی میں بھجوا چکے تھے۔ بے اجازت بڑے صاحب کے آ کر تخت سلطنت پر بیٹھے اور اپنے طور پر مصروف نظم و نسق ہوئے۔ بڑے صاحب یعنی کرنیل لو صاحب نے کہا تم کو نہیں مناسب تخت پر بیٹھنا۔ اس لئے کہ تم بموجب نوشتہ شاہ مغفور کے ان کے نطفہ سے نہیں ثابت ہوتے ہو۔ پس ارادہ سلطنت کا کس دعوئ سے رکھتے ہو بہتر ہے کہ اس خیال سے باز آؤ خیریت سے اپنے گھر جاؤ نہیں تو بعد دو گھڑی کے گرفتار ہو گئے۔ نہایت ذلیل و خوار ہو گئے۔ مرزا فریدوں بخت نے کہنا بڑے صاحب کا نہ مانا۔ اور اپنے تئیں مستحق سلطنت جانا۔ لاچار بڑے صاحب نے اپنے ہمراہی پلٹنوں اور توپخانہ کو حکم دیا۔ یکایک گولی اور گولہ برسنے لگا۔ مصطفےٰ خان قندھاری رسالہ دار اسی جھگڑے میں مارے گئے اور بہت لوگ ناحق مفت کام آئے۔ تخت زرنگار اجلاس شہریار گولے توپ سے پرزے پرزے ہوا۔ فریدون بخت مع بادشاہ بیگم دادی اپنی کے گرفتار ہو کر آیا بعد اس کے لو صاحب نے بموجب حکم شہنشاہ انگلستان نصیر الدولہ بہادر کو تخت سلطنت پر بٹھلایا۔ تمام اختیارات امور سلطنت کا ان کو دیا۔ چنانچہ یہاں کے اب وہی فرمان روا ہیں۔ صاحب سکہ و لوا ہیں کسی نے سکہ[1] ان کا یوں کہا۔ بندہ نے یادداشت کے لئے اس رسالہ میں لکھا۔

---

[1] وہ مصرعہ یا مصرعے جس میں بادشاہ کا نام آتا تھا اور سکہ رائج الوقت پر کندہ کیا جاتا تھا۔

بجود و کرم سکہ زد در جہاں
محمد علی بادشاہ زماں

محمد علی شاہ نے ابتدائے جلوس اپنے سے روشن الدولہ نائب شاہ خلد منزل کو عہدۂ نیابت سے معزول کیا اور سبحان علی خاں کمبوہ مشیر اس کے کو بسبب مفسدی طینت اس کی کے مع اہل و عیال گنگا پار کر دیا۔ حکیم مہدی علی خان منتظم الدولہ بہادر کو فرخ آباد سے بلا کر بجائے روشن الدولہ کے عہدۂ وزارت پر سرفراز کیا۔ چند روز خان مسطور نے نہایت خوش سلیقگی سے کار وبار وزارت بنا ہا۔ پر افسوس اجل نے مہلت نہ دی۔ تھوڑے دنوں کے بعد قضا کی۔ بعد ان کے بھتیجے ان کے منور الدولہ بہادر نے خلعت نیابت سے سربلندی پائی۔ اپنے چچا کے طور پر انہوں نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ اگرچہ مقلد مجتہد کے مثل نہیں ہو سکتا ہے الا اثر اس کا کچھ آ جاتا ہے۔ اسی طرح ان دنوں منور الدولہ اگرچہ مستعد رہتے ہیں۔ پر جائے کار میں اپنے چچا کو نہیں پہنچتے ہیں عظیم اللہ خان جو قدیم سے رفیق شاہ حال تھے۔ ابتدائے تخت نشینی شاہ زمان سے مالامال اور نہال ہوئے۔ داروغگی دیوان خانہ سلطانی کی انہی کے نام ہے سوا اس کے اور کارخانہ جات کا انہی کے حوالے سر انجام ہے۔ بادشاہ کے مزاج میں نہایت دخل رکھتے ہیں۔ جلوت و خلوت میں باریاب ہوتے ہیں۔ جب سے محمد علی شاہ نے تخت سلطنت پر اجلاس فرمایا ہے رومی دروازے کے سامنے دولت خانہ میں ایک امام باڑہ قبر اپنی کا اور مسجد اور دروازہ جواب رومی دروازے کا اور دوکانیں اور بازار بطور امام باڑہ اور مکانات آصف الدولہ بہادر کے بنوایا ہے اور اب تک بنتا جاتا ہے۔ اگرچہ امام باڑہ آصف الدولہ کو نہیں پہنچتا ہے مگر تاہم قابل تماشا ہے اور بہت بلکہ اور سب عمارتوں اس شہر سے نفیس بنا ہے۔ عمارت عالیشان رکھتا ہے۔ آگے

اس مقام کا نام جمینا باغ تھا۔ اب بسبب بننے امام باڑہ کے خطاب اس کا حسین آباد
ہوا۔ بڑے صاحب کی کوٹھی مقام بیلی گارد اور دولت خانہ بادشاہی سے حسین آباد
تک سڑک وسیع بنی ہے ایسی ہموار اور درست ہوئی کہ اندھا بھی اس پر بے تکلف
دوڑتا چلا جائے۔ کہیں ٹھوکر نہ کھائے۔ دو طرفہ راہ میں دو دو تین تین گز کے فاصلہ
پر لکڑیاں گڑی ہیں۔ رات کو ان پر لالٹینیں روشن ہوتی ہیں اور راہوں کی درستی
کا بھی حکم ہوا ہے۔ جا بجا رستہ بنتا جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ سے شاہجہان تک پوری
سڑک بنتی آتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں لائق آمد و رفت بگھیوں کے ہو جاتی ہے۔
غرضیکہ مزاج بادشاہ کا ہر صورت سے رعایا پروری پر مصروف ہے اور عنان
عزیمت کی رفاہیت خلائق پر معطوف۔ گرفتاری رہزنوں اور قزاقوں اور کھود
ڈالنے گڑھی زمینداروں سرکشوں کے لئے تاکیداً کید حکم دیا ہے بموجب حکم محکم
قزاق ہر شہر سے پکڑے آتے ہیں اور قلع و قمع گڈھیوں کا ہوتا ہے۔ ان دنوں
بندہ بھی دو تین دفعہ ہمراہ کپتان منگنس صاحب اور راجہ درسن سنگھ غالب جنگ
کے زمینداروں اور رہزنوں کے پکڑنے کو گیا تھا۔ ایک دفعہ موضع سریاں میں گڑھی
کھودنے اور گرفتاری امام بخش زمیندار کے واسطے گیا۔ دیکھا کہ گڑھی بہت مضبوط
بنی۔ گرد اس کے چاروں طرف خندق گہری کھدی۔ ہر سمت اس کے جنگلا تھا دیکھنے
والے کا دم رکتا اس گڑھی میں آٹھ سو آدمی بندوقچی تھے۔ ملازم بادشاہی اس کی گرفتاری
کو تین ہزار آدمی مع دس ضرب توپوں کے گئے۔ بعضے عاقلوں اور بھائیوں اس کے
نے اس کو سمجھایا کہ تو لڑائی سے باز آ۔ مقابلہ فوج بادشاہ نہ کر سکے گا۔ اس کوتاہ اندیش
نے ہرگز نہ مانا۔ ہمراہی اس کے سب گڑھی سے نکل گئے۔ فقط سولہ آدمی امام بخش کے
ساتھ گڑھی میں رہ کر گولیاں مارتے۔ ادھر سے تین ہزار آدمی مستعد تھے۔ ان کے
سوا دس میں ضرب توپ کے گولے پڑتے۔ آخر وہ سولہ آدمی امام بخش سمیت مارے

گئے اور فوج بادشاہی سے دو آدمی کام آئے اور کتنے زخمی ہوئے حق یہ ہے کہ
گڑھی والوں نے بڑی جرأت کی۔ لیکن فوج بادشاہی کے سامنے ان کی کیا حقیقت
تھی۔ اگر چند روز حکم بادشاہ کا یوں ہی جاری رہے گا۔ رہزنوں اور ڈکیتوں کا
ممالک محروسہ بادشاہی میں نام و نشان باقی نہ رہے گا۔ ملک کا انتظام بخوبی ہوئے گا۔
روپیہ سرکاری بے کد و کاوش تحصیل ہوئے گا اس اطراف و جوار میں لکھنؤ بھی غنیمت
ہے کہ یہاں کچھ ایجاد و صنعت ہے۔ لیکن جو قدرت اختراعی اور صنعت و کاریگری
فقیر نے ملک انگلستان میں دیکھی یہاں عشر عشیر اس کی بھی نہ پائی۔ کرشمہ یہ کہ وہاں کلیں
آہنی توپ اور بندوق اور تلوار اور کاغذ اور کپڑے وغیرہ کی کھڑی کی ہیں کہ گھڑی
بھر میں اس سے ایک رقم کی ہزاروں چیزیں بنتی ہیں۔ یہاں کوئی اس کی خبر نہیں
رکھتا بلکہ نام و نشان بھی نہیں جانتا ہے۔ رئیس ہندوستان کے خواب خرگوش
میں پڑے رہتے ہیں۔ بٹیر یا مرغ یا کبوتر یا پتنگ بازی وغیرہ میں عمر برباد کرتے
ہیں کوئی تحصیل علم و ہنر کا شوق نہیں رکھتا ہے۔ امورات کار آمدنی اور فنون
سپاہ گری یا شکار شیر وغیرہ سے کاہلی کرتا ہے۔ صد آفریں امیران انگلستان
پر کہ ان میں سے کوئی تمام دن میں ایک گھڑی اپنی برباد نہیں کرتا ہے ہر کوئی اپنے
کام میں شام تک مصروف رہتا ہے۔ رات کو عیش و عشرت کرتے ہیں خیال سیر
ملکوں کا سر میں رکھتے ہیں۔ عورتیں ان کی بھی تضیع اوقات نہیں کرتی ہیں علم و ہنر
میں مشغول رہتی ہیں۔ برخلاف ہندوستان کے کہ مرد یہاں کے امور بے جا میں صرف
اوقات کرتے ہیں اور اپنی عورتوں کو ایک مکان میں قید کر کے دنیا و مافیہا سے
غافل کر دیتے ہیں سوائے دیوار خانہ یا چھت آسمان کے ان کو نظر نہیں آتا ہے ہر مرد
اس پردہ نشینی کو باعث عصمت بی بی سمجھتا ہے۔ درحقیقت ان کو سیکھنے علم و ہنر سے
باز رکھتا ہے۔ میرے نزدیک یہ خیال بے جا ہے کہ پردہ نشینی باعث عفت کا ہے۔

بلکہ جو عورت بالطبع عفیفہ اور صالحہ ہے اگر ہزار مردوں بد میں بیٹھے عصمت اس کی قائم ہے اور بد طینت عورت کو کوئی لاکھ پردے میں چھپائے وہ اپنی حرکات ناشائستہ سے باز نہ آئے۔ ولایت لندن میں ایک عورت حسینہ ناکتخدا غیر مردوں کے ساتھ ایک بگھی میں بیٹھ کر جس ملک میں چاہے، چلا جاوے، ہرگز اس سے کسی طرح کا فساد یا حرکت بد واقع نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ مرد نیک کار ہیں اور عورتیں حیادار۔ پس کیونکر امر نامناسب کا خیال آوے یہاں پردہ نشینی میں کیا کیا خرابیاں ہوتی ہیں انجام کار ذلت اور رسوائیاں ہوتی ہیں اگر یہاں کی عورتیں علم رکھتی ہوتیں اور بے پردہ باہر نکلتیں ہرگز ایسا فساد نہ ہوتا۔ بھلا اس پردہ نشینی میں کیا فائدہ نکلا حقیقت میں مرد نادانی کرتے ہیں کہ عورتوں اپنی کو ایک مکان تنگ پنجرے سے میں قید کر کے تماشائے عجائبات زمانہ سے باز رکھتے ہیں کیا اندھیر ہے کہ آپ سیر دیکھتے پھرتے ہیں۔ اور اپنے ہم جنسوں یعنی عورتوں کو اجازت نہیں دیتے ہیں۔ کافی ہے ان کو یہ پند

ہر چہ بر خود نہ پسندی بہ دیگراں مپسند

ہر چند حال بہت تھا۔ لاکن اس قدر لکھنا مناسب سمجھا۔ اس فقیر نے نہایت خون جگر کھایا۔ تب جا کر یہ رسالہ مختصر تیار ہوا۔ امید ہے کہ ارباب خرد اس کو پسند کریں۔ عیب گیری میں نہ مصروف ہوویں اب بھی یوسف حلیم کمل پوش سلیمانی مذہب ارادہ سیر ملک یورپ کا رکھتا ہے اور ایران و توران و استنبول اور روس و ماژندران وغیرہ کے جانے پر آمادہ ہے۔ بسبب لاچاری اور نہ بہم پہنچنے زادِ راہ کے یہاں پڑا ہے امیر اور رئیس ہندوستان کے ایسے خیال کب رکھتے ہیں کہ خرچ راہ کا اور ایک محرر کامل ہمراہ میرے کر کے رخصت کریں۔ بندہ ملکوں میں پھرے اور بے کم و کاست حال ہر جا کا اپنی آنکھ سے دیکھ کر بیان کرے اگر یاوری بخت سے

کوئی متکفل خواہش میری کا ہوا فبہا نہیں تو فقیر تھوڑے دنوں میں راہی ہوگا۔ خدا مسبب الاسباب ہے کوئی سبب کر دے گا یا جامۂ فقیری پہن کر سیر ملکوں کی کرے گا۔

ایک وہ دن تھے کہ میں انگلستان میں پریوں کے ساتھ چلتا پھرتا تھا۔ رات کو نفیس باجوں کی آواز سنتا تھا۔ ایک یہ وقت ہے کہ اس مکان ناہموار میں چڑیلوں کے پڑوس میں رہ کر صورت کو یہ ان کی دیکھتا ہوں اور رات کو ان کی آپس کی لڑائی کے شور و غل سے سونے نہیں پاتا ہوں۔ ولایت لندن میں پریوں کی سیر دیکھتا۔ دکانوں خوش قطع کے نظارے کرتا۔ بارش برف کا عجیب عالم تھا۔ نسیم خوشگوار بہاری سے دل شگفتہ ہوتا۔ سینکڑوں بگھیاں اور گھوڑے نفیس نظر آتے۔ راگ معشوقوں کے دل میں اثر کرتے۔ یہاں بجائے گھوڑوں کے گدھے اینٹوں کے لدے رات کو دوڑتے دکھائی دیتے ہیں اور بجائے پریوں کے چڑیلوں کے منہ نظر پڑتے ہیں۔ جس مکان میں رہتا ہوں قریب اس کے اجلاف[1] لوگ رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں رات کو شراب پی کر درجہ بدرجہ ہمسایوں کو گالیاں دیتی ہیں۔ اگر بالفرض تھک کر چپ رہتی ہیں۔ مرد ان کے بدمست ہو کر آلہا[2] گاتے ہیں۔ دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔

---

[1] نچلے طبقے کے لوگ۔ کمینے

[2] ایک بہادر راجہ کا نام ہے جس کا قصہ برسات کے موسم میں دیہاتوں میں گایا جاتا تھا (نور اللغات)

سپاس:

اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے دوران میں ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر حمید اللہ خان ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، پروفیسر جیلانی کامران ڈاکٹر سہیل احمد خاں، ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ پروفیسر صابر لودھی اور ڈاکٹر حسن اختر ملک نے وقتاً فوقتاً راہنمائی فرمائی اور مفید مشوروں سے نوازا، جس کے لئے مرتب ان تمام بزرگوں کے روبرو سراپا سپاس ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۸۱ء

(مرتب)

تعلیقات

سوانح

یوسف خاں کمّل پوش سیّاحِ جہاں

یوسف خاں نام، یوسف تخلص اور کمّل پوش لقب تھا۔ والد کا نام رحمت خاں غوری آبائی گاؤں حیدرآباد (دکن) تھا۔ جہاں سے ۱۸۲۸ء میں نقل مکانی کے بعد پھرتے پھراتے لکھنؤ پہنچا اور نواب نصیر الدین حیدر، بادشاہ اودھ کی فوج میں لبطور جمعدار ملازم ہو گیا۔ یہاں ترقی کرتے کرتے بالآخر ایک رسالے کا صوبیدار ہو گیا اور کم و بیش تیس سال تک توپ خانہ میں خدمات انجام دیتا رہا۔

یوسف خاں انتہائی ذہین، علوم و فنون کا رسیا اور سیاحت کا شوقین تھا۔ علوم متداولہ کے حصول کے بعد انگریزی جاننے کا سودا سمایا اور بڑی محنت کے ساتھ تھوڑے ہی عرصے میں اتنی انگریزی سیکھ لی کہ بولنے اور سمجھنے لگا۔ اس کا خاص میدان تاریخ کا مطالعہ تھا جس نے اسے دنیا کی سیاحت پر اکسایا۔ یوسف خاں شاعر بھی تھا۔ اگرچہ اس دور کے لکھنؤ شعراء میں اس کا کوئی خاص مقام نہیں ہے،

---

[۱] یوسف خاں کے سوانح کی ترتیب میں مندرجہ ذیل کتب کو ماخذ بنایا گیا ہے۔

۱۔ عجائبات فرنگ (یوسف خاں کمّل پوش) طبع دوم، نول کشور لکھنؤ۔

۲۔ خطبات گارساں دتاسی (مطبوعہ انجمن ترقی اردو دکن ۱۹۳۵ء)

۳۔ تذکرہ سراپا سخن (طبع سوم) نول کشور لکھنؤ۔

۴۔ سخنِ شعراء (طبع ۱۸۷۵ء) نول کشور لکھنؤ۔

تاہم متوسط درجے کا شاعر تھا اور خواجہ حیدر علی آتش جیسے باکمال استاد سے شرف تلمذ رکھتا تھا۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں عبور رکھتا تھا لیکن نثر اس کا خاص میدان ہے اور اس کے سفرنامے کے اسلوب کو دیکھ کر اسے ایک اچھا نثر نگار ماننا ہی پڑتا ہے اس کی نثر اس دور کے مطابق سادہ اور عام فہم ہے کہیں کہیں قافیہ پیمائی اور سجع بندی بھی ملتی ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ اپنے دور کا قابل ذکر شاعر و ادیب تھا۔

یوسف خاں کمّل پوش کے مذہب کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ان غلط فہمیوں کے پیدا کرنے میں کچھ اس کے اپنے بیانات اور زیادہ تر فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کا ہاتھ ہے کہ جس نے اپنے ۲، دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطبے میں کمل پوش کے بارے میں یہ عجیب و غریب معلومات فراہم کی ہیں۔

"سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ یوسف خاں بہادر ہندوستانی نہیں تھے بلکہ اطالوی تھے۔ یہ مسلمان بھی نہیں تھے بلکہ کیتھولک مسیحی تھے اور مرتے دم تک کیتھولک عقائد پر قائم رہے۔ اصل میں ان کا نام DELMERICH تھا اور کہا جاتا ہے کہ ان کا فلورنس کے مشہور MEDICIS خاندان سے تعلق تھا۔"[۱]

حالانکہ اپنے ۴، دسمبر ۱۸۵۴ء کے خطبے میں کمل پوش کے سفرنامے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے خود یہ کہا تھا۔

"نسلاً پٹھان ہیں، درویش یا صوفی ہیں اور کمّل پوش کے نام سے مشہور ہیں۔"[۲]

گارساں دتاسی نے ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہہ دی ہیں۔ لیکن ان کی

---

[۱] خطبات گارساں دتاسی (گیارھواں خطبہ) ص۔ ۳۱۹-۳۱۸

[۲] خطبات گارساں تاسی (پانچواں خطبہ) ص ۱۶۸

کبھی ہوتی پہلی بات درست ہے یوسف خاں نسلاً پٹھان تھا اور مسلمان تھا۔ اگرچہ خود وہ اپنے آپ کو "سلیمانی" مذہب کا قائل کہتا ہے اور آزاد خیال ظاہر کرتا ہے۔ بے راہ رو بھی ہے جس کا ثبوت بکر شراب نوشی کرتا ہے لیکن دوسری طرف جابجا خدا اور اس کے برگزیدہ پیغمبرؐ کا ذکر انتہائی احترام و عقیدت کے ساتھ کرتا ہے اور حقوق العباد پر بہت زور دیتا ہے اس کے سفرنامے میں اس کے بیانات کے پیش نظر اسے زیادہ سے زیادہ "بے عمل گنہگار مسلمان" کہا جا سکتا ہے۔ عیسائی ہرگز نہیں اس کے سفرنامے کا آغاز ہی حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ جو اس کے عقائد کی تشریح کے لئے کافی ہے۔

"ستائش بے نہایت اس خدا کو لائق ہے کہ یوسف کنعانی کو حاکم مصر کا بنایا
اور یوسف سلیمانی کو نبیح ملک انگلستان کے پہنچایا۔ انسان ضعیف البنیان
کو مرتبہ اشرافت عطا فرمایا اور ساتھ عنایت کرنے گویائی زبان کے سب
حیوانوں پر ممتاز کیا اگر ہر سر مو بدن کا زبان ہو دے بیان حمد اس کی کا
ہرگز نہ امکان ہوے

وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے
قلم جو لکھے اس سے افزود ہے

بہر حال یہی بہتر ہے کہ گلستان سخن کو پھولوں نعت سے زیب و زینت دوں۔ گوناگوں توصیف اس رسولؐ کو زیبا ہے کہ گمراہوں کو کوچہ ضلالت کے تئیں شاہراہ ہدایت پر لایا اور نور رہنمائی اپنے سے جمالِ شاہد مقصود عرفان و وحدانیت کا دکھلایا۔

نبی کون یعنی رسول کریمؐ
نبوت کے دریا کا دُرِّ یتیمؐ[1]

---

[1] عجائبات فرنگ (طبع دوم لکھنؤ) ص : ۲

اس کے علاوہ کمل پوش کے یہ دو اشعار بھی اس کے مذہبی عقائد کی کسی حد تک وضاحت کر دیتے ہیں۔

خدا کے فضل سے وہ دن نصیب ہو یوسف
رواں ہوں سوئے نجف عشقِ بوتراب میں پاؤں

حسد و بغض سے یہ دیکھتا ہے یوسف کو
کور ہوں غیر کی، یا حیدر کرارؑ آنکھیں

وہ پابند شرع مسلمان ہرگز نہیں ہے بے راہ روی میں بہت آگے ہے۔ لیکن حقوق العباد کا بہت خیال رکھتا ہے اور اپنے تئیں اسی کو مذہب سمجھتا ہے کہ۔

حق تعالیٰ کو وحدہ لاشریک جانے جو کچھ معاش محنت مشقت سے پیدا کرے کچھ اپنے خرچ میں لاوئے باقی خدا کی راہ میں بانٹ دے، خدا نے جہاں میں پیدا کیں اقسام کی نعمتیں بندوں کے لئے ہیں تا کہ کھاویں اور بانٹیں۔"[1]

کمل پوش درویش مسلک کا انسان ہے، وہ حسن پرست اور عاشق مزاج بھی ہے۔ جا و بے جا اپنی عاشقی و حسن پرستی کے تذکرے بھی کرتا ہے لیکن اس سب کے باوجود سادہ اور نیک طینت اور بے ریا انسان ہے اس نے ہنگامہ خیز اور بھرپور زندگی بسر کی اور زندگی کی تمام رنگینیوں سے لطف اندوز ہوا اس کا سن ولادت تو گوشۂ گمنامی میں ہے تاہم وفات کی تاریخ ملتی ہے جو ۱۰ اگست ۱۸۶۱ء ہے کہ اسی تاریخ کو اس کا لکھنؤ میں انتقال ہوا۔[2]

---

[1] عجائباتِ فرنگ (طبع دوم لکھنؤ) ص : ۶۹

غزلیات

یوسف خاں کمل پوش شاعر بھی تھا اور یوسف تخلص کرتا تھا۔ خواجہ حیدر علی آتش کا شاگرد تھا۔ تذکرہ سراپا سخن میں "پاؤں" اور "آنکھ" کی ذیل میں اس کی دو غزلیں محفوظ ہیں، جو اس تذکرے سے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

(۱)

رکھتی ہیں مدِّ نظر گیسوئے خمدار آنکھیں
دام میں تیرے پھنساتی ہیں مجھے یار آنکھیں

اک قیامت ہے ترا تیرِ نظر او ظالم
مارا بے موت اسے جس سے ہوئیں چار آنکھیں

فرقتِ یار میں ہرگز نہیں نیند آتی ہے
چشمِ انجم کی طرح رہتی ہیں بیدار آنکھیں

حسد و بغض سے یہ دیکھتا ہے یوسف کو
کور ہوں غیر کی یا حیدرِ کرار آنکھیں[1]

(۲)

رخِ قمر سے زیادہ ہیں آب و تاب میں پاؤں
نہ دیکھے چشمِ فلک نے بھی ایسے خواب میں پاؤں

[1] سراپا سخن (طبع سوم لکھنؤ) ص: ۸۲

سوالِ بوسۂ عارض پہ ناز کہتا ہے
عوض انگوٹھے کے اس کو دکھا جواب میں پاؤں

بغل میں دخترِ رز کو لئے زمیں پہ گرا
یہ لڑکھڑائے مرے نشۂ شراب میں پاؤں

خطا ہوئی جو کفِ پا کو روئے حور کہا
چھپائیے نہ برائے خدا حجاب میں پاؤں

طوافِ کعبۂ کوئے صنم میں ہیں مصروف
نہ ایک گام چلیں گے رہِ صواب میں پاؤں

ہمیشہ شرم ہے اعلیٰ کو اسفلوں سے زیاد
چھپیں نہ منہ کی طرح پردۂ نقاب میں پاؤں

جنوں میں لاکھ پھرا شکلِ مرغِ قبلہ نما
کبھی نہ گھر سے ہوئے باہر اضطراب میں پاؤں

خدا کے فضل سے وہ دن نصیب ہو یوسف
رواں ہوں سوئے نجف عشقِ بوتراب میں پاؤں[1]

[1] سراپا سخن (طبع سوم لکھنؤ) ص ۳۶۵

فردیات

(۱)

کاٹا پہاڑ دل میں نہ شیریں کے گھر کیا
پتھر پڑے نصیب پہ اے کوہکن ترے[1]

[1] ناسخ کے "سخن شعراء" میں کمل پوش کے دو شعر شامل ہیں، ایک محسن کی "سراپا سخن" میں "پاؤں" کے تحت شامل غزل کا مطلع ہے جو گذشتہ صفحات میں نقل کی جا چکی ہے۔ دوسرا شعر مندرجہ بالا ہے

(سخن شعراء - طبع نول کشور ۱۸۷۴ء ص ۵۰۱)

عجائبات فرنگ

یعنی کیفیت سفر یوسف خان کمل پوش

ملک انگلستان میں

یہ کتاب ۱۸۴۷ء میں بمقام دہلی طبع ہوئی تھی اور چونکہ مصنف اوسکا باشندہ لکھنؤ کا تھا اور مالک مطبع سے بہی اوسکی ملاقات تھی تو یہ تحفہ یادگار باشندہ اس صوبہ کا سمجھکر حسب تحریک مسٹر جوزف جونس صاحب جو اخلاق و مروت میں بے عدیل اور فن فوٹوگرافک وغیرہ صناعات میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں ❊

ماہ ستمبر ۱۸۷۳ء

مطبع منشی نولکشور میں بطبع زیور مطبوع ہوئی

"عجائبات فرنگ" کے دوسرے ایڈیشن کے صفحۂ اول کا عکس

(۲)

پریشاں کر دیا ہر ایک کا دل
بلا ناگن بھی اس کی زلف کالی

ؔ یہ ایک شعر تذکرہ "عمدہ منتخبہ" (از میر محمد خاں بہادر سرور) میں اس تعارف کے ساتھ درج ہے۔

"یوسف تخلص، شاہ یوسف درویشے بود آزادہ وضع۔ گاہے شعر ریختہ می گوید"
عمدہ منتخبہ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی طبع اوّل دلی ص ۸۲۸)

یہاں یوسف کے ساتھ لفظ "شاہ" محل نظر ہے تاہم "درویشے" اور "آزاد طبع" کے الفاظ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ یہ کمل پوش ہی ہو سکتا ہے۔ پھر شعر کا انداز بھی کمل پوش ہی کے خصوصیات کلام سے ہم آہنگ ہے، ایک اور دلیل اس شعر کو کمل پوش کا ماننے کے حق میں یہ بھی جاتی ہے کہ تاریخ میں یوسف تخلص کے جتنے اشخاص کا ذکر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی درویش اور آزادہ وضع مشہور نہیں ہے مثلاً یہ نام مشہور ہیں ــ

۱۔ میر یوسف علی یوسف

۲۔ بنّے صاحب یوسف رام پوری

۳۔ نواب میر یوسف علی خاں فرخ آبادی

اور ان میں سے کوئی بھی درویش لقب یا آزاد وضع نہیں۔

تاریخ یوسفی

اور بجای پریون کی چڑیلون کی صورتیں نظر پڑتے ہین ٭ جس مکانین بستا ہون
قریب اوسکی اجلاف لوگ رہتے ہین ٭ اونکی عورتین رات کو شراب پی پی کر
درجہ بدرجہ ہمسایونکو گالیان دیتی ہین ٭ اگر بالفرض تھک کر چپ رہتی ہین مرد
اونکی بدمست ہوکر الھاگاتے ہین ٭ دماغ کو پریشان کرتے ہین

خاتمۃ الطبع

الحمد للہ والمنۃ کہ سفرنامہ یوسف خان کمل پوش
سیاح جہان ماہ ستمبر سنہ ۱۸۷۳ عیسوی
مطابق ماہ رجب سنہ ۱۲۹۰ ہجری مطبع نامی
منشی نولکشور صاحب مین
طبع ہوا

عجائبات فرنگ کے اصل نسخہ کے آخری صفحہ کا عکس جس میں مندرج ہجری اور عیسوی سنین اس کی قدامت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

کتابیات

کتابیات

کتب

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلام مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

۲۔ اردو انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ فیروز سنز لاہور (طبع اوّل)

۳۔ اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (از ڈاکٹر فرمان فتح پوری) طبع اول مجلس ترقی ادب لاہور

۴۔ تاریخ نثر اردو (از احسن مارہروی) طبع اوّل علی گڑھ۔

۵۔ تذکرۂ انگلستان (بریگیڈیر گلزار احمد) مکتبہ خیابان ادب راولپنڈی (۱۹۵۴)

۶۔ خطبات گارساں دتاسی مترجم (شائع شدہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن) ۹۳۵

۷۔ داستان تاریخ اردو (حامد حسن قادری) لکشمی نرائن اگروال تاجر کتب آگرہ (۱۹۵۷ء)

۸۔ سراپا سخن (سید محسن علی) مطبع نول کشور لکھنؤ (طبع سوم)

۹۔ سخن شعراء مولوی عبد الغفور نساخ مطبع نول کشور لکھنؤ (۱۸۷۴)

۱۰۔ سیاحت فتح خانی (سفرنامہ لندن و پیرس) نواب فتح علی خان قزلباش (منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور (۱۹۰۴ء)

۱۱۔ عمدۂ منتخبہ (از میر محمد خان بہادر سرور) مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی دلی (سنہ ۱۹۶۱ء)

۱۲۔ گزشتہ لکھنؤ (مولانا عبد الحلیم شرر) نسیم بکڈپو لکھنؤ (س۔ن)

لغات

۱۔ جامع اللغات مؤلفہ خواجہ عبد المجید جامع اللغات کمپنی لاہور (س۔ن)

۲۔ فرہنگ آصفیہ مؤلفہ مولوی سید احمد دہلوی مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ لاہور (طبع سوم)

۳۔ فرہنگ اثر مؤلفہ نواب جعفر علی خاں اثر سرفراز قومی پریس لکھنؤ (۱۹۶۱ء)

۴۔ نور اللغات مؤلفہ مولوی نور الحسن نیر نیر پریس پامانالہ لکھنؤ (۱۹۲۴ء)

رسائل

۱۔ افکار کراچی (برطانیہ میں اردو ایڈیشن) اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

۲۔ قومی زبان کراچی ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء مضمون۔ اردو کا پہلا سفرنامہ۔ "عجائبات فرنگ" از مظفر عباس۔

انگریزی کتب

1. A Dictonar of India History (by S. Bhatacharyer) — George Brazillar, New York (1967)
2. Bibliographical Dictonary of South Aisa (by S. Razi Wasti) — Publishers United, Lahore (1980)
3. Dictionary of National Biography – (Edit. by Sidney Lee) — Oxford University Press London (1920)
4. Dictionary of National Biography – (Corrections and Additions) — G. K Hall & Co. Boston (1966)
5. Dictonary of European History (Complied by William 5- Roeder) — Philosophical Library, New York (1954)

6. Encyclopeadia Britinnica (15th Edition)

7. World Scope Encyclopaedia — W. S. Publishers, New York (1963).

8. Living with Books (by Helen E. Haines) — Columbia University Press – (1950)

محقق و نقاد ڈاکٹر مظفر عباس

کے چند **قلمی نقوش**

- **اُردو میں قومی شاعری**

داؤد انعام یافتہ تحقیقی کتاب ۱۹۷۸ء۔ اپنے موضوع پر اُردو میں پہلی باقاعدہ کتاب

- **آخری یادگار مشاعرہ**

مرزا فرحت اللہ بیگ کی شہرۂ آفاق تصنیف۔ مبسوط مقدمہ، حواشی اور تعلیقات

- **جدید اُردو شاعری (تاریخ و تنقید)**

اقبال کے دور سے زمانۂ حال تک کی اُردو شاعری کا تجزیاتی مطالعہ۔

- **جدید اُردو نثر (تاریخ و تنقید)**

بیسویں صدی کی نثری کاوشوں اور تمام نثری اصناف کا تجزیہ۔

- **THE MUSLIM COMMUNITY – A SOCIOLOGICAL STUDY**

علامہ اقبال کا معرکۃ الآرا خطبہ؛ متن، تحقیق، حواشی اور اُردو ترجمہ کے ساتھ۔

مکتبۂ عالیہ ○ لاہور